اُردو طنز و مزاح پر مبنی دوماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

جنوری ۲۰۱۸ء تا فروری ۲۰۱۸ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

اُردو طنز و مزاح پر مبنی دو ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

جنوری ۲۰۱۸ء تا فروری ۲۰۱۸ء

شمارہ نمبر ۱۴

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

مشاورت:

کے ایم خالد

خادم حسین مجاہد

روبینہ شاہین

محمد امین

ارمغانِ ابتسام

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط و کتابت

mudeer.ai.new@gmail.com

حلقہ ارباب مزاح

مزاح نگار ڈائریکٹری

مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہے حلقہ ارباب مزاح کی خواہش ہے پوری دنیا میں بسنے والے ہر اس مزاح نگار کا تعارف اس میں شامل ہو جس کے قلم نے کسی بھی ذی روح کے ہونٹوں پر مسکان دی ہو

زیادہ سے زیادہ آٹھ سو الفاظ پر مشتمل اپنا تفصیلی تعارف ان پیج فارمیٹ میں اپنی خوبصورت ترین تصویر (شادی والے دن کے علاوہ) حلقہ ارباب مزاح کو ای میل ایڈریس halqa.mezah@gmail.com پر ای میل کر دیں۔ آپ کا تعارف درج ذیل نکات کا احاطہ کرتا ہو۔

☆ پیدائش کا علاقہ (شہر اور ملک)، گردش دوراں نے کون کون سے علاقے دکھائے اور موجودہ سکونت کس شہر (ملک) میں ہے۔
☆ اسکول، کالج یونیورسٹی کے نام اور تعلیمی دور کا کوئی یادگار واقعہ
☆ لکھنے کا آغاز کتنی عمر اور کہاں اور کس ادیب سے متاثر ہو کر کیا، پہلی تحریر کہاں چھپی۔
☆ جرائد، اخبارات اور ویب سائٹس کے نام۔
☆ کسی ادبی شخصیت سے دوستی یا ملاقات کا کوئی واقعہ
☆ شائع شدہ کتابوں کے نام پبلشرز کی تفصیل کے ساتھ (اگر شائع ہوئی ہوں)۔
☆ مستقبل میں آنے والی کتابوں کے نام۔
☆ کسی ریڈیو یا ٹی وی کے پروگرام میں شرکت کی ہو تو چینل اور پروگرام کا نام۔
☆ حکومت یا کسی ادارے سے کوئی ایوارڈ حاصل کیا ہو تو اس کی تفصیل۔
☆ رہائش کا پتہ (آپشنل) ای میل ایڈریس (ضروری)، موبائل فون (آپشنل)
☆ فیس بک آئی ڈی (ضروری)، ٹویٹر آئی ڈی (اگر ہے تو)، سکائپ (اگر ہے تو)
☆ چند تحریروں کے ویب سائٹ لنک یا اپنی تحریر کے چند سکین نمونے ضرور ای میل کریں۔

اگر فیس بک کے دوست اپنے قرب و جوار میں رہنے والے کسی مزاح گو شاعر، مزاح نگار یا کارٹونسٹ سے واقف ہوں تو ان کا تعارف حلقہ ارباب مزاح تک پہنچائیں تاکہ ان کا تعارف "مزاح نگار ڈائریکٹری" کی زینت بن سکے۔

مزاح نگاروں کا ایک با اعتماد، نمائندہ حلقہ

کیا کیا کہاں

سفر وسیلۂ ظفر

مزاحیے

ھنسبیتالیات

ھزلیات / غزلیات

مشتری ہوشیار باش

ارمغانِ ابتسام کے گزشتہ شمارے archive.org کے ذیل کے ربط پر دستیاب ہیں:

https://archive.org/details/@nzkiani

اداریہ

کیا عجیب وقت آگیا ہے کہ دنیا بھر کی ہر قسم کی اچھی بری، مفید، مضر، ضروری اور غیر ضروری معلومات ایک کلک کے فاصلے پر ہیں اور آپ چاہ کر بھی اِن پر کوئی روک نہیں لگا سکتے، ہاں حکومتی سطح پر کسی حد تک ممکن، مگر حکومتوں کو اپنی کرسی بچانے سے فرصت نہیں، اس سے ہماری زندگیوں میں جو انقلاب آیا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ آج ایک فرد پوری دنیا کے ہر معاملے سے باخبر ہے دنیا بھر میں اس کے رابطے میں بے شمار لوگ ہیں لیکن اس کے ساتھ رہنے والے اس کے رابطے میں نہیں۔ اِکٹھے بیٹھے لوگ بھی ایک دوسرے سے بے خبر اپنے اپنے سیل فون پر مصروف ہیں۔ اگر کسی دوست کو چھینک بھی آتی ہے تو اس کے لئے فکر مند ہو کر کمنٹس کئے جاتے ہیں لیکن دوسرے کمرے میں بیمار والدین کی خبر تک نہیں لی جاتی۔ اکثر اوقات اس کا گھر والوں سے بھی اس کا رابطہ واٹس ایپ پر ہوتا ہے تو ایک دوسرے کے موجود ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ موجودہ دور میں تو یہی سمجھیں کہ بندہ آن لائن ہے تو خیریت سے ہے کیونکہ بیمار ہوتا یا مر کھپ گیا ہوتا تو آن لائن کیسے ہوتا۔ پہلے بچوں کو کوئی بات پوچھنی ہوتی تو بزرگوں سے پوچھتے جو اپنے تجربے کے مطابق مفید باتیں بتاتے اور ایسی باتیں گول کر جاتے جن سے کچے ذہنوں پر غلط اثرات پڑنے کا خطرہ ہوتا اب تو سب کا ایک ہی بزرگ ہے، گوگل بابا، جو بغیر کسی پردے کے، ہر قسم کی معلومات دے دیتا ہے جو کہ ضروری نہیں درست ہوں، غلط بھی ہو سکتی ہیں کیونکہ ان کو اپ لوڈ کرنے والے بھی انسان ہیں جن کے اپنے مقاصد اور نظریات ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں بچے وقت سے پہلے بالغ اور باخبر ہو رہے ہیں جس سے بے راہ روی میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن ظاہر ہے گوگل جتنا بھی باخبر ہو وہ اپنے اندر وہ احساس اور شفقت نہیں رکھتا جو صرف بڑے بزرگوں سے مل سکتی ہے۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے بے پناہ فوائد سے انکار نہیں، آج ہمیں نیٹ پر وہ کتابیں اور مواد بھی تقریباً مفت دستیاب ہے جو بڑے بڑے محققین اور مولفین کو کسی قیمت پر دستیاب نہ ہو سکا۔ ہاں ان کے پاس شاید اس سے فائدہ اٹھانے کا وقت تھا جو ہمارے پاس نہیں۔ اس انقلاب نے اخلاقی معیار ہی بدل دیئے ہیں۔ پہلے کوئی حادثہ ہوتا تھا تو لوگ ان کی مدد کرتے تھے، اب ویڈیو بنا کر اپ لوڈ کر دیتے ہیں اور ساتھ لکھ دیتے ہیں کہ ان کے لئے دعائیں کریں۔ اگر تحریکِ آزادی کے وقت میڈیا ہوتا تو شاید ہم گھر بیٹھے لائک اور کمنٹس کے ذریعے جنگِ آزادی لڑ رہے ہوتے، جیسے ہم آج کشمیر، میانمار، فلسطین، شام، اور عافیہ وغیرہ کے لئے لڑ رہے ہیں۔

فیس بک کی دنیا عجیب دنیا ہے جہاں ہر لڑکی پرنسس اور لڑکا پرنس ہے۔ نوے فیصد لڑکیاں لڑکے ہیں اور دس فیصد لڑکے بھی دراصل لڑکیاں ہیں۔ فیس بک پر جہاں پرانے بچھڑتے ہیں وہیں دھوکہ، بلیک میلنگ، اور برین واشنگ بھی ہوتی ہے۔ دور دیسوں کے باسیوں سے شادی بھی ہو جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے طلاقیں بھی ہو جاتی ہیں۔ فیس بک اپنے نظریات اور شخصیت کے اظہار کا ذریعہ بھی ہے اور منفی پراپگنڈے کا بھی، اس سے مذہب کی خدمت بھی ہوتی ہے اور فرقہ واریت کی تبلیغ بھی۔ یہ دُرست ہے کہ چیز کوئی بھی خود بری نہیں ہوتی اس کا استعمال اسے اچھا یا برا بناتا ہے لیکن اس میں منفی استعمال کے امکانات زیادہ ہیں اور یہ خود نمائی، خود ستائی اور تشہیر کا سستا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ فیس بک پر ہم ایک دوسرے کے لئے دور کے ڈھول ہیں جو سہانے ہوتے ہیں اور اگر فیس بک پر ہماری ملاقات نہ ہوتی تو شاید میدان حشر میں ہی ہوتی۔ واقعی قریب آنے پر ہی حقیقت کا پتہ چلتا ہے کیونکہ فیس بک پر تو ہر کسی نے خود پر مصنوعی خول چڑھا رکھا ہوتا ہے، پھر یوٹیوب ایک طلسم ہوشربا ہے جس پر کروڑوں ویڈیوز موجود ہیں۔ آپ کی دلچسپی کی بھی موضوع سے ہو لکھیں یا بولیں اور متعلقہ مواد حاضر۔ لیکن اس کے پیچھے جو شیطانی دماغ کام کر رہے ہیں وہ اسلام کے متعلق متنازعہ مواد پیش کرنے کے ساتھ ساتھ آپ نہ بھی چاہیں تو فحش مواد کے لنک وقفے وقفے سے بھیجتے رہتے ہیں اور آپ چاہے کوئی مفید معلومات حاصل کرنے بیٹھے ہوں اگر اس لنک کو اوپن کر لیں تو آپ مقصد کو بھول کر کہیں اور الجھ جائیں گے۔ اللہ ہمیں دورِ جدید کے فتنوں سے محفوظ رکھے۔ آمین، لیکن ظاہر ہے کہ جب تک ہم خود نہ چاہیں محفوظ نہیں رہ سکتے۔

خادم حسین مجاہد

پرانے چاول

کرنل ڈاکٹر شفیق الرحمٰن

ساڑھے چھ

ٹن سے گھنٹی بجی اور میں تھک کر اپنے کارنر میں سٹول پر آن گرا۔ یار لوگوں نے مالش شروع کی، بولے ''گھبرانے کی بات نہیں، ابھی دو راؤنڈ اور ہیں، ہمت سے کام لو، ایک آدھ ہک جما دینا اور جیت یقینی ہے، پہلے راؤنڈ میں یہی ہوا کرتا ہے۔''

اور میں دل ہی دل میں اُس گھڑی کو کوس رہا تھا، جب میں نے چچا جان کے سامنے خواہ مخواہ ٹورنامنٹ کا ذکر کر دیا۔ اگر وہ یہاں نہ ہوتے تب کسی چیز کی پرواہ نہ ہوتی لیکن اب تو وہ بغور ملاحظہ فرما رہے ہوں گے اور شائد تبصرہ بھی کر رہے ہوں۔ اِدھر وہ پرنسپل صاحب نہ جانے کہاں سے آ ٹپکے، اگر ان سے واقفیت ہوتی تھی تو ضرور اِسی طرح ہوتی تھی کیا؟ ہم بھی قسمت کے دھنی ہیں، اب وہ دونوں ہنس رہے ہوں گے۔

کل یونہی منہ سے نکل گیا۔ وہ پوچھنے لگے کہ کہاں ملو گے؟ میں نے کہہ دیا ''جناب، کل تو باکسنگ کا میچ ہے'، بولے ''اچھا ہم میچ دیکھنے آئیں گے، تم نے ایک عرصے سے تنگ کر رکھا ہے۔ اس مرتبہ ضرور تمھیں لڑتے دیکھیں گے۔''

میرا ماتھا ٹھنکا، بہتیری منتیں کیں ''آپ وہاں تشریف نہ لائیں، شور مچتا ہے، فضول سا ٹورنامنٹ ہے، آپ کو ہرگز پسند نہ آئے گا، وقت ضائع ہو گا آپ کا، میں خود حاضر ہو جاؤں گا'' لیکن کیا مجال کہ وہ مانے ہوں۔ اِدھر یہ پرنسپل صاحب بھی شامتِ عمال سے تشریف فرما تھے، کہنے لگے کہ ہم بھی ضرور دیکھیں گے۔

کوئی مقابلہ ہوتا تو بات بھی تھی۔ میرا مدِ مقابل ایک بھاری بھرکم سیاہ فام گینڈا تھا جس کے سامنے مجھے کم از کم زرّہ بکتر پہن کر آنا چاہئے تھا۔ سوچ رہا تھا کہ یہ وزن میں کم از کم ایک دو من ضرور ہو گا۔ آخر کس طرح مجھ سے اِسے لڑوا رہے ہیں؟ آتے ہی اُس نے وہ اُلٹے سیدھے ہاتھ دئے کہ چودہ طبق روشن ہو گئے۔ عرشِ بریں تک کے تمام چھوٹے بڑے تارے آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے اور اس کے بعد تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ منہ بنا کر، دانت بھینچ کر جو چھلانگ مارتا تو دھا دھم پندرہ بیس مکّے یکمشت ہی لگا جاتا اور میں سوچتا رہ جاتا کہ کیا کروں؟ اچھے پھنسے! اب تو نجات مشکل ہے، کہیں ناک آؤٹ نہ ہو جاؤں اور ساری شیخی دھری کی دھری رہ جائے۔

خیر دوسرا راؤنڈ شروع ہوا اور میں نے مدافعت شروع کر دی۔ بازو موڑ کر چہرے کے دونوں طرف آڑ بنالی۔ اب وہ ہے کہ مکّے لگا رہا ہے اور میں روک رہا ہوں۔ اس طرح بھی کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ پھر خیال آیا کہ میں اس سے کہیں ہلکا ہوں، ذرا سی

ہمت کروں تو اسے تھکا لوں گا۔ اب میں نے قلانچیں بھرنی شروع کر دیں۔ ایک مُکا دیا اور تڑپ کر برابر سے نکل گیا۔ جتنے میں وہ مُڑا، اِتنے میں ایک اور جڑ دیا اور پھر پھرتی سے دوسری طرف دوڑ گیا۔ یہ نسخہ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ اُس پر تھکاوٹ کے آثار نمودار ہوانے لگے۔ سینہ تھا کہ دھونکنی بنا ہوا ہے، بازو لٹک رہے ہیں، ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس راؤنڈ میں میں نے اُسے بالکل تھکا مارا۔ ریفری نے مجھے ٹوکا بھی کہ یہ کیا کبڈی سی کھیل رہے ہو؟ تیسرے راؤنڈ میں اسے اچھی طرح زدوکوب کیا۔ جو جو حربے یاد تھے اور جس جس سٹائل کا ذکر کتابوں میں پڑھا تھا، ان کے مطابق اُس کی مرمت کی۔ جب کبھی دھم سے اس کی لہراتی ہوئی ملائم تو ند پر مُکا لگتا تو قہقہوں کا شور مچتا اور خوب تالیاں بجتیں۔ سب سے زوردار اور دیرپا قہقہہ پرنسپل صاحب کا تھا جو فضا کو زیروزبر کر دیتا۔ میں نے اسے جلد ناک آؤٹ نہیں کیا کیونکہ اس کی توند پر مُکا لگنے سے نہایت پیاری اور ترنم خیز آواز نکلتی تھی جس سے تماشائی کافی خوش ہوتے تھے، راؤنڈ ختم ہونے سے پہلے ایک چھوٹا سا مُکا بلکہ ''مُکی'' لگا کر اسے ناک آؤٹ کر دیا۔

ہمارے کالج کے لڑکے چھلانگیں مار کر رنگ میں آ گئے۔ بڑا شور مچا۔ پھر میں چچا جان اور پرنسپل صاحب سے ملا۔ پرنسپل صاحب نے تعریفوں کے پُل باندھ دئے، بولے ''تم نے بڑی ہمت سے کام لیا اور اُس نے کمال رعونت سے، تمھاری وجاہت کو دیکھتا تھا کبھی اُس کی جہالت کو۔ تمھاری مدافعت بھی ظرافت سے پُر تھی، جس سے شرارت ٹپکتی تھی''

میں نے مئودبانہ عرض کیا ''افسوس کہ میں نے امانت میں خیانت کی۔''

وہ قہقہہ لگا کر بولے ''کیا لیاقت ہے۔''

یہ تھی پرنسپل صاحب سے پہلی ملاقات۔

ایک شام کو پاؤں پھیلا کر اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر مزے سے پکچر دیکھ رہا تھا۔ انٹرول میں ایک خاتون نظر آئیں جو اپنے ننھے بہن بھائیوں کے ساتھ بالکل قریب ہی بیٹھی تھیں۔ وہ بیرے کو بلانا چاہتی تھیں۔ کسی چیز کے لئے بچے ضد کر رہے تھے شائد، لیکن ان کی آواز یا ہاتھ کا اشارہ بیرے تک نہ پہنچ سکا۔ آس پاس اور کوئی نہ تھا، لہٰذا اُنہوں نے میری طرف دیکھا کہ میں اُسے بلا دوں۔ میں نے بڑے اطمینان سے سگریٹ کیس نکالا اور ایک سگریٹ سُلگا کر کش لگانے لگا۔ بھلا مجھے کیا پڑی جو کسی کو بلاتا پھروں۔ نہ جانے ایسی کیا اشد ضرورت تھی کہ اُنہوں نے پھر اُسے بلانے کی کوشش کی اور پھر میری جانب دیکھا۔ میں نے جواباً تین چار عمدہ کش لگائے اور دھوئیں کے چھلّے بنانے لگا۔ وہ کچھ ناراض سی ہو کر بیٹھ گئیں۔ بات آئی گئی ہوگئی لیکن اس کے بعد میں اکثر اُنہیں دیکھا کرتا۔ جب علی الصبح کالج جاتا تو ایک چوک میں کبھی کبھی نظر آتیں۔ ایک لمبی سی چمکیلی کار میں، شائد کہیں آس پاس اُن کا کالج تھا۔

ایک مرتبہ میں نے اسی چوک میں اپنے بالوں پر بیٹھی مکھی کو اُڑا دیا۔ وہ سمجھیں سلام کر رہا ہے۔ اُنہوں نے جواب میں مجھے بُری طرح دیکھا۔ اگلے روز پھر میرا ہاتھ یونہی ہل گیا۔ میں نے جلدی سے بالکل اُن کی نقل اُتاری۔ اس کے بعد جان بوجھ کر میں نے سلام کرنا شروع کر دیا۔ خفا ہوئیں، منہ پھیرا، منہ چڑایا، چپ رہیں، لیکن آخر راہِ راست پر آ گئیں۔ اب میرے سوال کا جواب تو نہ ملتا تھا لیکن بس مسکرا دیتیں۔ آہستہ آہستہ اچھی لگنے لگیں اور میں اُن کا انتظار کرنے لگا۔ ان کی کار کا نمبر میری ڈائری میں محفوظ تھا۔ ایک روز تو میں بہت ڈرا کہ کہیں ان سے سچ مچ محبت نہ ہو جائے۔

پرنسپل صاحب سے دوسری ملاقات کانسرٹ میں ہوئی۔ ہم کلب میں کانسرٹ کر رہے تھے۔ پروگرام کے ایک حصے میں قریشی صاحب اور مسز قریشی کی نقل اُتاری گئی۔ دونوں میاں بیوی حد درجے کے قنوطی تھے۔ جب دیکھو بسور رہے ہیں (اور جب نہ دیکھو، تب بھی بسور رہے ہیں) شیطان کا خیال تھا کہ ان کا ہاضمہ خراب ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ورزش نہیں کرتے اس لئے ایسے ہیں۔ دو سال کے عرصے میں ہم نے اُنہیں صرف تین بار مسکراتے دیکھا، وہ بھی ایسے موقعوں پر جب لوگ ہنستے ہنستے بیہوش ہو گئے تھے، تب وہ دونوں اس بیزاری سے مسکرائے تھے جیسے سب پر بہت بڑا احسان کر رہے ہوں۔ قریشی صاحب کا پارٹ میں کر رہا تھا اور

مسز قریشی شیطان تھے۔ سانولے ہونے کی وجہ سے ان پر پاؤ بھر پاؤڈر ضائع کیا گیا تھا۔ وہ کہتے تھے (یا کہتی تھیں) کہ میں سفید کپڑے پہنوں گا، جیسے اکثر مسز قریشی پہنتی تھیں۔ میں نے علیٰحدہ لے جا کر بتایا کہ ایک بالکل سیاہ انسان سفید کپڑے پہنے جا رہا تھا، اُدھر سے ایک ننھا سا بچہ اپنے باپ کے ساتھ آ رہا تھا جو فوٹو گرافر تھا۔ بچہ اُس شخص کو دیکھ کر ٹھٹک گیا اور اپنے والد سے بولا ''وہ دیکھئے ابا جان، ایک negative جا رہا ہے۔'' اس پر ان کے کان کھڑے ہوئے اور وہ باز آ گئے۔

شیطان دُبلے پتلے تھے۔ چونکہ ان کا قد لمبا تھا اس لئے اُنہیں نیچی کرسی پر بٹھایا گیا تھا تا کہ وہ چھوٹے لگیں۔ قریشی صاحب منہ لٹکائے کوئی بیماریوں کی کتاب پڑھ رہے تھے۔ دوسری طرف چہرہ بھلائے ہوئے مسز قریشی بالکل بیزار بیٹھی ہیں۔ سامنے کتابوں کا ڈھیر لگا ہے۔ ایک کتاب اُٹھاتی ہیں اور فوراً پھینک دیتی ہیں۔ پھر بیزار ہو کر بیٹھ جاتی ہیں۔ قریشی صاحب زور سے کھانستے ہیں۔ مسز قریشی چونک پڑتی ہیں۔

''یہ کمبخت زکام مجھے دبوچ بیٹھا ہے، ابھی پچھلے ہفتے تو ورمِ جگر رفع ہوا تھا۔'' وہ بولیں۔

''اور مجھے کھانسی دم نہیں لینے دیتی۔ اِدھر گلا ہے کہ الگ پکا دھرا ہے۔'' قریشی صاحب بولے۔

''آج پھر میری پسلی میں درد ہو رہا ہے!''

''میری بائیں آنکھ رہ رہ کر پھڑک رہی ہے، خدا خیر کرے!!''

''رات گرمی کس قدر تھی۔''

''اور مچھروں نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ آج ہی کاٹیں گے۔'' وہ بولے

''آج کا دن کتنا پھیکا اور غمگین ہے۔''

''اور رات کس قدر اُداس اور ڈراؤنی تھی؟ کتنے تارے ٹوٹے ہیں، الٰہی توبہ!''

(۔۔۔۔طویل خاموشی۔۔۔۔)

''سُنا ہے کہ امریکہ کے شمالی حصے میں بڑا زبردست زلزلہ آیا ہے، حالات کتنے خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔'' وہ بولیں۔

''اور آسٹریلیا کے جنوبی ساحل پر بڑا سخت طوفان آیا ہے، جس سے لوگ بہت سہمے ہوئے ہیں۔''

''میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ عنقریب دنیا سے کوئی سیارہ ٹوٹ کر ٹکرائے گا اور بیچاری دنیا چکنا چور ہو جائے گی۔ کیسی کیسی مصیبتیں نازل ہونے والی ہیں۔''

''مجھے بھی ہفتہ بھر سے طرح طرح کے ڈراؤنے خواب آ رہے ہیں۔ رات تو ایک لمبے سے اونٹ نے مجھے نگل ہی لیا تھا۔''

(۔۔۔۔ایک اور وقفہ۔۔۔۔)

باہر سے نوکر کے ہنسنے کی آواز آتی ہے۔

مسز قریشی کی تیوری چڑھ جاتی ہے۔ ہاتھ پاؤں میں تشنج سا آ جاتا ہے۔ جیسے ابھی کوئی دورہ پڑے گا۔ غصے سے کہتی ہیں ''یہ کم بخت ہر وقت ہنستا رہتا ہے، شائد اسے موت یاد نہیں۔''

''جو زیادہ ہنستے ہیں، وہی روتے ہیں۔ ان شاء اللہ جلد مصیبت میں گرفتار ہوگا، بھول جائے گا سب چوکڑی۔''

لوگ ہنس رہے تھے، اِتنے میں ایک خاص قسم کے فلک شگاف قہقہے کی آواز آئی۔ چوکنا ہو کر جو دیکھتا ہوں تو سامنے پرنسپل صاحب بیٹھے ہیں۔ ان کی نوکدار مونچھیں بجلی کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ مونچھیں حسبِ معمول تاؤ شدہ تھیں اور یوں اوپر کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں جیسے گھڑی کی سوئیاں گیارہ بج کر پانچ منٹ پر ہوتی ہیں۔ اُن کے ساتھ ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ غور سے دیکھا تو یہ وہی تھیں جن سے ہر روز چوک میں جھڑپ ہوتی تھی۔ میں بالکل گھبرا گیا۔ کچھ اپنا پارٹ بھی پوری طرح یاد نہیں کیا تھا اور پرامٹر کے سہارے چل رہا تھا۔ اب انہیں دیکھ کر اِدھر اُدھر کی ہانکنی شروع کر دی۔ فقرے غلط سلط بول رہا تھا۔ یہ غالباً پرنسپل صاحب کی صاحبزادی ہوں گی یا بھتیجی وغیرہ ہوں گی یا شائد یونہی اتفاقیہ طور پر بیٹھ گئی ہوں۔ عجیب مصیبت ہے۔ میں ہوں کہ بہک رہا ہوں، پرامپٹر چیخ چیخ کر پارٹ بتا رہا ہے۔ اس کی آواز لوگ سُن رہے ہیں اور کوب ہنس رہے ہیں۔ اُنہیں پتہ ہی نہیں کہ معاملہ کیا ہے۔ شائد اس لئے ہنس رہے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اسی طرح

ہوتا تھا۔ اِدھر پرنسپل صاحب کے فلک شگاف قہقہوں سے فضا کی دھجیاں اُڑ رہی ہیں۔ ابھی یہ ڈرامہ تہائی بھی ختم نہ ہوا تھا کہ مجبوراً پردہ گرا دیا گیا۔ اسٹیج پر کسی صاحب کو والکن دے کر بھیج دیا گیا۔ لڑکوں نے جھنجھوڑ ڈالا، دھمکایا، چمکارا۔ منتیں کیں لیکن میں مچل گیا کہ اب اس اسٹیج پر نہیں جاؤں گا۔ مجھے اپنے پارٹ یاد نہیں۔ باہر لوگ شور مچا رہے تھے۔ آخر تنگ آ کر شیطان بولا ''تمھاری سزا یہ ہے کہ تم خود اسٹیج پر جا کر کہو کہ مجھے معاف کیجئے، میں اپنا پارٹ بھول گیا ہوں۔''

اُنہوں نے دھکیل کر مجھے اسٹیج پر لا کھڑا کیا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ پھر یکا یک کچھ سوجھ گیا اور میں نے بڑے اطمینان سے کہا ''خواتین و حضرات! یہ جو کچھ آپ لوگوں نے دیکھا، محض نمونہ ہے جسے عموماً ٹریلر کہا جاتا ہے۔ پورا ڈرامہ آپ کو پھر کبھی دکھایا جائے گا۔ اسی ٹریلر سے اندازہ لگا لیجئے کہ اصلی چیز کتنی زوردار ہوگی۔''

لوگ ہنسنے لگے لیکن پرنسپل صاحب کے بلند اور دیرپا قہقہے سارے غل غپاڑے پر فوقیت رکھتے تھے اور ان کی مونچھیں بجلی کی روشنی میں بہت پیاری لگ رہی تھیں۔

آخر میں نے شیطان کو ساری بات بتا دی، وہ بہت ہنسے۔

پھر پوچھنے لگے ''کیا واقعی تمھیں محبت ہوگئی ہے؟''

میں نے کہا ''ہاں کچھ کچھ ہوگئی ہے۔''

بولے ''ان کا نام کیا ہے؟''

میں نے کہا ''پتہ نہیں!''

پوچھا ''رہتی کہاں ہیں؟''

''یہ بھی پتہ نہیں، البتہ ان کی کار کا نمبر زبانی یاد ہے۔''

''کبھی بات کی؟''

''نہیں!'' میں نے سچ کہہ دیا۔

''ان کے ابا کی تعریف؟''

''اچھی طرح تو پتہ نہیں، لیکن کچھ اندیشہ سا ہے کہ کہیں پرنسپل صاحب ہی نہ ہوں۔''

بولے ''حد ہوگئی، اندیشہ سا ہے؟ اور جو پرنسپل صاحب نہ ہوئے، پھر؟ تم تو فرہاد وغیرہ کی قسم کے انسانوں کو مات کر گئے۔ ایسا عشق تو ہوا کرتا تھا کہیں سولہ سو۔۔۔۔سولہ سو پچیس میں! خوامخواہ کی محبت تب ہوا کرتی تھی جب مشرق میں لڑکیاں نہیں تھیں۔ میرا مطلب ہے سارا دن چھپی بیٹھی رہتی تھیں، کہیں کسی کو اتفاق سے دیکھ پایا اور فوراً محبت شروع کر دی اور اب۔۔۔آج کل تو خدا کا فضل ہے۔ اِس زمانے میں اِس قسم کے دقیانوسی خیالات بالکل بے موسے ہیں۔''

''مجھے تو ہر رات ان کے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ خوابوں میں ان سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔''

''خوب! تو خواب دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں تمھارا قصور نہیں۔ اگر رات کو دسترخوان پر ذرا دیر لگا دی جائے تو پھر خواب نہیں نظر آئیں گے تو اور کیا ہوگا؟ ذرا بھوک رکھ کر کھایا کرو تب دیکھیں گے کیا نظر آتا ہے۔ مجھے تو سو کر ذرا سدھ نہیں رہتی۔ صبح حجام ہی جگاتا ہے، کبھی پریاں نہیں جگاتیں۔'' وہ بولے۔

آج کل تو تقریباً ہر روز اُنہیں دیکھتا ہوں۔ اسی چوک میں، وہ مجھے دیکھ کر مسکراتی ہیں اور۔۔۔!''

''تمھاری ہی ہمت ہے جو اِتنی گرمیوں میں محبت کا نام لیتے ہو۔ مجھے تو ان دنوں محبت کا ذکر سنتے ہی پسینہ آجاتا ہے۔ میری مانو تو اپنی اس عجیب و غریب محبت کو تھوڑے دنوں کے لئے ملتوی کر دو، تین چار مہینوں کی بات ہے۔ موسم خوشگوار ہو جائے گا، تب جو مرضی آئے کرنا۔''

میں نے ایک لمبی آہ بھری اور چھت کی طرف دیکھ کر کہا ''روفی! تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ محبت بھی کہیں ملتوی ہوئی ہے بھلا؟ عشق پر زور نہیں، یہ ہے وہ آتش غالب۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔''

''میرا ذاتی نظریہ تو یہی ہے کہ ایک تندرست انسان کو محبت کبھی نہیں کرنی چاہئیے۔ آخر کوئی تک بھی ہے اس میں؟؟ خوامخواہ کسی کے متعلق سوچتے رہو، خواہ وہ تمھیں جانتا ہی نہ ہو۔ بھلا کس فارمولے سے ثابت ہوتا ہے کہ جسے تم چاہو، وہ بھی تمھیں چاہے۔ میاں یہ سب من گھڑت قصے ہیں۔ اگر جان بوجھ کر خبطی بننا چاہتے ہو تو بسم اللہ، کئے جاؤ محبت۔ ہماری تو نصیحت یہی ہے کہ صبر کرلو۔''

مجھے غصہ آ گیا۔ یہ شخص ہمیشہ مسخرہ بنا رہتا ہے۔

''تم بالکل خشک انسان ہو، بلکہ گرم خشک۔ بالکل غیر رومانی قسم کے،تم سے ایسی باتیں کرنی فضول ہیں۔تم ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔''میں نے جھلا کر کہا۔

''اورتم بہت سمجھ سکتے ہو۔کم ازکم تمھیں اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ایک چھ فٹ کے تندرست انسان کو کوئی حق نہیں کہ وہ محبت جرے اور اس صورت میں جب کہ وہ صبح سے شام تک ورزش کرتا ہو۔تمھاری صحت محبت کے قابل نہیں۔تم تو جا کر ورزش کرو۔''

میں غصے سے تلملا اُٹھا اور بغیر ایک لفظ کہے واپس چلا آیا۔

یکا یک وہ خاتون غائب ہو گئیں۔ اگلے ہفتے پتہ چلا کہ پرنسپل صاحب کا تبادلہ ہو گیا ہے اور وہ خاتون واقعی اُن کی صاحبزادی تھیں۔ بڑا افسوس ہوا۔دن بھر سوچتا رہا اگر پتہ ہوتا کہ یہ ان کی صاحبزادی ہیں تو یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھا رہتا۔ اب تو وہ سب کہیں دور چلے گئے ہوں گے۔شیطان کے پاس گیا۔ ساری بات بتائی اور پوچھا کہ اب کیا کیا جائے؟

وہ بولے''بھلے آدمی!عقل کے ناخن لے، نہ کبھی بات کی نہ کچھ اور، خوا مخواہ افسوس کرنے سے فائدہ؟ دنیا بہت وسیع ہے اور حادثے بھی ہوتے رہتے ہیں۔کیا پتہ کل تجھے کوئی اور چیز نظر آ جائے، اس سے بہتر۔ باقی رہا تبادلہ سو اس پر کسی کا زور نہیں، یہ دنیا کا دستور ہے،ہم نے صبر کیا تھا،تو بھی صبر کر انا اللہ وانا۔۔۔۔''

''آہ پرنسپل صاحب!'' میں نے ایک سرد آہ بھر۔ان دنوں سرد اور گرم دونوں آہیں آسانی سے بھر سکتا تھا۔کافی پریکٹس تھی۔

''اب آہ پرنسپل صاحب یا ہائے پرنسپل صاحب کہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ پرنسپل صاحب کی ذات سے تمھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ویسے وہ کچھ اِتنے دور بھی نہیں گئے اور اگر تم ان کی نگاہوں میں آ گئے ہو تو وہ تمھیں نہیں بھولیں گے اور شائد کبھی یاد ہی فرما لیں۔''

میں سوچنے لگا ''شائد یاد ہی فرما لیں۔''

اور سچ مچ اُنہوں نے یاد فرما لیا۔ایک ٹورنامنٹ کے سلسلے میں مدعو کیا اور یہ بھی لکھا کہ کوٹھی میں کافی جگہ ہے، میرے پاس ٹھہرنا۔ میں بہت خوش ہوا۔اس بار خوب اکڑ کر چلا۔مٹھیاں بھینچ کر اور سینہ نکال کر۔میرے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔اب بہت جلد ان خاتون کا اچھی طرح سے منہ چڑاؤں گا اور اُنہیں سلام کا جواب بھی دینا پڑے گا اور یہ کہ میں ایک ذمہ دار اور عقلمند لڑکا ہوں۔لوگ مجھے بہت اچھا سمجھتے ہیں، تبھی تو پرنسپل صاحب محض دو تین مرتبہ دیکھنے کے بعد اِتنے متاثر ہو گئے، ورنہ شیطان بھی تو ہیں، سانولے رنگ کے،شتر مرغ قسم کی قسم کے انسان۔چہرے پر نہ ذہانت ہے اور نہ کچھ اور، بالکل کورے دکھائی دیتے ہیں۔اُنہیں تو کسی نے پسند نہیں کیا۔شائد پرنسپل صاحب اس شام کو مجھے لڑتا دیکھ کر خوش ہو گئے۔اُنہوں نے ضرور میرا نام اخباروں میں پڑھا ہوگا۔بس مرعوب ہو گئے ہیں۔ ولایت میں تو کھلاڑیوں کی بہت قدر ہوتی ہے، کیا سپرٹ دکھائی ہے اُنہوں نے واللہ!اور پھر میں ہوں کسی سے کم؟ ایم اے کا طالب علم، ہمیشہ چوٹی کے لڑکوں میں شمار ہوتا ہوں۔چند مہینوں میں ایم اے پاس کرلوں گا، پھر مرکزی امتحان کے مقابلے میں شریک ہوں گا۔تب سب کو پتہ چلے گا کہ میں محض ایک کھلاڑی ہی نہیں ہوں، مجھ میں کئی اور خوبیاں بھی ہیں، جن کے سامنے پرنسپل صاحب جیسے نقاد نے ہتھیار ڈال دیئے۔

میں نے تیاریاں شروع کر دیں۔پانچ روز کے بعد جانا تھا۔ متوقع گفتگو کی اسکیم بنائی کہ وہ تقریباً کیسی کیسی باتیں کر سکتے ہیں اور ان کا دندان شکن جواب کیا کیا ہو سکتا ہے۔ان کے سامنے گھبرانے کا تو سوال ہی نہ تھا۔سپورٹس میں کبھی گھبراتے ہیں کیا؟

شیطان نے بڑی بدتمیزی دکھائی کہ مبارکباد تک نہ دی۔ میں نے سوچا کہ رشک آ رہا ہوگا جناب کو،لیکن اتفاق سے جس شہر میں پرنسپل صاحب تھے، وہیں شیطان چند دنوں کی چھٹیوں پر جا رہے تھے، چنانچہ ہم اکٹھے روانہ ہوئے۔ میں نے دھاریوں والا بہت اچھے کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا اور ویسے ہی رنگ کی پھولدار بو لگا رکھی تھی۔ بو کچھ تنگ تھی، اس کا ایک سخت سا حصہ بُری طرح چبھ رہا تھا۔ میری گردن بالکل اکڑی ہوئی تھی۔ ذرا بھی ہلا نہ سکتا تھا۔ بار بار اسے ڈھیلا کرتا اور وہ گردن میں پھر پیوست ہو جاتی۔

شیطان بولے ''اگر میں تمھاری جگہ ہوں تو اس کم بخت کو پھینک دوں ایک طرف، آخر کس حکیم نے کہا ہے کہ ضرور بولا گائی جائے۔''

مجھے شبہ ہوا کہ حسد سے جل رہا ہے۔

''اور اپنی طرف سے دل میں بہت خوش ہو رہے ہو گے کہ بڑے تیر مارنے جا رہے ہو۔'' وہ بولے اور میرا شبہ یقین میں تبدیل ہو گیا۔ مجھے شیطان کے عزیزروں کے ہاں ٹھہرنا پڑا۔ اگلے روز پرنسپل صاحب سے ملنا تھا۔ لباس کا انتخاب کرنے لگا اور شیطان کی رائے لی۔ وہ بولے ''کچھ پہن لو، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''فرق کیوں نہیں پڑے گا، میرے خیال میں یہ دھاریوں والا سوٹ اور یہ بو سب سے۔۔۔۔''

''خواہ نیکر پہن کر چلے جاؤ یا تہہ باندھ لو، اب کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''آخر کیوں نہیں پڑے گا؟ لباس کی تمیز بھی کوئی چیز ہے۔''

''لباس کا خیال چھوڑو، وہ پہلے سے فیصلہ کر چکے ہیں۔''

''گویا مجھے تفریحاً بلایا گیا ہے؟''

''یقیناً''

''روفی! تم ایک زود رنج اور چڑچڑے انسان ہو۔ پہلے میرا خیال تھا کہ تمھیں رشک آ رہا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ حسد سے تمھارا بُرا حال ہے۔''

اور اُنہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

''آخر ہنسنے کی کیا بات ہے اس میں؟'' میں نے پوچھا۔

''پرنسپل صاحب کو جو کچھ چاہیئے وہ تمھارے ہاں موجود ہے۔ تمھارے ابا کی تنخواہ کافی ہے۔ تمھارے ہاں اچھی سی کار ہے۔ تمھاری جائیداد بھی ہے اور بالکل مختصر سا کنبہ ہے۔ بس ان سب باتوں کی جانچ پڑتال کے بعد پرنسپل صاحب راضی ہو گئے ہیں اور تم خواہ مخواہ بیچ میں تاؤ کھا رہے ہو۔''

''لیکن کار تو ابا کی ہے، اس سے میرا تعلق؟''

''کچھ بھی سمجھ لو لیکن اُنہیں یہی تو چاہیئے تھا۔''

''اور اگر یہ سب باتیں ہم میں نہ ہوتیں تو؟''

''تو یہی کہ تم دن رات کے بازی کرتے، تیرنے میں کپوں کی گٹھڑیاں جیت لیتے، ایم اے چھوڑ پچھ اور بھی کر لیتے، تب بھی تمھیں کوئی نہ پوچھتا۔''

''جھوٹ ہے۔'' میں نے جوش سے کہا ''بھلا ابا کی چیزوں کا مجھ سے تعلق؟ میرے پاس تو اپنی قابلیت ہے، بلند ارادے ہیں، ہمت ہے۔''

''تمھارے پاس سب کچھ ہوگا، لیکن تمھارا انتخاب محض کار وغیرہ کی وجہ سے ہوا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں، عموماً یہی ہوا کرتا ہے۔''

مجھے بڑا غصہ آیا۔ جی چاہا کہ شیطان کو ناک آؤٹ کر دوں۔ یونہی انٹ شنٹ ہانک رہا ہے۔

''پرنسپل صاحب بہت بڑے عالم ہیں۔ نہایت وسیع خیالات کے انسان ہیں۔ تم اُن پر اِتنا بڑا الزام لگا رہے ہو۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ مجھے محض میری خوبیوں کی وجہ سے پسند کرتے ہیں۔''

''خیر، تم مصر ہو تو کرتے ہوں گے۔''

مجھے پھر غصہ آ گیا ''آخر کیا ثبوت ہے تمھارے پاس؟''

''ثبوت؟۔۔۔ ثبوت یہی کہ کل پرنسپل صاحب سے اپنے گھر کے متعلق ذرا اکھڑی اکھڑی باتیں تو کر کے دیکھو، پھر پتہ چل جائے گا۔''

''اور جو تمھاری باتیں غلط ثابت ہوئیں تو؟''

''تو جو چور کی سزا وہ میری سزا، عمر بھر تمھیں ایک بھی نصیحت کر جاؤں تو نام بدل دینا۔''

میں سوچنے بیٹھ گیا۔ بتانے کو تو غلط باتیں بتا دوں لیکن اس کے نتائج نہ جانے کیسے نکلیں۔ کہیں ابا کو پتہ نہ چل جائے۔

''پرنسپل صاحب تو ابا سے ملے ہوں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں! صرف چچا جان سے ملے تھے، وہ بھی سرسری طور پر۔''

ذرا سی بحث کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ پرنسپل صاحب کو غلط باتیں بتاؤں گا۔ مجھے پختہ یقین تھا کہ وہ ان باتوں کا اِتنا سا بھی

خیال نہیں کریں گے۔ وہ مجھے پسند کرتے ہیں، بھلا اس میں موٹر اور جائیداد کا کیا سوال ہے؟

شیطان مجھ سے ہاتھ ملا کر بولے ''آزمائش شرط ہے۔''

شام کو اُن کے ہاں جانا ہوا۔ میں نے وہاں دھاریوں والا سوٹ پہنا۔ پھولدار بو لگائی، جس نے میری گردن کو جکڑ کر رکھ دیا۔ پرنسپل صاحب نے اپنی کار بھیجی تھی۔ میں نے شیطان کو بھی ساتھ گھسیٹا کہ چلو تم بھی یہ تماشہ دیکھ لو۔

مجھے ڈرائینگ روم میں بٹھایا گیا۔ شیطان بہانے سے ان کی لائبریری میں گھس گئے جو ساتھ ہی تھی۔ میں بڑی حیرانی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ تین ریڈیو رکھے تھے۔ ایک کو استعمال کرتے ہوں گے، دو شائد بگڑے ہوئے ہوں۔ چھوٹے چھوٹے کتے، بلیاں طوطے، بُت، عجیب و غریب تصویریں۔ انگیٹھی، میزیں، الماریاں، سب کی سب ایسی چیزوں سے لدی ہوئی تھیں لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ آج ہی رکھا گیا ہے۔

خوشبو کی ایک زبردست لپٹ آئی اور پرنسپل صاحب داخل ہوئے۔ ایک بہت ہی چمکیلے سوٹ میں ملبوس، بال بہت اچھے بنے ہوئے تھے بلکہ استری کئے گئے تھے۔ ان کی دونوں نوکدار بڑھیا مونچھیں بجلی کی تیز روشنی میں نگاہوں کو خیرہ کئے دیتی تھیں۔ وہ حسبِ معمول چھت کی جانب اشارہ کر رہی تھیں جیسے کسی ٹائم پیس میں گیارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے ہوں۔ نہ جانے اُنہوں نے روغنِ مونچھ استعمال کیا تھا یا کوئی اور خاص مونچھ کریم لگا کر آئے تھے۔

مجھے دیکھ کر تو وہ جیسے آپے سے باہر ہو گئے۔ مسکرائے، ہنسے، چلائے، میرے ہاتھ کو دس ہارس پاور سے یوں بھینچا کہ جیسے توڑ کر دم لیں گے۔ ان کا میک اپ دیکھ دیکھ کر میں حیران ہو رہا تھا۔ بھلا یہ انٹرویو کس کا ہو رہا ہے، میرا یا ان کا؟

بولے ''کم از کم ایک ماہ تو تم یاں ضرور ٹھہرو گے۔ نہیں؟ واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی، تمھیں جانے کون دیتا ہے۔ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔ غیر حاضری لگے گی؟ لگ جائے، کیا پرواہ ہے۔ کھیلنے کے لئے یہاں بیشمار کلب ہیں۔ کرکٹ ہے، باکسنگ ہے، ٹینس ہے، سب کچھ ہے۔''

جس تیز رفتاری سے وہ باتیں کر رہے تھے، میں ان سے مرعوب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کم بخت بو گردن میں بُری طرح چبھ رہی تھی۔ اسے ٹھیک کرتے کرتے تنگ آ چکا تھا۔

''میں نے چھ برجی کلب میں تمھیں کھیلتے دیکھا، پروفیسر گراؤ چو تمھاری بڑی تعریفیں کر رہے تھے۔ اخباروں میں کتنی مرتبہ تمھارے متعلق پڑھا۔ خوب! تو ایم اے کا امتحان دے رہے ہو۔ ہم نے تمھاری لیاقت کی شہرت بھی سُنی ہے۔ یہ ساری خوبیاں تم میں اکٹھی کیسے ہو گئیں؟ ایم اے کوئی مذاق تھوڑی ہے اور پھر ذہین لڑکے تو کھیلنے میں عموماً پھسڈی ہوتے ہیں۔ نہ جانے تم یہ سب کچھ کس طرح کر لیتے ہو؟''

اُنہوں نے جوش میں آ کر میرے کندھے مسل ڈالے۔

میں سوچنے لگا کہ شیطان بالکل جھوٹ بولتے تھے۔ پرنسپل صاحب تو میری خوبیاں بیان کر رہے ہیں۔ بھلا اُنہوں نے ہمارے گھر کے متعلق بھی پوچھا ہے کہیں؟ مجھے شرمندہ ہونا چاہیئے۔ توبہ توبہ کیسی کیسی فضول باتیں میں اُن سے منسوب کرتا رہا ہوں۔ استغفر اللہ!

''تو کم از کم ایک ماہ یہاں رہو گے۔ مجھے تو فقط دو مرتبہ کار کی ضرورت پڑتی ہے، دن بھر یہ یونہی کھڑی رہتی ہے۔ تم اسے خوب لئے پھرنا۔ یہ کار کیسی ہے؟ یہی جس میں تم آئے ہو۔ بیوک کا نیا ماڈل ہے۔ پہلے ہمارے ہاں ڈاج تھی، وہ اچھی نہ تھی۔ جی چاہا پونٹیک لے لوں۔ سٹوڈی بیکر پر بھی دل للچایا، بڑی عمدہ کار ہوتی ہے لیکن آخر یہی لے لی۔ بھلا تمھارے ہاں کون سی کار ہے؟''

میں چونک پڑا۔ سوچنے لگا کہ اب کیا کہوں؟ بو زور سے چبھی۔ میں نے جلدی سے اسے ٹھیک کیا، پھر عجیب سا منہ بنا کر کہا ''ہمارے ہاں؟ ہمارے ہاں تو کوئی کار نہیں۔''

کیا کہا؟۔۔۔۔کوئی کار نہیں؟؟''

''جی نہیں، ہمارے ہاں کوئی کار تھی ہی نہیں، البتہ مربعوں پر چند اونٹ ضرور ہیں۔''

''لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ تمھارے ہاں کار ہے۔''

اُنہوں نے یوں منہ بنایا جیسے بچے کونین مکسچر پی کر بنایا کرتے ہیں۔

’’جی ہاں، اُنہوں نے غلط بتادیا ہوگا۔‘‘ میں نے کہا۔

ان کی دونوں تنی ہوئی تاؤ شدہ مونچھیں یک لخت ڈھیلی پڑ گئیں اور اب وہ بالکل خطِ مستقیم بنا رہی تھیں، جیسے گھڑی کی سوئیاں ساڑھے نو بجے ہوتی ہیں۔

’’آپ خاموش ہو گئے۔‘‘ میں نے متودبانہ کہا ’’کیا ہوا، کار ہوئی نہ ہوئی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟‘‘

’’ہاں، ہاں کوئی بات نہیں۔ وہ تو یونہی پوچھ رہا تھا، لیکن مجھے، مجھے کسی نے بتایا تھا کہ تمھارے ہاں کار ہے، خیر!‘‘ ان کا جوش و خروش کچھ کم ہوگیا تھا۔ اپنی انگلیاں چٹخانے لگے، پھر بولے ’’آج کل ابا کہاں ہیں؟‘‘

’’پنشن ہوگئی ہے، کشمیر گئے ہوئے ہیں۔‘‘ حالانکہ پنشن ملنے میں ابھی کئی سال باقی تھے۔

’’افوہ! پنشن پر ہیں؟ لیکن مجھ سے کسی نے کہا تھا ابھی سروس میں ہیں۔‘‘

’’یونہی کسی نے کہہ دیا ہوگا۔‘‘

پرنسپل صاحب نے پھر بہت بُرا سا منہ بنایا۔

’’اور ہاں، تمھاری زمینیں؟‘‘

’’اچھا، ماموں جان کے مربعوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ دراصل وہ ہمارے نہیں، ساری جائیداد ماموں جان کی ہے۔‘‘

’’وہ زمینیں بھی متھاری نہیں؟‘‘ وہ چلا کر بولے ’’غضب خدا کا، تو کیا سچ مچ وہ کسی اور کی ہیں؟‘‘

’’جی ہاں! سچ مچ۔۔۔ نہ جانے کس نے آپ کو ساری باتیں غلط بتا دیں!‘‘

’’لاحول ولا قوۃ۔۔۔ کار والی بات بھی غلط، سروس والی بھی غلط، جائیداد والی بھی غلط، لاحول ولا قوۃ!‘‘

’’میں اس مرتبہ ایم اے کے امتحان کی تیاری۔۔۔!‘‘ میں نے شروع کیا۔

لاحول ولا۔۔۔ ابھی ایم اے کے امتحان میں بڑے دن ہیں، اسے چھوڑو۔‘‘

’’تمھارے چھوٹے بھائی کہاں ہیں آج کل؟‘‘

’’کون سے چھوٹے بھائی کا ذکر کر رہے ہیں آپ؟‘‘ میں نے معصومیت سے پوچھا۔

’’لاحول ولا۔۔۔ تمھارے چھوٹے بھائی کا!‘‘

’’جناب، ہم کل آٹھ بھائی ہیں۔‘‘ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

اُنہوں نے چیخ ماری۔ ’’آٹھ بھائی؟ لیکن مجھے تو بتایا گیا تھا کہ۔۔۔ (زور سے) تو گویا سچ مچ آٹھ بھائی ہیں۔۔۔ اور کار والی بات بھی غلط ہے؟ لاحول ولا قوۃ۔‘‘

پرنسپل صاحب کا چہرہ دفعتاً اُتر گیا۔ ان کی چمکدار مونچھیں اور نرم ہو گئیں اور پھر یکلخت ڈھلک سی گئیں، جیسے گھڑی کی سوئیاں آٹھ بج کر بیس منٹ پر ہوتی ہیں۔

’’تو گویا مجھے بالکل غلط باتیں بتائی گئی ہیں۔ یقین نہیں آتا۔ لاحول ولا۔۔۔ سچ مچ تمھارے ہاں کار نہیں؟ عجب تماشہ ہے، مجھے تو بڑے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ۔۔۔‘‘

’’قبلہ گستاخی معاف، آپ پانچ منٹ میں سات آٹھ مرتبہ لاحول پڑھ گئے ہیں۔‘‘

’’اوہو! خیال نہیں رہا لیکن سوچو تو سہی ذرا، سب کی سب باتیں غلط بتائی گئیں۔‘‘

پرنسپل صاحب نے صاف ظاہر کر دیا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔

میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا ’’آپ بُرا نہ مانیے، مجھ میں نقائص نکالئے، بھلا ابا جان کی کار ہو یا اُن کی جائیداد، اس سے میری خوبیوں میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ میں ایم اے کا امتحان دینے والا ہوں، ضرور پاس ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد کئی مقابلوں میں شامل ہوسکتا ہوں۔ ابھی ابھی آپ نے مجھے ذہین کہا ہے۔ میرے ارادے بلند ہیں۔ آپ میرے پرانے سرٹیفکیٹ دیکھ لیجیے اور وہ۔۔۔!‘‘

’’ہاں، ہاں، یہ سب ٹھیک ہے۔ خدا کرے تم کامیاب ہو

جاؤ، لیکن مجھے تو ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہوا تھا کہ تمھارے ہاں۔۔۔ ویسے تم بھی سچ کہہ رہے ہو، لیکن وہ۔۔۔ یونی کہ۔۔۔ مجھے سچ مچ غلط بتایا گیا۔"

"آپ کار کا ذکر بار بار کرتے ہیں، سو میں سچ عرض کرتا ہوں کہ چند ہی سالوں میں ایک چھوڑ دو کاریں لے لوں گا اور وہ میری ہوں گی۔ آپ میرے متعلق بھی تو کچھ پوچھیے۔ آپ نے اکثر اخباروں میں میرے متعلق پڑھا ہوگا۔"

"اسے چھوڑو، کھیل کود بیکار چیز ہے، اور یہ ڈرامہ وغیرہ مسخروں کا کام ہے۔ باقی رہا ایم اے میں پڑھنا، سو یہ ایک معمولی سی بات ہے۔ ہزاروں لڑکے ایم اے میں پڑھتے ہیں۔" وہ بیزار ہو کر بولے۔

"لیکن جناب، میرے پاس حوصلہ، امیدیں ہیں، مستقل مزاجی ہے، بلند ارادے ہیں۔"

"ہوں گے! خدا کرے ہوں! نہ جانے مجھے یہ باتیں کیوں غلط بتائی گئیں۔ اگر کہیں مجھے پہلے پتہ چل جاتا کہ تمھارے ہاں۔۔۔!"

اس کے بعد وہ کچھ دیر تک کمرے میں ٹہلے۔ اُنہوں نے ایک سگریٹ پیا (اکیلے اکیلے) کچھ دیر سر جھکائے سوچتے رہے۔ تین چار مرتبہ مجھے دیکھا بھی۔ دیر تک مراقبے میں رہے، پھر بولے "میں کل کہیں باہر جا رہا ہوں، بڑا ضروری کام ہے، کئی روز تک نہ آسکوں گا۔ تم یہاں اکیلے اداس ہو جاؤ گے، ویسے تمھارا ارادہ کب ہے واپس جانے کا؟"

"چلا جاؤں گا۔"

"ہاں میں کم از کم ہفتہ بھر باہر رہوں گا۔ یہاں تنہا ہوگا۔ اس سے تمھارا کیا جی بہلے گا۔ پھر تمھاری غیر حاضریاں بھی لگ رہی ہیں۔ اچھا، تو بہت دیر ہوگئی، کہو تو موٹر نکلوا دوں؟ ویسے راستہ لمبا تو نہیں ہے، کل دس پندرہ منٹ کا ہے۔ میرے خیال میں پیدل بہتر رہے گا۔"

"اچھا۔"

اُنہوں نے ڈھیلا سا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ ہاتھ ملا کر بلکہ ہاتھ چھو کر میں نے مؤدبانہ سلام عرض کیا اور چل دیا۔ دروازے سے مڑ کر جو دیکھتا ہوں تو دونوں نوک مدار مونچھیں بالکل لٹک رہی تھیں۔ پرنسپل صاحب کی بڑھیا مونچھوں میں ساڑھے چھ بج چکے تھے۔

دروازے پر شیطان ملے۔ ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگے۔ بو ایک مرتبہ پھر چبھی، اس مرتبہ میں نے اسے نوچ کر پرنسپل صاحب کے لان میں پھینک دیا۔

کوٹھی کے دروازے پر شیطان نے ایک زبردست فلک شگاف قہقہہ لگایا اور مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ ہم کتنے زور سے ہنسے؟ اس کا اندازہ تو نہیں البتہ آس پاس کے درختوں پر جتنے پرندے بسیرا کر رہے تھے، وہ سب کے سب اُڑ گئے۔

اِن باتوں کو ایک عرصہ گزر گیا۔ اب میں کسی چوک میں گزرتی ہوئی کار کو دیکھ کر ہرگز نہیں ٹھہرتا۔ کسی خاتون کو دیکھ کر اگر میرے بالوں پر مکھی بیٹھی بھی ہوئی ہو تب بھی نہیں اُڑاتا، نہ کبھی کسی خاتون کو سلام کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ رات کو ہمیشہ بھوک رکھ کر سوتا ہوں۔

اور جب کبھی کھیل کود کے بعد زیادہ تھک جاتا ہوں تو آنکھیں مندنے لگتی ہیں، غنودگی سی طاری ہو جاتی ہے۔ پرانی یادیں تازہ ہونے لگتی ہیں۔ نظروں کے سامنے سیاہی اور سفیدی کے ٹکڑے ناچنے لگتے ہیں۔ کچھ تصویریں بن جاتی ہیں، پھر وہ متحرک ہو جاتی ہیں۔ تب سامنے رکھے ہوئے ٹائم پیس کے گرد ہالہ سا بن جاتا ہے۔

کبھی کبھی شام کو ساڑھے چھ بجے ایک جوڑی بڑھیا، نوکدار، چمکیلی، تاؤ شدہ مونچھیں یاد آجاتی ہیں، جن پر پہلے گیارہ بج کر پانچ منٹ تھے، پھر سوا نو اور اسی طرح آخر میں ساڑھے چھ بج گئے تھے۔

شفیق الرحمٰن (۹ نومبر ۱۹۲۰ء تا ۱۹ مارچ ۲۰۰۰ء) معروف افسانہ نگار اور اُردو کے مزاحی ادب کے معماروں میں سے ایک تھے۔ وہ پیشہ ور ڈاکٹر تھے اور پاکستان بری فوج سے منسلک رہے۔ اُنھیں ہلالِ امتیاز سے بھی نوازا گیا۔ اُن کی ایک درجن سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں جن میں حماقتیں، مزید حماقتیں، شگوفے، کرنیں، دجلہ، انسانی تماشہ وغیرہ شامل ہیں۔

سیّد عارف مصطفیٰ

یہ شوہر بڑے وہ ہیں

پطرس بخاری کی مانند چونکہ میں بھی ایک شوہر ہوں چنانچہ ایک بیوی یافتہ ہوں، بے پناہ محبت کا دعویدار نہیں اور تھوڑی سی محبت کا روادار نہیں۔ وہ کہیں گھر پہ نہ ہو تو بے حساب امن کے باوجود بے تحاشا سناٹے میرے اندر بولنے لگتے ہیں، لہو گرم رکھنے کے بہانے ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے، اور مجھے وہی میدان جنگ بے طرح بھانے لگتا ہے کہ جس کو کبھی غصے سے نہ جانے کیا کیا نام دے چکا ہوتا ہوں لیکن کیا کروں پھر وہ واپس آجاتی ہے اور ماحول پھر ویسے کا ویسا ہی مورچہ بند سا ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ میں زیادہ تر شوہروں کی طرح اک عام سا شوہر ہوں، تاہم یہ بتانے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ میری بیوی اکثر بیویوں کی مانند ایک خاص بیوی ہے۔ ایسا نہیں، کہ وہ یہ بات کہتی ہے لیکن دوسروں کی بیویوں کی طرح وہ یہی ثابت کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتی ہے۔ یہ جو میرے اندر کیلشیئم کے علاوہ اعتماد کی کمی پائی جاتی ہے اس کی وجہ بھی میری بیوی کا میرے بارے میں عجیب برتاؤ ہے۔ غصے کی نوک پہ آ کر وہ کہتی ہے "آپ بڑے وہ ہیں" لیکن وہ سے اُس کی کیا مراد ہے، کبھی واضح نہیں کرتی، محض اندازے سے ہی قیاس کرتا ہوں اور یہ قیاس بھی بتانے کے قابل نہیں ہوتا۔

میری لائی ہوئی کوئی چیز کبھی پسند نہ آنا (یا کم از کم فوری پسند نہ آنا) شاید اس کے اُن ازدواجی اعتقادات کا حصہ ہے کہ جو اسے سینہ بہ سینہ ورثے میں ملے ہیں اور جس کے تحت شوہر کو خدانخواستہ فوری خوشی فراہم کرنا عورت کے مفتوح ہو جانے کی نشانی ہے۔ میں جب بھی شہر سے باہر جاتا ہوں، مختلف اشیاء خصوصاً کپڑوں کی سوغات ساتھ لے کر آتا ہوں۔ اس سلسلے میں مہارت تامہ حاصل کرنے اور اپنے جوہر خریداری کو منوانے کے لیئے میں نے کئی بار اپنی عزتِ سادات کو بے پناہ خطرے میں بھی ڈالا ہے اور آس پاس

خریداری کرتی ہوئی خواتین کے ہنر سے استفادہ کرنے کے لیئے میں نے کسی ایک کو چن کر اس کے ساتھ ساتھ رہنے کی معصومانہ کوشش متعدد بار کی ہے تاہم ایسی زیادہ تر کوششیں خاصے نامناسب انداز میں ختم ہوئی ہیں یا بلکہ کرائی گئی ہیں کیونکہ بلاشبہ کسی ناخلف دکاندار کی نگرانی میں مارکیٹ کے باہر چھڑوائے جانے سے خریداری کے ولولے آناً فاناً ماند بھی پڑ جاتے ہیں اور مجرب ہے کہ ایسے مواقع پہ دائیں بائیں دیکھے بغیر آگے ہی آگے چلتے رہنے اور یکا یک پاس سے گزرتی کسی سواری میں سوار ہی ہو جانے سے اعصاب کا تناؤ کسی قدر کم ہو پاتا ہے۔ ایسے ہر موقع پہ میں دانت پیس کر اپنے آپ سے یہ کہتا ہوں کہ ''لعنت ہے ایسی خریداری پر اور فوری عہد کرتا ہوں کہ آئندہ یہ غلطی نہ کروں گا لیکن آخر کو انسان ہوں، غلطی کرتے رہ کر خود کو فرشتہ ہونے سے بچانے اور شرف انسانیت پہ فائز رہنے میں جتا رہتا ہوں۔

محض ایک خریداری ہی کی بات نہیں، نکاحی حراست میں لیئے جانے کے تھوڑے ہی عرصے میں میرے خانہ زاد تفتیشی افسر نے میرے اندر ایسے بہت سے قابلِ اعتراض پہلو ڈھونڈھ نکالے تھے کہ میں ان کی روشنی میں خود اپنے آپ سے مل کر بہت دنوں تک شرمندہ شرمندہ سا رہا اور اگر خدانخواستہ اکثر مردوں کی طرح مردانہ ڈھٹائی کی لازوال قوت کا اثاثہ میرے پاس نہ ہوتا تو کبھی کا منہ لپیٹ کر اک طرف کو پڑ رہتا۔ اِس خرابی میں بھی مگر اچھائی کا ایک پہلو پھر بھی ہے اور وہ یہ کہ پھر یہ بھی ہے کہ جیسے سیانے کہتے ہیں نا کہ ''قدر کھو دیتا ہے، روز کا آنا جانا'' تو اسی طرح ''اثر کھو دیتا ہے روز کا طنز اور طعنہ'' اور رفتہ رفتہ زندگی ایک ''مضطرب امن'' کی عادی ہو جاتی ہے۔ یہ بات نہیں کہ میں نے خود کو ڈھب پہ لانے کی کوئی کوشش نہیں کی، ابھی خریداری کی ضمن میں اپنی بے پایاں مشقت کا تو ذکر کر ہی چکا ہوں، تاہم یہ ذرا بھی کافی نہیں کیونکہ میرے گھریلو کولمبس نے میرے اندر نقائص کے دفینوں سے پرنجانے کتنے ہی جزائر دریافت کرلیئے ہیں اور یہ کھوج پیہم جاری و ساری ہے۔ اِس کھوج کا مرکزی خیال یہ عقیدہ ہے کہ شوہر ایک ایسی مخلوق ہے جو صرف برا کرنے اور برا سوچنے ہی پہ قادر ہے تاہم زوجہ کا باپ اور بھائی قطعی نایاب کے درجے میں ہیں اور مستثنیات میں داخل ہیں۔

یہ شوہرانہ مسئلہ بھی بڑا مشترکہ سا اور آفاقی نوعیت کا ہے کہ گھر سے باہر تیس مارخان کہلانے والے اپنی زوجہ کے لیئے محض چڑی مار کا ہی سا مقام رکھتے ہیں۔۔۔ خود ہمارے واقف ایک بڑے محترم و بنگ عالی جناب کا گھریلو رتبہ ''موئے نگوڑ مارے'' سے زیادہ نہیں۔ اُنہیں دیکھ کر ایک پیر صاحب کا حوالہ یاد آتا ہے کہ ایک دنیا اُن کی کرامتوں اور فضائل کی معترف تھی لیکن اُن کی بیگم اُن کا مذاق ہی اڑاتی رہتی تھیں۔۔۔ تنگ آکر انہوں نے بڑی مشقت سے ہوا میں اڑنے کا خطرناک عمل سیکھا اور پھر ایک دن فضا میں بلند ہو کر خوب اڑتے پھرے اور طے شدہ منصوبے کے تحت اپنے مکان کے ارد گرد کافی بلندی سے فضاء میں خوب چکر لگائے۔۔۔ بیگم کو صحن میں کھڑا دیکھا اور اس نظارے پہ حیران ہوتے ہوئے پایا تو باچھیں کھل گئیں۔ ذرا دیر بعد کہیں جا کر اترے اور کشاں کشاں گھر آئے۔۔۔ گھر میں داخل ہوتے ہی بیگم نے آڑے ہاتھوں لیا ''تم کہاں کے پیر بنے پھرتے ہو، صاحب کرامت تو ایسے ہوتے ہیں کہ جیسے وہ پیر صاحب ہیں کہ جنہوں نے آج فضا میں جہاز کی مانند اڑ کر دکھایا اور یہ منظر میں نے خود دیکھا تھا۔ کافی اونچائی پہ اڑ رہے تھے وہ۔۔۔"

اس پہ تو پیر صاحب بیحد مسرور ہوئے اور ایک احساس فتحمندی کے ساتھ بیگم کو اطلاع دی کہ ''وہ پیر میں ہی تو تھا۔''

اس پہ بیگم نے کسی قدر بیزاری کے ساتھ فرمایا کہ ''اچھا وہ آپ تھے۔۔۔ جبھی تو میں کہوں کہ اس قدر ترچھے کیوں اڑ رہے تھے!''

دنیائے خاوندیت کا ہر باسی شادی کے پہلے چند برسوں میں اپنے طور پہ اس خوش فہمی میں مبتلا نظر آتا ہے کہ گھر چلانے کے لیئے بیگم کو ساری تنخواہ دینے، اور بچوں کی پیدائش میں ''ناگزیر'' مدد فراہم کرنے کی وجہ سے وہ اپنے گھریلو نظام شمسی کا گویا ایک سورج ہے لیکن ایک طویل مشاہدے بلکہ تجربے کے بعد اب مجھے کامل یقین ہے کہ اکثر بیگمات کی کائنات میں شوہر کا کردار دُمدار

ستارے سے زیادہ ہرگز نہیں۔۔۔پھر ڈھلتی عمر کے آتے آتے تو شوہر اور بوسیدہ فرنیچر میں کوئی خاص فرق نہیں رہ جاتا۔ ناکارگی یہ شعر سو بار سنائے جاتی ہے ع

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

اِس روزمرہ حقیقت سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے کہ زیادہ تر شوہروں کا کوئی بھی کام اپنی ہی بیگمات کی نظر میں کوئی خاص وقعت نہیں رکھتا کیونکہ ان کی تنقیدی بصیرت ان کے ہر کام میں وہ وہ عیب ڈھونڈھ نکالتی ہے کہ جو اس معصوم کے حاشیہ گمان میں پیشگی کبھی آ ہی نہیں سکتے تھے ورنہ وہ اتنا برا کام کرنے پہ بھلا مائل ہی کیوں ہوتا، لیکن مسئلہ یہ بھی تو ہے ناں کہ اگر اِن ''برے کاموں'' سے اجتناب کا ہلکا سا ارادہ بھی دلِ خاوند سے ہو گزرے تو نجانے کس طرح وہ ارادہ بیگم کی گرفت سے بچ نہیں پاتا اور طعنے پن سے جڑے ان گنت محاورے اور تشبیہات اور ضرب الامثال اُن کی زبان پہ فی الفور رواں ہو جاتے ہیں۔۔۔اس روانی کا نقطہ عروج ٹیپ کا بند وہ لافانی و بین الاقوامی واویلا ہوتا ہے کہ ''آپ کے ساتھ تو میری قسمت ہی پھوٹ گئی!'' بالائے ستم یہ کہ اس ازدواجی استغاثے میں شوہر کو جوابِ دعویٰ داخل کرنے کا استحقاق بھی میسر نہیں۔

ایک اور سنگین مسئلہ جو بنیادی طور پہ سراسر مشرقی نوعیت کا ہے اور جو شوہروں کے لبوں کو اکثر رومانی گانوں اور برجستہ قہقہوں سے محروم کر دیتا ہے اور مسلسل منہ بسورے رکھنے پہ مجبور رکھتا ہے، وہ ہے شک کا مسئلہ۔ اس کی زد میں سب سے پہلے تو بیگم آپ کی عمر کے آس پاس کی وہ کزنز لاتی ہیں کہ آپ جن کے چکر میں امکانی طور پہ ذرا بھی مبتلا ہو سکتے تھے مگر بوجوہ ایسا کرنے کی ہمت نہ جٹا سکے اور پھر بتدریج اس شک کا دائرہ ہر عمر اور ہر تعلق تک وسیع کر دیا جاتا ہے۔ یہ دائرہ دن دونی رات چوگنی ترقی کے اصول پہ تمام عمر ہی بڑھایا ہی جاتا رہتا ہے اور یوں آپ تا عمر ازدواجی ریمانڈ پہ رہتے ہیں اور تفتیش کبھی مکمل نہیں ہو پاتی جبکہ اس دوران آپ کو بالجبر نہ جانے کتنی ہی نازنینوں کا بھائی صاحب بنا دیا جا چکا ہوتا ہے اور یہاں بھائی جان والی آپشن بھی کسی کو نہیں دی جاتی، (بجز سگی بہنوں کے) کیوں کہ اس خطاب کے آخر میں پھر وہی اذیت ناک ''جان'' براجمان ہے کہ جس سے بیگمات کی جان جاتی ہے، آپ کہیں بھی جائیں اور بیگم کو منزل کی بابت بالکل درست اطلاع فراہم کریں تب بھی اُن کی آنکھوں میں بے یقینی کے قلزم ہلکورے لیتے صاف محسوس کیئے جاسکتے ہیں۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ وہ عورت صرف ایک بیوہ ہی ہوسکتی ہے کہ جسے کامل یقین ہوتا ہے کہ اس وقت اس کا شوہر کہاں ہے تاہم زندہ شوہر اپنی زندگی کا ثبوت فراہم نہ کرتے رہیں، ایسا بھی کم ہی ہوتا ہے۔

ازدواجی معاملات میں ایک پہلو مگر ایسا ہے جس سے میں بہت حیران رہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میرے دیگر ''شوہر بھائی'' بھی اس ہی قسم کی حیرانی سے دوچار رہتے ہوں گے کہ ان کی بیگمات کی طرح میری بیوی بھی میرے اکثر خیالات پڑھ سکنے کی بلا کی صلاحیت رکھتی ہے اور کئی بار مجھے میری سوچ کا کھویا ہوا سرا بھی پکڑا دیتی ہے۔ میری بہت سی ایسی باتیں اس پہ کھلی ہوئی ہوتی ہیں کہ جنہیں چھپائے رکھنا میرے لیئے بہت اہم ہوتا ہے۔ ایک یہی نہیں، اکثر بیگمات کا تو دعویٰ بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے شوہروں کو خوب اچھی طرح سمجھتی ہیں تاہم ان کے سامنے یہ فقرہ بھی اُن کے لبوں پہ کبھی کبھار آ ہی جاتا ہے کہ ''میں آپکو ابھی تک سمجھ ہی نہیں سکی۔''

مستورات کے اس تضاد میں شوہروں کے لیئے ایک تسلی بخش راحت مستور ہے کیونکہ یہ ان کی اس بے پناہ صلاحیت کا لاچارانہ اعتراف بھی ہے کہ جس کے ذریعے وہ پھر بھی کچھ نہ کچھ اپنی بیگمات سے چھپائے رکھنے میں کامیاب ہی رہتے ہیں اور وہ ایسا کچھ ضرور ہوتا ہے کہ جس کے چھپے ہی رہنے میں ازدواجی مسرتوں کی عافیت ہے۔

سید عارف مصطفیٰ کا تعلق کراچی سے ہے۔ موصوف سیاسی تجزیہ کار اور ایک درد دل رکھنے والے بلاگر ہیں۔ خاصی دبنگ شخصیت کے مالک ہیں اور سچ کہنے اور لکھنے میں کسی قسم کے لحاظ کے قائل نہیں۔ ایک بہت اچھے انشاء پرداز ہیں اور فکاہی انداز بیان کی وجہ سے خاصے مقبول ہیں۔ اُردو کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کی تحریک میں اِن کی مساعیٔ جمیلہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ارمغانِ ابتسام کے لئے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

محمد اشفاق ایاز

عادتیں

کالج میں عبدالرحمان نامی ہمارا ایک ساتھی تھا۔ سیاہ گھنی داڑھی، دراز قد، گم سم، ہر وقت یا تو خلا میں گھورتا رہتا یا پھر زمین پر نظریں گاڑے رکھتا۔ ایک دن وہ کلاس سے باہر لان میں بیٹھا آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں چپ چاپ اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے قریب ہے۔ اس نے نظریں نیچے کیں تو مجھے بیٹھے پایا۔ اس کی یہ بھی عادت تھی کہ پہلے خود سوال نہیں کیا کرتا تھا۔ میں نے ایک دفعہ پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ میں نے پوچھا ''حضور آسمان سے تارے توڑ کر لانے کا ارادہ تھا کیا؟''

وہ مزید پریشان ہو گیا۔ اور نظریں نیچے گھاس پر گاڑھ دیں۔

''میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ یہاں زمین کے نیچے خزانہ دفن ہے''۔ میں نے کہا۔

عبدالرحمان کو میری بامحاورہ زبان کی سمجھ آگئی۔ وہ کسی سوال کا جواب دیئے بغیر اُٹھ کر جانے لگا۔ میں اس سے بھی زیادہ تیزی سے اٹھا اور کہا ''نہ تمہیں آسمان پر کوئی تارہ نظر آتا ہے جسے توڑ سکو۔ نہ زمین کے نیچے دفن خزانہ نظر آتا ہے۔ تو پھر یہاں بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کی بجائے دوستوں میں بیٹھا کرو اور گپ شپ لگایا کرو''۔

لیکن اس پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ اس کی عادت تھی۔

عبدالرحمان کی ایک اور عادت تھی۔ جو ہم سب ہم جماعتوں کے لئے بڑی حیران کن تھی۔ وہ عین گرمی کے آخری دنوں میں گرم کپڑے پہننا شروع کرتا اور جہاں کہیں جگہ ملتی آگ جلا کر ہاتھ گرم کرتا۔ جب سردی اپنے اختتام کو ہوتی تو وہ ہلکے کپڑے پہنتا اور کلاس روم میں تنہا ہوتا تو پنکھا چلا کر بیٹھ جاتا۔

کالج میں آخری دن تھے۔ ایک دن میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا ''حضور ابھی گرمی ختم نہیں ہوتی تو آپ آگ تاپنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور سردی ختم نہیں ہوتی کہ آپ پنکھے کے نیچے بیٹھنا شروع کر دیتے ہیں''

تاریخ بتاتی ہے کہ یہ وہ واحد سوال تھا جس کا جواب عبدالرحمان نے کالج کی پوری زندگی میں دیا تھا۔ ''یہ میری عادت ہے۔ میں گرمی کے اختتام پر سردی اور سردی کے آخر میں گرمی کی تیاری شروع کر دیتا ہوں۔'' اُس نے بڑے مدبرانہ انداز میں کہا۔

مجھے یقین واثق ہے کہ اگر وہ کسی ترقی یافتہ ملک میں پیدا ہوا ہوتا جہاں ذہین لوگوں کی قدر کی جاتی ہے تو شاید اس کی مفکرانہ سوچ کے اعتراف میں اسے کسی بڑے اعزاز سے نوازا جاتا۔

تو صاحبو ہر انسان خطا کا نہیں عادتوں کا پتلا نظر آتا ہے۔ ہر خطے، علاقے، ملک، قبیلے، محلے، ذات، برادری کی اپنی اپنی عادتیں ہوتی ہیں۔گھاس خوری (سبزی خوری) سے لے کر گوشت خوری تک، جانوروں سے لے کر آدم خوری تک، سادے پانی سے لے کر اعلیٰ برانڈ کی شراب تک، اور دیسی کپڑوں سے لے کر برانڈڈ کپڑوں تک سفر کرتی ہوئی عادتیں حیثیت اور مرتبے کا تعین کرتی ہیں، بلکہ یہی عادتیں انہیں دوسروں سے منفرد بناتی ہیں۔ آپ کسی شاعر کے ساتھ چند لمحے گزاریں آپ کو اس کے اندر کی عادت کا پتہ لگانے میں دیر نہیں لگے گی۔ یہ ثابت کرنا اس کی عادت بن چکی ہوتی ہے کہ ملک میں اس سے بڑا شاعر نہ ہوا نہ ہو گا۔ کسی نثر نگار، افسانہ نگار، کالم نگار وغیرہ سے دوستی کرنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ اس کی ناپختہ تحریر کو بھی ادب کا شاہکار کہنے کی عادت بنالیں۔ فی زمانہ کامیابی چاہتے ہیں تو سچ بولنے کی عادت سے پرہیز کریں۔ جھوٹ بولنے کی عادت نہیں تو چپ رہنے کی عادت ڈالیں۔

عادتوں کی بھی کوئی قسمیں اور حالتیں ہیں۔ انفرادی طور پر حماقت کریں تو لوگ کہتے ہیں "چھوڑیں جی یہ تو اس کی عادت ہے" اور اگر اجتماعی طور پر ایسی حرکت کریں تو وہ "رسم" کہلاتی ہے۔ جیسا کہ بعض ہندو علاقوں میں عادت ہے کہ وہ مرنے والے کے ساتھ رسم کے طور پر اس کی بیوہ کو بھی جلا کر "خس کم جہاں پاک" کی عمدہ مثال قائم کرتے ہیں۔ جب تک میرے والد محترم زندہ تھے۔ قریبی گاؤں سے ان کے دوست ملنے آیا کرتے تھے۔ اور اکثر اوقات ان سے وہ چیز مانگتے جن کا ہمارے واسطہ کوئی واسطہ یا تعلق ہی نہ ہوتا۔

ایک دن میں نے پوچھا "ابا جی، جب یہ چیز ہمارے پاس ہوتی ہی نہیں تو وہ مانگتے کیوں ہیں؟"

والد محترم بولے "یہ ان کی عادت ہے۔ یہ دو تین دفعہ ہمیں ایسے ہی شرمندہ کریں گے اور پھر وہ چیز مانگ لیں گے جو ہمارے پاس ہے۔ اور ہم انکار نہیں کر سکیں گے!"

مجھے یہ عادت بہت اچھی لگی۔

بعض عادتیں بڑی خوفناک ہوتی ہیں۔ مثلاً مجھے اس کہاوت سے بہت خوف آتا ہے، بلکہ جسم میں جھرجھری آ جاتی ہے کہ "عادتیں سروں کے ساتھ جاتی ہیں"۔ اس کہاوت کو سنتے ہی میرا دھیان افغانی طالبان کی طرف چلا جاتا ہے جو لوگوں کی "کچھ عادتیں" ختم کرنے کے لئے دھڑا دھڑ ان کے سر جسموں سے الگ کئے جا رہے ہیں۔ اور کچھ عادتین بہت میٹھی لگتی ہیں۔ جیسے اگر میں اپنے سسرالیوں کی کسی بات کی تعریف کروں تو بیگم انعام میں اپنی مسکراہٹ کا تحفہ عنائت کرتی ہے۔ اور اگر بھولے سے بیگم کے کسی سسرالی رشتہ دار کی تعریف کروں تو فوراً کہتی ہے "تمہیں تو بھونکنے کی عادت ہو چکی ہے"۔

آپ نے گلی محلوں میں چلتے پھرتے پٹھان سیلز مین دیکھے ہوں گے۔ جو من من بھر بوجھ اٹھائے قالین، الیکٹرانکس اور دیگر گھریلو اشیاء فروخت کرتے نظر آتے ہیں۔ آپ ان سے کوئی چیز خریدنے کے لئے قیمت پوچھیں تو ہزاروں میں بتانا ان کی عادت ہے۔ اور پھر وہی چیز چند سو میں بیچ دینا ان کی دوسری عادت ہے۔ اور عوام کی عادت ہے کہ وہ ان کی کسی بات پر اعتبار نہیں کرتے۔

آپ کے گھر بجلی کا سوئچ وغیرہ خراب ہو جائے، نلکے سے پانی آنا بند ہو جائے، کسی ٹونٹی میں مسئلہ ہو۔ آپ الیکٹریشن یا پلمبر کی دکان پر جائیں۔ تو چاہے وہ تین دن سے بیکار بیٹھا ہو۔ آپ کے ساتھ فوری طور پر جانے کو تیار نہیں ہوگا۔ یہ ان کی عادت ہے۔ "بس تھوڑی دیر میں پہنچا" کہہ کر آپ کو فارغ کر دے گا۔ اور اس کے انتظار میں گھر کو الرٹ رکھنا آپ کی عادت بن جاتی ہے۔

سرکاری دفاتر میں کام کرنے والے افسران اور ماتحتان کی اپنی اپنی عادتیں ہوتی ہیں۔ جن کا سراغ لگانا بعض "کھوجی" قسم کے لوگوں کی عادت بن جاتی ہے۔ پھر یہی لوگ عوام اور سرکاری افسران کے درمیان رابطے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ عوام بھی خوش اور افسران بھی شاد و آباد۔

ہمارے ایک افسر تھے۔ وہ جب بھی کسی دوسرے دفتر پہلی دفعہ جاتے تو وہاں کسی نہ کسی اہلکار سے خوامخواہ جھگڑ پڑتے۔ بعد

میں بڑے فخر سے اس کی توجیح پیش کرتے ''تعارف پکا کرنے کے یہ ضروری ہوتا ہے۔اب جب بھی میں یہاں آؤں گا یہ فوراً پہچان لیا کریں گے۔''

اس نرالی منطق کی وجہ سے میں ان کے ساتھ کہیں بھی جانے سے کنی کترا جاتا تھا۔مبادا ان کی لڑائی کا ملبہ مجھ مسکین پر نہ آن گرے۔

ہمارے ایک اور افسر تھے۔جن کے متعلق مشہور تھا کہ بیگم پر ان کا بڑا رعب ہے۔کیا مجال کہ بیگم ان کے سامنے اونچا بول جائے یا ان کے کسی حکم کی سرتابی کرے۔ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔جو تھوڑا سا معذور تھا۔بیگم جب بھی پر پرزے نکالنے کی کوشش کرتی وہ یہ کہہ کر اس کی جھاگ بٹھا دیتے ''چل چل دیکھ لیا تجھے۔ایک ہی بچہ جنا ہے اور وہ بھی ٹیڑھا میڑھا''۔اور یوں وہ بیچاری چپکی بیٹھ رہتی۔یہ ان دونوں کی عادت بن چکی تھی۔

دفتر میں میرے ایک ساتھی کی عادت تھی۔کہ رمضان المبارک میں وہ گھر سے بچوں کے ساتھ روزہ رکھ کر دفتر تشریف لاتے۔دوپہر ہوتی تو نزدیکی ہسپتال کی کینٹین سے کھانا کھا کر اور دو تین سگریٹ پھونک کر آتے۔گھر جاتے ہوئے اپنی شکل اور چال ایسی بنا لیتے گویا روزے سے ان کی جان نکلی جا رہی ہو۔بچے اپنے اباجی کی دینداری کو مثال سمجھتے۔اور ان کی عادت پر بھی نظر ڈالئے۔یہ میرے دوست شاہد ہیں۔ان کی بیگم سکول ٹیچر ہیں۔انہوں نے شاہد صاحب سے سگریٹ نہ پینے کا حلف لے رکھا ہے۔مگر شاہد صاحب بھی اپنی عادت سے مجبور ہیں۔انہوں نے دفتر میں اپنی میز کی دراز میں الائچی، سونف اور ماؤتھ واش کا بندوبست کر رکھا ہے۔سگریٹ پینے کے بعد الائچی یا تھوڑی سی سونف پھانک لیتے ہیں۔اور گھر جانے سے پہلے ماؤتھ واش سے اپنی سانسوں کو مہکانا ان کی عادت بن چکی ہے۔اگر بیگم کو ان کے جسم کے کسی کونے سے سگریٹ کی بو آ جائے تو فوراً بولیں گے'' راستے میں رش بہت ہوتا ہے گاڑیوں کا دھواں تو کپڑوں کے ساتھ چپک جاتا ہے۔یہ گاڑیوں کا دھواں ہے جسے تم سگریٹ کا دھواں سمجھ رہی ہو''۔کیسا فلسفہ ہے۔اور بعض خواتین جانتے بوجھتے شوہروں کی ہر غلطی کو برداشت کرنا اپنی عادت بنا لیتی ہیں۔اور یہی عادت ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی کی علامت بن جاتی ہے۔

آپ کو روزانہ اخبارات میں کچھ خون کھولانے والی خبروں کے ساتھ کچھ عادتاً دل لگی کی خبروں سے بھی واسطہ پڑتا ہوگا۔حکومت کسی عام استعمال کی چیز کی قیمت بڑھا دیتی ہے۔اور ہمارے لیڈر عادتاً بیان داغتے ہیں'' قیمتوں میں اضافہ برداشت نہیں کیا جائے گا!'' ان کی برداشت کو پرکھنے کے لئے کچھ عرصہ بعد حکومت پھر اضافہ کر دیتی ہے۔یہ اضافے اور عدم برداشتی بیانات ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔''وہ بھی نہ ہارے میں بھی نہ ہارا'' پھر عوام کو ان دونوں کا تماشا دیکھنے کی عادت ہو جاتی ہے۔'' جائیں تو جائیں کہاں۔''

انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں کی بھی عادتیں ہوتی ہیں۔دلہن کی طرح بھینسیں بھی جس کھونٹے پر کچھ عرصہ گزارتی ہیں تو وہ اسے یاد رکھتی ہیں۔زندگی میں پھر کبھی ادھر سے گزر ہو تو وہ ایک نظر ادھر ضرور ڈالتی ہیں جہاں کچھ عرصہ قبل وہ چارہ کھایا کرتی تھیں۔ہمارے محلے کے شیدے کمہار کے گدھے سارا دن مار کھاتے اور سڑکوں پر مشقت کرتے گزار کر شام کو واپس لوٹتے ہیں تو سیدھا گھر کا رخ کرتے ہیں اور سارے دن کی مار بھول کر'' کھانا تناول فرمانے'' اور آرام کرنے لگ جاتے ہیں۔یہ ان کی اچھی عادت ہے جو بہت کم انسانوں میں نظر آتی ہے۔

انسان کو جہاں سے ایک دفعہ پھینٹی لگے وہ مہینوں اس شہر، محلے یا گلی سے نہیں گزرتا۔یہی نہیں بلکہ پھینٹی لگانے والے سے انتقام لینے کی ترکیبیں سوچتا رہتا ہے۔مگر شاباش ہے ان گدھوں کی عادت پر جو ہر صبح گزشتہ کل کی مار بھول کر، نئی مار نئی مشقت کے لئے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

محمد اشفاق ایاز کا تعلق جلالپور جٹاں (گجرات) سے ہے۔اُردو اور پنجابی میں لکھتے ہیں۔سنجیدہ نثر نگاری کا سفر پاکستان کے مختلف جرائد و اخبارات سے ہوتا ہوا ماہنامہ ''چاند'' اور ''زیر لب'' میں مزاحیہ نثر نگاری تک جا پہنچا۔انگریزی تحریروں کو اُردو میں بھی منتقل کیا۔افسانے بھی تخلیق کئے۔موڈ اچھا ہو تو شاعری میں بھی لفظ جوڑ لیتے ہیں۔ویب سائٹ vojpj.com کے ایڈیٹر ہیں۔

کائنات بشیر

جرمن بس

کیا نظارے ہیں۔۔۔
کیسے لوگ ہیں۔۔کیسے دیار ہیں۔
آج کا موسم کیا ہے۔ ہوائیں کتنی مست ہیں۔ سورج کی آب وتاب کتنی ہے یہ جاننے کے لیے گھر سے نکلنا ضروری ہے۔ پہلا قدم اٹھانا مشکل پھر آگے چین ہی چین۔۔اب نکل آئے ہیں تو چلیے لپک کر جرمن بس میں بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ سامنے ہی تو ہے، تین منٹ کے فاصلے پر بس سٹاپ۔۔۔ڈاکٹروں کی آماجگاہ کا تو کندھا لگتا ہے اس روڈ پر جس پہ جرمن بس کبھی اٹھلا کے چلتی ہے کبھی بل کھا کے چلتی ہے۔

اور ہاں، جرمنی میں بَس کو بُس کہا جاتا ہے۔ سو ہم بھی اِسے جرمن بُس ہی کہیں گے۔

انگلینڈ میں ہم نے جتنی ڈبل ڈیکر بسیں دیکھیں اتنا ہی وہ جرمنی میں ناپید نکلیں۔ ممکن ہے بڑے بڑے شہروں میں یہ عجوبہ نظر آتا ہو لیکن عموی سنگل بس ہی نظر آئے گی۔ اور اگر کسی بس پر ہمیں ڈبل ڈیکر ہونے کا گمان بھی ہوا تو وہ۔۔۔رائزے بُس (ہالیڈے پر لے جانے والی بس) نکلی۔ جس کے نچلے حصے میں سامان رکھا جاتا ہے اور اوپری حصے میں مسافروں کے لیے سیٹیں بنی ہیں۔ اس لیے وہ خالص ڈبل ڈیکر والی بات نہیں بنی۔ وہ ڈیڑھ بُس لگتی ہے۔ جرمنوں کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے نازے بڑے ہوخ ہیں (ان کی ناک بہت اونچی ہے) لیکن واللہ، کئی معاملات میں ہم نے اُنھیں بڑے اعتدال میں دیکھا، نہ تو اُنھوں نے ہر شہر میں بڑی بڑی بلڈنگیں بنائیں (ماسوائے بڑے اور گنجان شہروں کے) اور نہ ہی بس پہ بس چڑھائی۔ ان کے پاؤں زمین پر ہی رہے۔ اونچائی کی بجائے ان کا زور لمبائی پہ رہا۔ سو انھوں نے بُس کے پیچھے دوسری بُس ضرور لگا لی لیکن اور وہ بھی خال خال۔ اس لیے ایک ٹکٹ میں دو کا مزہ تو نہیں آیا، ڈیڑھ کا ضرور آ گیا کہ ڈرائیور کے پاس والی سیٹوں پہ بیٹھنا ہے یا اس سے دور جا کر بس کے پچھلے حصے میں براجمان ہونا ہے۔ عام بس کے دو دروازے ہیں اور لمبی بس کے تین۔۔۔ پہلے ہر سٹاپ پر ڈرائیور کے ایک اشارے پر تینوں دروازے چشم ما روشن کی طرح کھل جاتے تھے اور کچھ لوگ اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بغیر ٹکٹ سفر کر کے اپنا دل پشوری کر لیا لیتے تھے، پر جرمن بس کمپنی نے یہ سبق بھی پڑھ لیا۔ سو اب پچھلے دروازے اپنا باز ونہیں پھیلاتے۔ اب ہر صورت ڈرائیور کو اپنا رُخ روشن دکھا کر ہی چڑھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس میں کنڈیکٹر نام کی کوئی صورت نظر نہیں آتی جبکہ جرمن ٹرین میں ٹکٹ چیکر کے نام پہ کنڈیکٹر دندناتا پھرتا ہے (دہائی ہے

سکھ گھڑی

ایک پاکستانی امریکن دوست نے عید کے موقع پر گھڑی تحفے میں بھیجی ہے۔ آج کے ڈیجیٹل دور میں تاریخی نوعیت کی گھڑی ہے۔ ڈائل کو دیکھتا ہوں تو تین سوئیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک سوئی تو مسلسل حرکت میں ہے۔ باقی کی دوسوئیاں اگرچہ غور سے دیکھنے پر بھی حرکت کرتی ہوئی محسوس نہیں ہوتیں مگر ایک جگہ ٹھہرتی بھی نہیں۔ ایک چکر ختم ہوتا ہے تو دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ اندازہ نہیں ہوسکا کہ چکر شروع کہاں سے ہوتا ہے اور ختم کہاں پر، ہاں البتہ ایک بات جو سب سے زیادہ عجیب بلکہ کسی حد تک پریشان کُن بھی لگی وہ یہ ہے کہ گھڑی بارہ پہلے بجاتی ہے اور ایک بعد میں۔

اعظم نصر

دہائی) اس لمبی بس میں ہمیں ایک ہی قباحت نظر آئی کہ کئی بار ڈرائیور بس کا پچھلا دروازہ کھولنا بھول جاتا ہے۔ عادت کے مطابق اگلے حصے کا ڈور کھول دیتا ہے۔ اس پر اُس مسافر کو گلا پھاڑ کر ڈرائیور کو مخاطب کر کے بتانا اور جتانا پڑتا ہے کہ ''محترم ڈرائیور صاحب، ذرا پچھلا دروازہ تو کھولیے گا (اگلا بے شک بند کر لیجئے)'' تب ڈرائیور مسکراتے ہوئے کھول دیتا ہے۔ لیکن اس صورتحال پہ کئی بابے، بابیاں ناراض ہو جاتے ہیں۔ اُنہیں لگتا ہے کہ ڈرائیور نے پچھلا دروازہ نہ کھول کر ان کی عزت و توقیر میں کمی کی ہے۔ اُنہیں شکوہ ہے کہ ویسے تو وہ مہربان اپنے سامنے لگے شیشے میں پوری بس میں آگے سے پیچھے تک مسافروں کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھانکتا رہتا ہے، ان کے اطوار پہ نظر رکھتا ہے۔ مسکراہٹ بھی دیتا ہے پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اُنہیں کھڑا دیکھ کر بھی پچھلا دروازہ کھولنا بھول جائے۔ سو وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنی چھڑی ٹیکتے ہوئے بس سے اترتے ہیں۔

لوگ جتنا کاروں میں اپنی گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں۔ اسی طرح بس میں بھی سفر کرتے ہیں۔ یہ ہے جدید اور ترقی پذیر معاشرہ، جہاں بس میں سفر کرنے والے کی قدر و منزلت کا گراف قطعاً نیچے نہیں آتا۔ اُنہیں بس سے اتر کر کسی سوال و جواب اور جواب دہی سے نہیں گزرنا پڑتا۔ نہ کسی شناسا سے منہ چھپانا پڑتا ہے نہ ہی یہاں میزبان پوچھتے ہیں کہ اپنی گاڑی پہ آئے ہو یا بس میں۔۔؟ (ان کی بلا سے۔۔ جس پہ مرضی آئے ہو، چاہے شتر مرغ پہ بیٹھ کر آ جاؤ۔ بس وقت پہ آنا اہم ہے، روٹی ٹھنڈی نہ ہو جائے) اور نہ ہی یہاں لوگوں کو ٹیکسی، کیب کی عادت ہے۔ وہ مہنگی ہے تو امیر غریب سب کے لیے ایک برابر (یہاں ٹیکسی مریضوں کو ڈھوتی اور مسافروں کو ڈھونڈتی نظر آتی ہے۔ ریلوے سٹیشن کے آس پاس باجماعت لائن میں کھڑی نظر آتی ہے)

سردیوں میں جب ہر طرف برف کی سفید چادر بچھ جاتی ہے تو بہت سے لوگ اپنی گاڑیوں کو گیراج میں محفوظ رکھتے ہیں اور کچھ خاص برف باری کے مہینوں کے لیے بس کے مسافر بن کر اپنی عقلمندی پہ خود کو داد دیتے ہیں۔۔ سردی اور برفباری میں گاڑی چلانا واقعی مشکل ہے۔ برف باری ہورہی ہو تو اتنی زحمت نہیں لیکن جب وہی برف پگھلنے کی بجائے تہہ در تہہ برف جمتی جائے اوپر سے سورج کی کرنیں پڑیں تو یہی برف ایک آئینے جیسی شکل اختیار کر لیتی ہے۔۔ چلیئے، آئینہ بھی منظور لیکن پھسلنے والا ہڈی توڑ، انہیں نہیں ہرگز نہیں۔ جس پر بندہ پھسل کر اوندھے منہ جا گرے تو ناک کی خیر نہیں اور پھسل کر پیچھے کو گرے تو چاروں شانے چت۔۔۔! بازو، کندھے، گردن اور کمر پہ کہیں بھی میڈیکل بیلٹ لگ سکتی ہے، اسی لیے لوگ جیسے تیسے بس سٹاپ تک پہنچ کر بس میں سوار ہو کر بے فکرے ہو جاتے ہیں کہ اب ڈرائیور جانے اور اس کی مہارت۔ بس اُنہیں اڑن طشتری اور ڈرائیور اُنہیں کوئی مافوق الفطرت انسان نظر آتا ہے جو ان ساری مشکلوں سے اُنہیں بخوبی گزار کر لے جائے گا۔

جرمن میں بسوں کی کافی بہتات ہے۔ جو ہر شہر، ہر علاقے میں اس طرح دندناتی پھرتی ہیں۔ جیسے کبھی پاکستان میں قدم قدم پہ تانگہ گھوڑا اور رکشہ کی فراوانی رہی۔ یہاں ہر پندرہ منٹ کے بعد سڑک کے کسی نہ کسی کونے سے اپنے نام کی پہچان لگائے نمودار۔ اس کی پہچان اس کے ماتھے پہ لکھے نمبر پہ ہے۔ سو مسافروں کے لیے نمبر یاد رکھنا زیادہ ضروری ہے جو وہ باآسانی یاد رکھتے ہیں۔ اس

لیے لوگ جرمن بس میں خوش ہو کر اور اطمینان سے سفر کرتے ہیں۔ البتہ ایک بات سے شاکی رہتے ہیں۔ پیڑول کی طرح ہر سال بڑھتے بس کے کرائے سے۔۔۔ خیر اب اس کا بھی ٹوٹکہ دریافت ہوگیا ہے۔ اب بس کے ماہانہ اور سالانہ کارڈ فراوانی سے ملنے لگے ہیں جس سے کچھ نہ کچھ تو بچت ہاتھ آ جاتی ہے۔ یوں بس کے مسافروں کی تعداد بڑھی ہے، کم ہرگز نہیں ہوئی۔

جرمن بسیں باہر سے بھی بڑی خوبصورت ہیں۔ گو پاکستان کی بسوں اور ٹرکوں کی طرح خود کو رنگ و بو میں نہیں ڈبوتیں، نہ اس میں موسیقی کی تانیں گونجتی ہیں (ڈرائیور کبھی کبھی ریڈیو سن سکتا ہے وہ بھی خبروں کی حد تک۔۔۔) لیکن ماڈلنگ کرتی ضرور نظر آتی ہیں۔ بس کے درو دیوار کسی خاص آئیٹم کا نظارہ دیتے نظر آتے ہیں۔ کسی بڑے سٹور، بنک، بس کارڈ کے اشتہارات۔۔۔ جن کے جلو میں خوبصورت لڑکی، مرد کو ماڈلنگ کا موقع دیا جاتا ہے۔ پوسٹر میں اکثر وبیشتر ایک عورت اپنے ہاتھوں میں پھولوں کا خوبصورت گلدستہ لیے، دلکش مسکراہٹ کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اس کی چمکتی آنکھیں دیکھنے والے کو اپنے پہ مرکوز لگتی ہیں۔ کبھی کوئی مرد کسی پروڈکٹ کی رطب للسانی میں ایک آنکھ میچے دیکھنے والوں کو آنکھ مارتا نظر آتا ہے (اب جرمن ہے تو۔۔۔! ورنہ لاحول ولا قوۃ اور استغفراللہ کے کلمات با آواز بلند فراوانی سے سننے کو ملتے) دلچسپ بات یہ ہے پوسٹر ایسے بنائے جاتے ہیں کہ بس پاس سے گزر بھی جائے تو ماڈل کی آنکھوں کا زاویہ حد نظر تک ویسا ہی رہتا ہے۔ سو ہمیں یقین واثق ہے کہ وہ ہمیں ہی آنکھ مارتا چلا جا رہا ہے (توبہ توبہ، خدا کی مار۔۔۔ سر عام اتنا بڑا فلرٹ)

اور وہ ہاتھوں میں پھول پکڑے مالن،
لے لو، لے لو، دو پھول جانی لے لو
یہ ہے گلاب، یہ ہے نرگس، یہ بیلا، یہ چنبیلی

دور تک پھولوں کا گلدستہ ہماری طرف بڑھاتی نظر آتی ہے تو یقیناً یہ پھول ہمارے ہی لیے تھے۔

جھونپڑی کی طرح بنے بس سٹاپ پر بھی اشتہارات کی بھرمار اور اس کی شیلڈیں مسافروں کو متوجہ کرتی رہتی ہیں جو بس کے اندر بیٹھے مسافروں کو تو نظاروں کی سہولت میسر کرتی ہیں (یہاں درو دیوار اور گھروں کی باہری دیواروں پہ اشتہارات چپکانے اور پبلسٹی کرنے کا رواج نہیں۔ لیکن باہر پاس سے گزرتے لوگوں کو بھی انٹرٹین کرتی جاتی ہے البتہ الیکشن ہونے والے ہوں تو دو چار روز کے لیے سیاسی امیدوار کے پوسٹر کسی خاص ستون یا روشنی والے کھمبے پہ لٹکتے نظر آتے ہیں)

ویسے جرمن لوگوں سے جڑنا ہے تو جرمن بس میں سفر کرنا پڑے گا۔۔ کیا بھانت بھانت کے جرمن نظر آئیں گے، لمبے لمبے جرمن۔۔ جن میں آٹے میں نمک کے برابر ملٹی کلچر لوگ بھی مل جائیں گے۔ اور اس سفر سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو ورکنگ آورز صبح آٹھ بجے کے قریب اور شام پانچ بجے سفر نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔ تب جرمن بس ایشیائی ملکوں کی بس جیسا تاثر دیتی نظر

کارِ ضروری

کل رات دو بجے میں اور میرا دوست صحرا میں گھوم رہے تھے کہ اچانک سامنے ایک چڑیل آ گئی۔ میں نے فوراً موبائل نکالا اور اس کی pic بنا لی۔ چڑیل نے مجھے pic بناتے ہوئے دیکھ لیا اور غضب کے عالم میں میری سمت بڑھی اور چنگاڑی "میں تمہارا خون پی جاؤں گی!"

میں نے miss چڑیل سے request کی کہ اپنے ساتھ ایک selfi بنانے دو پھر چاہے خون پی جانا۔

چڑیل بولی "او کے، بنا لو لیکن اس کے بعد میں مجھ پر تمھارا خون پینا فرض ہو جائے گا"

میں نے miss چڑیل کے ساتھ ایک selfi بنائی۔

پھر چڑیل بولی "اب خون پینے سے پہلے کوئی آخری خواہش"

میں نے کہا "جی miss چڑیل! ایک request ہے۔ یہ لیجئے میری Facebook ID اور password۔۔۔ خون پینے کے بعد یہ selfi میرے ID پر post کر کے ساتھ status اپ لوڈ کر دینا کہ "Me اینڈ miss چڑیل۔"

ارسلان بلوچ ارسل

آئے گی اور دوپہر کو بس میں سکول بچوں کی یلغار ہوتی ہے۔بس کا ماحول بچوں کی شرارتوں، ہلچل سے کافی چلبلا ہو جاتا ہے جو ڈرائیور کے صبر کا امتحان لیتے ہیں۔اور بھیا۔۔۔!ایسے میں اس کا غصہ کسی پہ گر سکتا ہے۔

مقامِ شکر ہے کہ جرمن میں، وچن وچن، رکشہ جیسی کوئی آفت نہیں ہے۔۔۔ نہ ہی تانگہ گھوڑا۔۔۔ گھوڑے جرمن صرف رائیڈنگ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔یا ریس کی دوڑ کے لیے۔ اس لیے گھوڑے کا اسٹیٹس اونچا رہتا ہے۔۔البتہ کبھی کبھار کسی خاص مواقع پہ بگھی ضرور نظر آجاتی ہے۔

جرمن ڈرائیور بھی ایک دلچسپ شخصیت ہے۔جس کے سیٹ پر بیٹھنے کے انداز، لوگوں سے رویے، بیوپار پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ جسے بیک وقت ڈرائیور اور کلینر دونوں کا کام انجام دینا پڑتا ہے۔ جرمن ڈرائیور بڑا نازک مزاج ہے۔ جب بھی مزاجِ برہم ہو تو فوراً اسپیکر آن کر کے لگی لپٹی رکھے بغیر مدعا بیان کرنے لگتا ہے۔اس کا نشانہ زیادہ سٹوڈنٹ ہوتے ہیں یا نرسری کے معصوم چوں چوں کرتے بچے، لہذا اس کا مائیک کبھی بھی کھل سکتا ہے۔ ایک بار بس میں شور شرابے پہ مائیک اٹھا کر اس نے بچوں کی بجائے ان کی ایشیائی ماؤں کو بچوں کو سنبھالنے اور خاموشی سے بیٹھنے کا درس دیا (جس پہ ہمارا دل خوب غڑغوں ہوا) لہذا جرمن بس کبھی بھی، کہیں بھی اور کسی بھی علمی درسگاہ اور عالم کا روپ دھارن کر سکتی ہے۔

جرمن بس کا پہناوا ایک جیسا ہو نہ ہو لیکن ڈرائیور حضرات کا آپس میں کافی بھائی چارہ ہے۔ پاس سے گزرتے ہوئے ایک دوسرے کو بڑھ چڑھ کر ہاتھ کے اشارے، ماتھے پہ سیلوٹ کے نشان سے سلام کرتے نظر آتے ہیں۔ایک بار خطرناک موڑ کاٹتے ہوئے بس ڈرائیور نے سینے پہ ہاتھ رکھ کے جھک کر دوسرے ڈرائیور کو کورنش کے انداز میں سلام پیش کیا۔اس بات سے بے نیاز کہ اس کی اس حرکت پر کتنے دل اُچھل اُچھل گئے۔

ویسے گزرتے وقت کے ساتھ جرمن بس نے بہت ترقی کی ہے۔اس کی سیٹیں پہلے سے زیادہ آرام دہ ہو گئی ہیں۔اس کے اندر لگی ڈیجیٹل سکرین بھی اب اگلے آنے والے چار پانچ سٹاپ ظاہر کرنے لگتی ہے۔ یوں مسافر آرام سے پاؤں پسارے بیٹھے رہتے ہیں۔ڈرائیور کا اخلاق بھی وقت کے ساتھ بہتر ہو چلا ہے۔ موڈ اچھا ہو تو ہر نئے مسافر کو خود مسکرا کر ہیلو۔۔۔موئن۔۔۔گڈ ان ٹاک۔۔ کہتا ہے۔لہذا اب وہ دور چلا گیا۔ جب کبھی کبھی ہمیں گمان ہوتا تھا کہ کوئی ڈاکو بس کو مسافروں سمیت اغوا کر کے لیے جا رہا ہے۔بس نے روایتی وردی اتار کر نیا پیرہن اپنا لیا ہے۔اب کوئی بس پارک، گارڈن کا نظارہ دیتی ہے تو کوئی تھیٹر کا۔ کوئی ہالیڈے کا منظر پیش کرتی ہے تو کوئی ڈرائنگ روم کا۔ڈرائیور کو دس پندرہ منٹ آرام کا موقع مل جائے تو فوراً بس سے اس کے نام و نمو کی شیلڈ (نمبر) غائب کر کے کافی کے بھاپ اڑاتے کپ کا منظر سامنے لے آتا ہے۔اور گرم گرم کافی پی کر بس کی اندر کی بتیاں بجھا کر اپنی سیٹ پر نیم دراز ہو کر اپنی کیپ سے چہرا ڈھانپ کر ارد گرد کی دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

جرمن بسیں مقامی چلتی ہیں اور کچھ لمبے روٹ کو اپنا کر دوسرے شہروں سے منسلک ہو جاتی ہیں۔ان کے بیچ ایسی بس بھی چلتی نظر آتی ہے جس کا نام، پیرہن، ساخت سب سے علیحدہ دلکش ہے جسے ہر کوئی حسرت سے تاکتا ہے۔جس کا ڈرائیور خضرِ راہ اور مسافر خوش قسمت انسان نظر آتے ہیں۔ جی ہاں، یہ رائزے یعنی ہالیڈے بس ہے جو لشک لشک کرتی، مٹکتی سب کے دلوں سے ہو کر گزرتی ہے۔ جو دنیا کے جھمیلے چھوڑ کر جانے کس پرستان کی طرف رواں دواں ہے۔

قصہ کوتاہ۔۔۔جرمن میں بس اڈے ریلوے سٹیشن کے عقب میں ہوتے ہیں۔ یوں ٹرین کے مسافر اُترتے ہی بس کے مسافر بن جاتے ہیں۔

کائنات بشیر کا تعلق لاہور سے ہے لیکن گزشتہ کئی سالوں سے جرمنی میں مقیم ہیں۔مضمون نویسی اور شاعری اِن کا میدان ہے۔۲۰۱۳ء میں اِن کی کتاب ''چانداور صحرا'' شائع ہوئی، مزید بہت سی کتابیں اشاعت پذیر ہیں۔اخبارات اور رسائل میں باقاعدگی سے لکھ رہی ہیں۔''ارمغانِ ابتسام'' کی مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

بگلے

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

اُس زرافہ گردن اور عوج بن عنق جتنی قامت والے کلرک کو دیکھ کر نہ جانے کیوں بگلا یاد آنے لگا۔ کمپیوٹر میں آنکھیں گھسائے ''کی بورڈ'' پر بگلا بھگت بنا میری آؤ بھگت بھلا کیسے کرتا جبکہ میں اس انتظار میں رہا کہ کب وہ دریائی گھوڑے جتنا منہ کھول کر روکھے انداز میں مخاطب کر کے کہے گا ''کیا کام ہے؟؟''

مگر ہائے افسوس ایسا کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ جیسے اس کے سامنے جیتا جاگتا انسان نہیں کوئی بھوت کھڑا ہوا اور وہ اسے دیکھ ہی نہ سکتا ہو۔ دریں اثناء میرا ہمراہی فقیرا دفتروں کا مارا میرے پاس آ کر کہنے لگا ''ہوا کام؟؟''

میں نے کدو جتنا سر نفی میں ہلا دیا کیونکہ ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے چوتھے بگلے کے پاس جا جا کر ویسے بھی کدو (ماؤف) ہو گیا تھا۔ فقیرے نے مجھے کھینچنے کے انداز میں ہاتھ سے پکڑ کر باہر نکال لیا اور گویا ہوا ''ارے بدھو۔۔۔مٹھی گرم کر دو!''

''لیکن میرے پاس ماچس نہیں ہے!'' میں نے کچھ سمجھتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''اُف۔۔۔فویار تم نرا بدھو کے بدھو ہے۔۔۔ہو ذرا دانہ پانی ڈال دو۔۔۔چارا پھینکو!!'' فقیرا جھنجھلا گیا۔

''چارا؟ کیا وہ جانور ہے جو چارا ڈال دوں۔۔۔؟؟'' میں نے پھر سادہ لوحی کا بھرم رکھتے ہوئے کہا کیونکہ میرا ان بگلوں ۔۔۔اوہ۔۔۔نہیں۔۔۔بابوؤں سے کبھی پالا ہی نہیں پڑا تھا۔ اب آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ زرافہ عوج بن عنق اور بگلے میں کیا مماثلت ہے جو مضمون کے آغاز میں داغے گئے تھے۔

تو عرض کیے دیتے ہیں کہ لمبا قد کاٹ اور گردن، رکھنے والا وہ بگلا۔۔۔اوہ معاف کیجیے گا بابو ٹکا ٹک ٹکا ٹک کلرک صاحب ہمیں درخور اعتنا اس لیے نہیں سمجھ رہا تھا کہ ہم نے اس کی مٹھی گرم نہیں کی تھی۔ اب فقیرے، میرے ساتھی نے مجھے باہر لے جا کر سمجھا دیا تو سمجھ گئے کہ گھی انگلیاں ٹیڑھی کر کے ہی نکالا جا سکتا ہے، اس لیے جیب سے پانچ سو کا سرسبز نوٹ نکال کر دوبارہ اس بگلے کے پاس جا پہنچا۔ اب آپ لوگ یہ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ اس نگوڑ مارے کلرک کو بار بار بگلا کس خوشی میں کہا جا رہا ہے تو بھائیو! ذرا دھیرج رکھیں، ضروری نہیں کہ ہر بات سیدھے سبھاؤ کی

جائے۔ کچھ گھما پھرا کے آپ کے ذہن کی ورزش بھی ضروری ہے نا، پھر بتائے دیتا ہوں بلکہ اِن شاء اللہ آپ کو از خود پتہ چل جائے گا۔

اب جناب جیسے ہی میں دوبارہ اس حکومتی کل پرزے کے پاس پہنچا تو اِس مخمصے کا شکار ہو گیا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کیسے باندھی جائے۔ اِسی کشمکش میں شائد بگلے صاحب کو بھی اندازہ ہوا کہ چوزہ ہے، ابھی انڈے دینے سے یارا نہیں اس لیے فرمان کا احسان دھرتا ہوا بولا ''کیا بات ہے بھئی؟''

''ب ب ب۔۔۔ بگ۔۔۔ لے۔۔۔'' لفظ ہونٹ تک آتے آتے دم توڑ گیا ''ب ب بھائی یہ پیسے۔۔۔ میں نے سبز باغ دکھا دیا، جس میں قائدِ ملت محوِ نظارہ تھے۔

بگلے نے اِدھر اُدھر اپنی لمبی گردن نہوڑ کر دیکھا کہ مبادہ کہیں ارد گرد کا بگلا تو نہیں تاڑ رہا۔

''اس کا کیا کروں؟'' اُس نے چور لہجے میں کہا۔

''بھائی صاحب لے لیں۔'' میں نے سادگی سے کہا

''اچھا اچھا! بیٹھ جاؤ!!'' وہ سمجھ گیا کہ چوزہ نیلام شدہ عزت کی بے عزتی کا کباڑا کرنے والا ہے۔

اُس نے سر پھر کمپیوٹر میں دے دیا، جس طرح بگلا کبھی کبھی سر اپنی ٹانگوں میں چھپا دیتا ہے۔ اس کے بعد اس نے پھر مدھم آواز میں مجھ سے کہا ''یہ چائے کے لیے شیرو چپڑاسی کو دے دو باہر بیٹھا ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ کام تھرو پراپر چینل Through Proper Channel ہی ہو گا، اس لیے دوبارہ باہر گیا اور نوٹ چپڑاسی کو دے کر کہا کہ صاحب چائے مانگ رہے ہیں۔ چپڑاسی نے بھی کتے کی طرح غپ کے ساتھ نوٹ اچک لیا اور کہا ''ٹھیک ہے تم جاؤ بابو صاحب کے پاس، میں ابھی لایا چائے۔''

اب جو بگلے صاحب کے پاس آئے تو فضا ہی بدلی ہوئی تھی۔ بڑے احترام سے کہا ''لا! کیا کام ہے؟''

میں نے فائل آگے سرکائی اور کہا ''سر۔۔۔ جی پی فنڈ سے کچھ رقم درکار ہے، بچے کا آپریشن کرانا ہے۔ آپ مینول دیں اور ڈی ای او صاحب سے سینکشن sanction دلوا دیں۔''

''جی ہو جائے گا، بے فکر رہو۔۔۔ کل پرسوں تک کے لئے یہ فائل چھوڑ دو۔۔۔ دو دن بعد آ کر مجھ سے لے لینا!'' بگلا اب موڈی ہو رہا تھا۔ میں بھی خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا کہ خیر سے کام done ہے۔ اس لیے ''جی ٹھیک ہے!'' کہہ کر اٹھنے لگا کہ اس نے دھیمے سے انداز میں کہا ''جب بھی کوئی کام ہو سید ھے میرے

تہمد

پینڈو اِسی لئے تو تہمد ہی پہنتا ہے
تہمد میں جو مزا ہے، کب پینٹ میں ملا ہے
جو پہنتا ہے اس کو
یوں ہے سرور میں وہ
تہمد میں جیسے کوئی اے سی لگا ہوا ہے

نوید ظفر کیانی

میڈم گزشتہ چند سالوں سے ایک سنگین بیماری کا شکار تھیں لیکن اس بار دسمبر کے شروع ہوتے ہی انہوں نے فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے۔ ایک سکن سپیشلسٹ سے ٹائم لیا اور پہنچ گئیں۔ ڈاکٹر کو بتایا کہ ان کے ساتھ عجیب سا مسئلہ ہے کہ ویسے تو ان کا رنگ گورا ہے لیکن سردیوں اور خاص طور پر دسمبر، جنوری میں ان کا رنگ کالا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے میڈم کو کچھ سکن ٹیسٹ کروانے کا کہا۔ ٹیسٹ کی رپورٹ دیکھ ڈاکٹر پریشان ہو گیا۔ ڈاکٹر نے میڈم کو بیماری نہیں بتائی اور پرچی پر کچھ دوائیاں تجویز کر کے کہا کہ یہ میڈیکل سٹور سے لے لیں۔ میڈم پریشانی کی حالت میں سٹور پر گئیں۔ سیل مین کو پرچی دی۔ سیل مین نے ایک اچھی کوالٹی کا صابن اُٹھا کے میڈم کو دیتے ہوئے کہا دن میں دو بار اس سے رگڑ رگڑ کے نہانا ہے اور دسمبر جنوری میں تین بار نہانا ہے اور یہ کہ آپ کو ٹھنڈ میں نہ نہانے کی سنگین بیماری ہے۔ میڈم نے کسی مراثی بزرگ سے مشورہ کیا تو بزرگ نے انہیں بتایا کہ دسمبر جنوری میں نہانے سے آپ کو موت بھی پڑ سکتی ہے۔ بس پھر میڈم نے فیصلہ کیا کہ بیمار رہنا مر جانے سے بہتر ہے اور اب بچاری میڈم سنگین بیماری کی حالت میں ہاتھ منہ دھو کے گزارہ کر رہی ہیں۔

ارسلان بلوچ ارسل

پاس لے آنا۔ اب چائے آ رہی ہے وہ پی کر جانا۔"

میرا ذہنی تناؤ چونکہ یکسر ختم ہو گیا تھا، اس لیے اُس وقت تک نہایت اطمینان سے بیٹھا رہا جب تک چائے نہیں آئی تھی۔

دورانِ چائے نوشی وہ مردِ خدا کچھ اور میٹھا ہوا اور بے تکلف ہو کر پھیلتا گیا یعنی پانچ سو کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ میں یہ سوچ کر ہلکان ہوئے جا رہا تھا کہ رب کی پکڑ ہو گی کیونکہ مجبوری ہی سہی، راشی کے ساتھ مرتشی بھی خاشاکِ جہنم بنے گا لیکن مرتا کیا نہ کرتا، جب ایک جائز کام کرنے میں دفتر والے مہینوں چکر لگوا کر بھی ٹال مٹول سے کام لیں گے اور مجھے فرائضِ منصبی کو بار بار متاثر کر کے ان بگلوں کے پاس آنا پڑے گا تو مجبوری ہے کہ کچھ دے دلا کر جلدی نمٹا لیا جائے۔

اِس پہلے تجربے سے اتنا ہوا کہ میں جو اِن بگلے نما کلرکوں کے بارے میں پہلے مفروضے قائم کرتا رہتا تھا، اب حقیقتاً دیکھ کر یقین ہوا کہ دولہا بھائی کیوں ہماری طرف والے دفاتر میں ڈیوٹی نہیں کرتے اور مردان کے باسی ہو کر ملاکنڈ جاتے ہیں۔ یہاں ہم لوگ اسے تنگ کرتے تھے کہ ہمارا کام مفت میں ہو اور وہ اپنے ساتھیوں کی عادت سے واقف ہمیں رشوت دینے کے مشورے سے باز رہتے۔

قصہ مختصر، جس سرکاری ملازم سے پوچھو، وہ ان لوگوں کے بارے میں دو رائے نہیں رکھتا۔ سب کہتے ہیں کہ ہرے سرخ ارغوانی باغ "نوٹ" دکھاؤ اور اپنا اُلو سیدھا کرواور یہ بگلے گردنیں موڑ موڑ کر ٹانگوں کے بیچ رکھ کر رشوت کے جوہڑوں سے مچھلی پکڑتے رہیں، چاہے موت سامنے ہوں یا اینٹی کرپشن والے درپے ہوں، مگر اوپر بھی تو مگرمچھ ہیں، کیونکہ اینٹی کرپشن والے خود کرپٹ ہیں اور ان لوگوں کی میموری کا کرپٹ ہونا بگلوں کی صحت کے لئے بڑا مفید رہتا ہے۔ آ کر یہ سبھی ایک ہی بھٹی کے دانے تو ہیں۔ صرف SAY NO TO CORRUPTION جیسی لاحاصل اشتہار بازی سے کیا بننا ہے جبکہ سب جانتے تو ہیں کہ دفاتر میں ایک تا بارہ سکیل بابو سے لے کر سیکریٹری اور چیئرمین تک سارے بگلے اور مگرمچھ ہیں اور سارا تالاب ہی گندا ہے۔ بس توفیقِ خداوندی سے ہی معاشرے سے اس بدبو کو ختم کیا جا سکتا ہے اور۔۔۔اور۔۔۔اور۔۔۔

اب آتے ہیں عنوان اور کلرک صاحبان کے ساتھ گہرا تعلق جوڑنے کی طرف کیونکہ بہت سے دوست ایسے بھی ہوں گے جو ابھی تک تعلق جوڑ نہ پا سکے ہوں گے۔ تو قارئینِ کرام۔۔۔ تعلق کچھ یوں ہے کہ کچھ تعلق نہیں مگر ایک مماثلت پھر بھی ہے اور یہ کہ جب بگلا ایک ٹانگ اٹھا کر مراقبے میں چلا گیا تو سمجھو کہ مچھلی سطحِ آب پر خود بہ خود نمودار ہو کر پھنسنے والی ہے باقی نتیجہ اخذ کرنا آپ لوگوں کا کام ہے۔

کچھ ایماندار کلرک صاحبان جس کے گھر کا چولہا مہینے کے آغاز سے قرض مانگ مانگ کر جلتا ہے، درجہ بالا تحریر سے مستثنیٰ ہیں کہ یہ لوگ خود دفاتر میں یہ دل جلا دینے والے کھیل تماشے دیکھ دیکھ کر اپنا خون جلاتے ہیں۔

گوہر رحمٰن گہر مردانوی کا تعلق ضلع مردان کی تحصیل تخت بھائی (لوندخوڑ) سے ہے۔ سرکاری ملازم ہیں۔ شاعری اور مضمون نگاری اِن کا میدان ہے۔ مضامین میں لطافت اور طنز کا چھڑکاؤ فقنی فقنی ہوتا ہے۔ "ارمغانِ ابتسام" کے مستقل کرم فرما ہیں۔

ضیاء اللہ محسنؔ

مابدولت

بچپن سے ہی ہم کافی ''سادہ لوح'' واقع ہوئے تھے۔ شاید اسی لیے محلے کے لوگ ہماری ''تعریفیں'' کرتے نہیں تھکتے تھے۔'' آج جناب نے بیر توڑنے کے لیے پتھر مارا تو وہ ساتھ والی آنٹی کے سر پہ جالگا۔آج موصوف نے بشیر چاچا کی بکری کھول کے بھگادی،آج برخوردار پڑوسیوں کی گھنٹی بجا کر بھاگ آئے۔آج صاحبزادے نے فلاں کارنامہ سرانجام دیا'' وغیرہ وغیرہ۔

گویا مابدولت محلے بھر کی رونق ہوا کرتے تھے،یا یوں کہہ لیں کہ بچپن میں ہم'' چھوٹی دنیا'' کے جرنیل تھے۔تمام'' اچھے کام'' جن کی وجہ سے لوگ آج بھی ہمیں یاد رکھے ہوئے ہیں اور ہماری مثالیں دینے پہ مجبور ہیں، ہماری ہی قیادت میں سرانجام پایا کرتے تھے۔اپنی تئیں جن چیزوں کو ہم ''فلاحی کام'' خیال کیا کرتے ،لوگوں کے نزدیک وہ شرارت ہوا کرتی تھی۔مثال کے طور پہ گلی میں لگی بیری سے بیر توڑ کر کھانا تو ہر بچے کا حق ہے،سو اس نیک کام کے لیے ہماری خدمات پیش پیش ہوتیں،اب یہ تو معلوم نہ ہوتا کہ آنٹی صحن میں اپنا سر لیے بیٹھی ہیں۔

اپنی دانست میں ہم محلے کی بھوکی بکری کو صرف اسی وجہ سے آزاد کر دیتے کہ چلو کچھ کھا پی لے گی لیکن وہ کم بخت واپس نہ آئے تو اس میں ہمارا کیا قصور؟ پڑوسیوں کی گھنٹی بجا کے بھاگنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہ ہوتا،بس کبھی کرنٹ کی شدت ہی ہمیں دُم دبا کر بھاگنے پر مجبور کر دیتی۔اب ایسی باتوں کو کوئی شرارت کہتا رہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔

بقول اہل محلّہ کہ ہم بے حد شرارتی تھے،دن بھر چاہے کتنی ہی شرارتیں کر لیں مگر مجال ہے جو کسی کے ہاتھ آئے ہوں۔وہ ضرب المثل تو آپ نے سن رکھی ہوگی کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی ،بکرے کی ماں تو ہم تھے نہیں،مگر پھر بھی گھر واپس آتے ہی ہماری خیر نہ ہوتی۔

ادھر گھر میں ہمارا پہلا قدم رکھنے کی دیر ہوتی،فوراً ہی دھر لیے جاتے،سارے گھر کی کھڑکیاں دروازے بند اور کنڈیاں چڑھا کر تالے لگا دیے جاتے۔یعنی شام کو ہم ایک عظیم مجرم کا روپ دھار چکے ہوتے ۔ ہمارا گھر ایک چھوٹی جیل کا منظر پیش کر رہا ہوتا۔ہماری آمد سے قبل ہی ایک عدد تھانیدار گھر کے صحن میں ٹہل رہا ہوتا،یہ تھانیدار ہمارے بڑے بھائی جان تھے۔

کچھ ہی دیر میں ہی کچہری لگ جاتی۔چونکہ مابدولت گھر میں دبے پاؤں آنے کے عادی تھے۔اس لیے تھانیدار کو اکثر ہماری آمد کا علم نہ ہوتا۔ہمارے گھر پہنچنے سے پہلے ہی محلے کے فریادی

اپنی اپنی ''فریادیں'' سنا چکے ہوتے۔ جیسے ہی تھانیدار کو گھر میں ہماری آمد کا علم ہوتا تو بغیر صفائی کا موقع دیے ہماری دھلائی اور ٹھکائی شروع ہو جاتی۔ یہاں ہمارے ہمت و حوصلے کو داد نہ دینا زیادتی ہوگی، مار کھا کر ہم ذرا بھی چوں چراں نہ کیا کرتے تھے۔

خاطر مدارت کا یہ دورانیہ کبھی تیس سے چالیس منٹ پہ محیط ہوتا تو کبھی کبھار یہ وقت بڑھ کر ایک گھنٹے سے زیادہ بھی ہو جاتا۔ بسا اوقات ہمیں کتنی ہی دیر کے لیے "شاہی سواری" بننا پڑتا اور اسی دوران گھر میں ''جج صاحب'' کی آمد ہوتی۔ جج صاحب کے کرخت لہجے اور سخت طبیعت ہونے کا یہی ثبوت کافی کہ وہ ہمارے ابا جان تھے۔!

اُن کی آمد کے بعد ''مولا بخش'' اور چھتر ول کی گھن گرج ہونا ایک لازمی امر تھا۔ ہماری ''وکیل صفائی'' بے چاری سارا دن گھر کی صفائیاں کرنے کے بعد فرطِ محبت میں جج صاحب کے سامنے ہماری صفائی پیش کر رہی ہوتیں۔ مگر اس ساری کوشش کے باوجود ہماری اچھی خاصی پٹائی لگتی، ہم ذرا سا بھی ادھر اُدھر ہونے کی کوشش کرتے تو ساتھ کھڑے ''سپاہی'' یعنی ہمارے بہن بھائی ہمیں اپنے شکنجے میں کس لیتے، بے چارا وکیل صفائی یعنی ہماری امی جان ہمیں یوں پٹتا دیکھ کے آہیں بھرتی رہ جاتیں۔ خیر اس جوتا پریڈ کے بعد حسبِ معمول آئندہ کوئی جرم نہ کرنے کا عہد لے کر ہمیں چھوڑ دیا جاتا۔ مگر روزانہ کچہری سسٹم لگنا ایک معمول بن چکا تھا۔

''جج صاحب'' چونکہ ہمارے ابا جان تھے نہ کہ ہم اُن کے ابا جان تھے، سو لاکھ بہانوں کے باوجود وہ ہر بات میں ہمیں پھنسا ہی لیا کرتے، کئی بار پٹنے اور مار کھانے کے دوران ہم نے ابا جان کو اس بات کی یاد دہانی بھی کروائی کہ حضور کچھ رحم کی اپیل ہے ،شرارتی سہی لیکن ہیں تو ہم آپ کی اکلوتی اولاد۔۔۔۔مگر مجال ہے جو کہیں سے ٹھنڈی ہوا آئی ہو۔ یہی جواب ملتا کہ ''بیٹا جی! اکلوتے تو ہم بھی تھے۔ مگر اپنے بزرگوں سے مار کھانے کے باوجود ہمیں یہ بات باور کرانے کی چنداں ضرورت پیش نہ آئی تھی۔'' ان کے اس جملے سے ہمیں اور بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا، وجہ کہ مابدولت

ریاضی دان شاعر

کیا ''مساواتِ محبت'' میں ہیں
ہجر کے کربِ مسلسل کے لئے؟
آ کہ ہم تم بھی ''جمع'' ہو جائیں
عمر بھر ''ضربِ مسلسل'' کے لئے

نوید ظفر کیانی

اس خاندانی انتہا پسندی اور مار دھاڑ کا راز منکشف ہونے پہ اور بھی زیادہ کرب میں مبتلا ہو جاتے۔ لیکن سوائے کڑھنے کے ہم اور کچھ کر بھی نہ سکتے تھے۔ خاص طور پر اپنے اوپر گزرنے والے تمام 'مظالم' ہمیں رہ رہ کے یاد آتے، پھر رات کو سونے سے قبل ہم اپنے جسم کو سہلاتے ہوئے شرارتوں سے توبہ کر لیتے، مگر اگلے روز پھر کوئی فریادی ہمارے چوکھٹ پہ آن کھڑا ہوتا، حسبِ معمول پھر وہی ہدیہ تبرک اور وہی خاطر رواضع۔۔۔!!

ہمارے ایک ہی دادا تھے جو بچپن میں پتنگ اُڑانے کے کافی دلدادہ تھے۔ لیکن ہماری پتنگ بازی انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی۔ کام تو فضول سا تھا مگر نہ جانے ابا جان نے کیسے اس کھیل کی ہمیں محدود سی اجازت دے رکھی تھی، کٹی ہوئی پتنگ پکڑنے کے لیے ہمارا گھر

نواب علاء الدین نے غالبؔ سے فرمائش کی کہ ولادت کی تاریخ اور لڑکے کا تاریخی نام نکال دیجئے۔ غالبؔ نے کہا کہ ''میرا کوئی ممدوح زندہ نہیں رہتا۔ نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل بسے، واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے، وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نہ صاحب، دھائی ہے، نہ میں تاریخِ ولادت کہوں گا، نہ تاریخی نام ڈھونڈوں گا۔''

سے باہر جانا منع تھا۔ پورے ہفتے میں صرف چھٹی والے دن ہی یہ شغل فرما سکتے تھے۔

ایک روز ہم پتنگ اُڑا رہے تھے تو ہمارے پاس سے ایک کٹی ہوئی پتنگ گزری۔ ہم نے اپنی اُڑتی ہوئی پتنگ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس جانب توجہ کر لی۔ پھر گلی میں ہم نے ایک نظر جھانک کر دیکھا تو بیسیوں لٹیرے اس پتنگ کے پیچھے بھاگے چلے آ رہے تھے۔ چناں چہ ہم سے رہا نہ گیا۔ کچھ ہی دیر میں ایک لمبی جست ہم پتنگ کی جانب لگا چکے تھے، مگر یہ کیا۔۔۔ جب آٹھ دس سیکنڈ بعد ہمارے پاؤں زمین پہ نہ لگے تو معلوم ہوا کہ ہم ہوا میں معلق ہو چکے ہیں، پھر کسی کٹی ہوئی پتنگ کی مانند ہم گھومتے جھومتے چھت سے زمین کی جانب آنے لگے۔ یہ خوفناک منظر دیکھ کر ہم نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، ہمارے پاؤں بھاری پڑنے لگے تھے، دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ پھر ایک زوردار جھماکہ ہوا، اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔۔۔!!

جب ہوش آیا تو خود کو ہم نے اسپتال میں محوِ استراحت پایا، تقریباً ایک ماہ تک اپنی چوٹیں سہلاتے رہے۔ اس حادثے کا فائدہ ہمیں یہ ہوا کہ روز روز کی مار پیٹ سے جان چھوٹ گئی، ورنہ اس سے قبل تو یہ حال تھا کہ ہمیں روزانہ ایک مار سہنا پڑتی تھی، اسی حساب سے ہمیں کبھی کیلنڈر کا سہارا لینے کی ضرورت بھی پیش نہ آئی تھی، صرف دیکھنا یہ پڑتا کہ اس مہینے کے آغاز سے اب تک ہمیں کتنی ''پھینٹیاں'' لگ چکی ہیں۔ حساب کتاب کرنے کے بعد جو تعداد نکلتی، تاریخ بھی اس دن وہی ہوا کرتی۔ مثلاً آج بیس تاریخ ہے، تو اس کا مطلب کہ ہمیں مار بھی اس مہینے میں بیس مرتبہ پڑ چکی ہے۔ ایک بار تو کمال ہی ہو گیا، ہم سمجھ رہے تھے کہ آج سترہ تاریخ ہے، مگر حساب کے بعد معلوم ہوا کہ تاریخ تو سولہ ہے، شاید ایک دن میں ہمیں دو مرتبہ مار پڑ گئی تھی۔ گویا ہم ''تاریخ'' بدلنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

بچپن میں مرغی اور ماسٹر صاحب ہماری پسندیدہ ''شخصیات'' ہوا کرتی تھیں۔ وجہ یہ کہ دونوں سے ہمیں انڈہ حاصل ہوتا تھا، ان دونوں میں فرق صرف یہ تھا کہ انڈہ دینے کے بعد مرغی کا پروپیگنڈہ جب کہ ماسٹر صاحب کا ڈنڈہ خوب چلا کرتا۔

اسکول میں حاصل ہونے والے انڈے کے اثرات تا دیر ہمارے جسم پہ دیکھے جا سکتے تھے۔ ایک دن ہم سکول ٹیسٹ سے فارغ ہوئے، ہمارے خیال میں پرچہ بہت اچھا ہوا تھا، مگر ماسٹر صاحب نے جب نمبر لگائے تو آنکھوں کو یقین نہ آیا۔ اتنی زبردست تیاری کے بعد بھی یہ نمبر کسی زمین اور سورج کی طرح گول گول سے تھے۔ حیرانی سے ہم نے ماسٹر صاحب سے پوچھا کہ سر آج بھی صفر۔۔۔؟ جواب میں ماسٹر صاحب اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے ہمیں گھور کے بولے ''بیٹا! کیا کروں۔۔۔ اس سے کم نمبر کسی ریاضی دان نے ایجاد نہیں کیے، مجبوراً یہی دینا پڑے۔''

حسبِ معمول مرغا بنا دیے جاتے۔ مگر آج کبھی یہ بات یاد آئے تو ہم سوچنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ آخر ماسٹر صاحب ہمیں مرغا بنا کر خود مرغی کی طرح انڈے کیوں دیے جاتے تھے۔ ہماری سمجھ میں تو آج تک یہ بات نہ آ سکی۔ آپ کو اس منطق کے بارے کچھ معلوم ہو تو ہمیں ضرور بتائیے گا۔

ضیاء اللہ محسنؔ بچوں کے معروف شاعر اور ادیب ہیں اور ایک عدد کتاب کے مصنف بھی۔ شگفتگی اور طنز و مزاح ان کا خصوصی میدان ہے۔ اُن کی ایک نظم پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی نصابی کتاب میں بھی شامل ہے۔ موصوف کی چند نظموں کے ترکی زبان میں تراجم بھی کیے جا چکے ہیں۔ ''الف نگر میگزین'' کے مدیر ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے خاص کرمفرماؤں میں شامل ہیں۔

مراد علی شاہدؔ

صدر ray پاکستان

جمہوری سیاسی افق پر چودھویں کے مہتاب کی طرح مہینہ بھر میں ایک ہی بار نظر آنے والے اس سیاسی چاند کو صدر پاکستان کہا جاتا ہے۔جبکہ آمرانہ چرخ سیاست پہ ۵۸۔۲ب۔اختیار کے ساتھ ٹمٹمانے والے اس آفتاب کو صدر اعظم (صدر +وزیر اعظم +اختیارات) خیال کیا جاتا ہے۔جو بلاشبہ اختیارات کا خاقان اعظم اور کسی طور بھی سکندر اعظم سے کم نہیں ہوتا۔دورِ جمہور میں عدم اختیارات کے سبب اُنہیں (rubber stamp) ربڑ دستخط کرنے والا ممولہ سمجھا جاتا ہے، جبکہ دورِ آمر میں (جس میں آمر ساحری عامر بن جاتا ہے) میں اختیارات کے باعث صدر کو آئین میں وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو فیصل آباد میں گھنٹہ گھر کو حاصل ہے، جو آٹھ بازاروں کے درمیان ایستادہ ہر آنے جانے والے کا منہ چڑا رہا ہوتا ہے۔ایسے ہی آئین کے ہر صفحہ پر اختیارات کی ''گرز'' اُٹھائے ''مونچھوں'' کو تاؤ دیئے (دو صدور بوجوہ مونچھ مشہور ہوئے) پہلوانوں کی طرح صدر ہی صدر نظر آتا ہے۔اختیارات کے استعمال سے یہی ''ممولہ'' ایکدم سیاسی ''شاہین'' کا روپ دھار لیتا ہے جو چرخ سیاست پہ ''چرغ'' بن ایسے ایسے سیاسی مخالفین کو کنجشک سمجھ کر شکار کرتا ہے کہ شاہین بھی کہیں پہاڑوں کی اونچائی پر کسی خزاں رسیدہ

درخت پہ بیٹھا حساب کتاب لگا رہا ہوتا ہے کہ ایسا پکا نشانہ تو میرا بھی نہیں ہے جتنا کہ حضرت صدر (حضرت پنجابی سمجھا جائے) کا ہے۔ایسی صورت حال میں صدر کے غیض وغضب سے وہی محفوظ رہ سکتا ہے جو صدر کی پناہ گاہ میں آجائے وگرنہ بندہ سیدھا دھر لیا جاتا ہے، درجاتا ہے یا دار پہ چڑھا دیا جاتا ہے۔

عہدۂ صدارت کا فائدہ یہ بھی ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے، اختیارات کے استعمال اور اثاثہ جات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ دو فوائد جیسے جیسے بڑھتے جاتے ہیں مونچھ اور تاؤ کم ہوتا جاتا ہے۔ایک سابق صدر تو اب باقاعدہ ملک کو کلین سویپ کر کے کلین شیو کروانے لگ گئے ہیں کہ شائد مستقبل میں کہیں انہیں وزیر اعظم چن لیا جائے یا اپنے تئیں قصد کئے بیٹھیں ہوں۔صدر ہونے کے لئے چند شرائط وضوابط اور مواقع واختیارات قابل ذکر ہیں۔

☆ تعلیمی قابلیت تھوڑی بھی ہو تو چلے گا بلکہ کم تعلیم یافتہ تو دوڑتا ہے۔ کبھی وزیر اعظم کے پیچھے پیچھے اور کبھی وزراء کے آگے آگے۔ اچھی خاصی دوڑ دھوپ کے بعد کہیں ۲۳/مارچ یا ۱۴/اگست کی تقریبات میں جا کر کہیں وزیر اعظم سے ملاقات بن پاتی ہے۔

☆ صدر بہت کم بولتا ہے۔ وزیر اعظم کے سامنے تو بالکل نہیں، گویا صدر کا کم بولنا سیاسی درازئ عمر کا باعث بھی ہوتا ہے۔

☆ شکل وہیئت میں جوگی، سادھو، مست وملنگ، دھی بڑے فروش اور فالج زدہ بھی چل جاتا ہے۔ سیدھا سادھا دِکھنے والا سادھو مست سا صدر اپنے عہدہ صدارت پر تا دیر چمٹا رہ سکتا ہے۔ کبھی کبھار تو ''اگ لین آئی تے گھر والی بن بیٹھی'' کے مصداق بس موقع ملا اور پھر گیارہ سال سے قبل واپسی ممکن خیال نہیں کی جاتی۔ ایسی صورت حال میں صدر خود نہیں جاتا بلکہ اگر بالفرض مجبوری جانا بھی پڑ جائے تو اُس کی واپسی صرف اور صرف دو طرح سے ممکن ہے:

* استعفیٰ سے۔
* یا سیدھا خدا کے پاس جانے سے۔

☆ جمہوریت میں صدر، وزیر اعظم خوشی میں خوش اور فوج کی ناراضگی میں ناخوش جبکہ آمریت میں صدر کو نہ وزیر اعظم اور نہ ہی فوج کا دبدبہ ڈرا سکتا ہے کیونکہ ایسی صورتحال میں فوج ہی صدر اور صدر ہی فوج یعنی one man army ہوتی ہے۔ صدر کو سال بھر میں دو بار صدر ہاؤس سے نکال کر bath یا اشنان اشوک کرایا جاتا ہے۔

مراد علی شاہد صاحب کی سالگرہ کا دن یکم جنوری ہے۔ انہیں بہت بہت مبارک ہو۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آنے والے دِنوں میں انہیں مزید آسانیوں اور مسرتوں سے نوازے۔

مہنگا کھلونا

پہلی بار جب بیٹے کے لئے کھلونا لے کر آیا، اول اول شوق کہ کھلونا کافی مہنگا تھا مگر بیگم نے کھلونا بیٹے کو دینے کے بجائے الماری کے اوپری خانے میں سنبھال کر رکھ دیا کہ کہیں خراب نہ ہو جائے مگر خراب تو اُسے ہونا ہی تھا۔ بس یہ کہ کھیل کھیل میں خراب ہونے کے بجائے الماری سے گر گر کے خراب ہوا۔ پھر اس کے بعد کبھی بھی سو پچاس سے زیادہ کا کھلونا نہیں خریدا، کم از کم بچے کھیل تو لیا کرتے ہیں۔

اعظم نصر

غسلِ باراں rain bath

غسلِ آفتاب sun bath

موسم گرما میں ۱۴ راگست، آزادی کی تقریبات rain bath کا بہترین موقع اور موسم سرما میں ۲۳ ر مارچ، یوم پاکستان کی تقریبات کو sun bath کا بہترین دن خیال کیا جاتا ہے۔ اِن دنوں میں صدرِ محترم کی خوشی دیدنی ہوتی ہے کہ اس بہانے اُنہیں عوام کا دیدار نصیب ہو جاتا ہے اور اِس بات پہ بھی انبساط کا اظہار فرماتے ہیں کہ آج یقیناً لوگوں کو پتہ چل گیا ہوگا کہ ملک کا صدر کون ہے۔

غیر ملکی دوروں کا سن کر انہیں دورے یعنی fits پڑنے شروع ہو جاتے ہیں، ایک تو دورہ سرکاری اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ مع اہل وعیال۔ ایک بار یہ "سونے پہ سہاگہ" والا محاورہ کسی وزیر کے منہ سے از راہ تفنن کہیں نکل گیا۔ جناب سنجیدگی کے ساتھ سونا لے آنے لگے کہ کافی منافع بخش کاروبار ہے اور اگر دورہ مقدس ہو یعنی عمرہ روانگی تو اہل وعیال کے علاوہ درجۂ چہارم کے ذاتی خدام سے دور صحرائی رشتہ داروں کو بھی لے جانا باعثِ ثواب و مذہبی فریضہ خیال کیا جاتا ہے کہ شب و روز ثواب بٹتا ہے، دونوں ہاتھوں سے لوٹ لو، ویسے ہی جیسے دونوں ہاتھوں سے ملک سے دو دو ہاتھ کر کے سرکاری خزانہ لوٹا جاتا ہے۔

میرے ملک میں "وہیلے" بندے کو صدر بنایا جاتا ہے۔ جو کام کا ہو نہ کاج کا، بس دشمن اناج کا۔ میرے اپنے محلے میں ایک ایسا ہی لڑکا ہے جسے اس کے گھر والے "نواب" اور اہل محلہ سب صدر کہتے ہیں۔ اتفاق سے وہ بھی کوئی کام نہیں کرتا۔ میری یہ مثال اس لئے نہیں کہ کوئی بھی صدر کچھ نہیں کرتے صدر پاکستان کہ تو اتفاق (انڈسٹری) کے زیرِ سایہ بھی کام کرنا پڑتا ہے کہ "اتفاق" کے ساتھ کام کرنے میں ہی موجودہ سیاسی منظر نامہ میں برکت ہے۔ یہ سب اتفاق کی برکت سے ممکن ہے۔ کیونکہ ملک پاکستان میں :اتفاق :اب ایک انڈسٹری کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ لہذا جب تک آپ اتفاق کے ساتھ کام نہیں کریں گے آپ کے حال، وزارت اور کاروبار میں کبھی بھی برکت نہیں پڑنے والی۔ یعنی اتفاق اور برکت کے بنا صدر محض صدر ہی رہتا ہے۔ اور اگر :اتفاق: سے اتفاق کر لے تو صدرِ اعظم بنا دیا جاتا ہے۔

تقریبات کے علاوہ وہ دن یوم انبساط سے کم نہیں جب صدر بذریعۂ میڈیا عوام سے مخاطب ہوتے ہیں اور اگر کوئی دوست احباب جناب کا "دیدارِ خاص" نہ کر سکے تو انہیں واٹس ایپ، فیس بک، ٹویٹر کے ذریعے باقاعدہ سرکاری دھمکی دی جاتی ہے کہ حق دوستی ادا کرنے سے تم قاصر رہے ہو، اگر آئندہ جب کبھی بھی مجھے قوم سے یا مشترکہ پارلیمنٹ سے خطاب کا موقع ملا اور آپ دوست احباب پھر اس غلطی کے مرتکب پائے گئے تو آپ لوگوں کو صدر محترم کی فرینڈ لسٹ سے unfriend کر دیا جائے گا۔ اب حال یہ ہے کہ لوگ جمہوریت اور اپنی بقا کے لئے صدر کی لسٹ سے وزیر اعظم کی "لسٹ نواز" ہو رہے ہیں کہ چل گیا تو تیر ورنہ تکا۔ اگر قبولیت ہوئی تو وارے نیارے ورنہ "میںنوں ہور بھتیرے۔"

مراد علی شاہد صاحب کا بنیادی طور پر تعلق کمالیہ (پاکستان) سے ہے جبکہ سترہ برسوں سے بسلسلۂ روزگار قطر میں مقیم ہیں اور ایک پاکستانی کالج میں بطور صدر شعبۂ پاکستان اسٹڈیز فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ پسندیدہ اصناف افسانہ نگاری اور طنز و مزاح ہے۔ "قندِ شیریں" کے عنوان سے کالم نگاری کرتے ہیں۔ فکاہیانہ و انشائیانہ اندازِ تحریر میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" میں خاصی مستقل مزاجی سے لکھ رہے ہیں۔

من نمی دانم انگلیسی

ساجدہ غلام محمد

وہ محترمہ پٹر پٹر انگریزی بولتی جا رہی تھی اور اس کی 'پٹر پٹر انگریزی' ہمارے سر کے بھی تین فٹ اوپر سے گزرتی جا رہی تھی۔ آخر میاں نے ہماری ہونق بنی شکل دیکھ کے اندازہ لگا لیا کہ ہمیں ککھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا 'پٹر پٹر' ہو رہی ہے تو انہوں نے مترجم کے فرائض انجام دینا شروع کر دیے۔

ہوا کچھ یوں کہ ہم تازہ تازہ مانچسٹر آئے تھے۔ غالباً اپنے لیے گرم کوٹ خریدنا تھا۔ شاپ پہ گئے، جو پسند آیا، وہ ہمارے سائز کا نہیں تھا۔ میاں نے مشورہ دیا،

''وہ سامنے ہی اس شاپ پہ کام کرنے والی لڑکی کھڑی ہے، اس سے پوچھ لو کہ تمہارے ناپ کا کوٹ ان کے پاس ہے یا نہیں۔''

''نہیں، نہیں، آپ پوچھیں۔'' نئی جگہ، نئے لوگ، ہم کاہے کو اس سے بولتے!! خیر میاں جی نے اس سے دریافت کیا اور اس نے میاں کو جواب دینے کی بجائے ڈائریکٹ مجھے بتانے کی کوشش میں 'پٹر پٹر' شروع کر دی۔ پتا چلا کہ ہمارے ناپ کے کوٹ ختم ہو چکے ہیں، اگر ہم اپنا نمبر اس کے پاس چھوڑ دیں تو نیا سٹاک آنے پہ وہ ہمیں فون کر دے گی یا ہم آن لائن خرید لیں۔

وہاں سے واپسی پہ میاں جی نے مشکوک نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

''تم تو کہہ رہی تھی کہ تم نے انگلش میں ماسٹرز کیا ہے۔''

''جی ہاں، کیا ہے ناں." ہم نے گردن اکڑائی۔

''سچ سچ بتاؤ، کیا بھی ہے یا..!" ہم نے صدمہ اور غصہ ملا کے ان کی جانب دیکھا۔

''یعنی کہ آپ کو شک ہے ہماری ماسٹرز کی ڈگری پہ؟؟" یقین مانیں، اتنا صدمہ ہمیں شاید میتھ کے پیپر میں فیل ہونے پہ نہیں ہوتا تھا جتنا ان کی بات سن کے ہوا۔

''بھئی، ناراض نہ ہو. جب سے تم انگلینڈ آئی ہو، میں ہی تمہیں بتاتا ہوں کہ انگلش میں تم سے کیا کہا جا رہا ہے۔ نہ تم سے بولی جاتی ہے، نہ تمہیں کچھ سمجھ آتی ہے. اس لیے میں تو شک میں پڑ گیا ہوں۔''

''بات سنیں ذرا! ہم کالج کے زمانے میں انگلش میں تقاریر کیا کرتے تھے اور جیت کے آتے تھے۔ غلطی یہاں کے لوگوں کی ہے، یہ اتنا منہ ٹیڑھا کر کے انگلش بولتے ہیں کہ سمجھ ہی نہیں آتا یہ بول کیا رہے ہیں۔ ہماری قابلیت پہ شک مت کیجیے آپ۔'' ہم ان سے خفا ہو گئے اور سارا رستہ خفا ہی رہے!

ہم سچ کہہ رہے ہیں لوگو، تعلیمی زمانے میں آپ بیشک انگلش

کے پیپر میں سب سے زیادہ نمبر لیتے ہوں لیکن اگر کسی گورے کی انگلش سنیں گے تو حیرت سے کہیں گے،

''ہیں!! یہ کیا بول رہا ہے؟'' مسئلہ نہ آپ کی قابلیت میں ہے نہ انگلش زبان میں۔ مسئلہ برطانیہ کے لوگوں کے انگلش تلفظ میں ہے جو ہمارے پلے نہیں پڑتا۔ پاکستانی لوگوں کا انگلش تلفظ امریکی لوگوں جیسا صاف ہے۔ ہمیں حیرت ہوئی جب ایک نہیں، تین گورے لوگوں نے ہمیں کہا کہ ہمارا تلفظ امریکیوں جیسا ہے. چلیے، ایک قدرِ مشترک تو نکلی ہم پاکستانیوں اور امریکیوں میں!

شروع کے سالوں ہی کی بات ہے، ہمیں ہاسپٹل جانا تھا، یہاں قانون ہے کہ آپ کا کوئی جاننے والا آپ کا مترجم نہیں بن سکتا، کیونکہ کچھ واقعات ایسے ہوئے تھے جس میں گھر کے کسی فرد نے غلط ترجمہ کر کے فراڈ کر لیا تھا، نہ گورے کو پتا چلا کہ یہ مترجم میری انگلش کا غلط ترجمہ کر رہا ہے، نہ انگلش زبان سے نابلد خاتون کو پتا چلا کہ میرا شوہر مجھے غلط معلومات دے رہا ہے۔ خیر، ہمیں اس زمانے میں انگلش تلفظ کی سمجھ نہیں آتی تھی، اس لیے میاں جی نے ہاسپٹل والوں کو بتا دیا کہ ہمیں مترجم کی ضرورت ہے۔ ہاسپٹل نے بھی مترجم بک کر لیا. اندازہ لگائیں ذرا ہماری شرمندگی کا! ایک انگلش ماسٹرز ہولڈر لڑکی کے لیے مترجم بک کی گئی جو ہمیں بتا سکے کہ ڈاکٹر کیا کہہ رہی ہے! اتفاق دیکھیے کہ آگے سے ڈاکٹر انڈین تھی، یعنی اس کی انگلش کا تلفظ ابھی اتنا 'ٹیڑھا' نہیں ہوا تھا! اس کی سب انگلش ہمیں سمجھ آتی گئی اور ہم جواب دیتے گئے۔ بیچاری مترجم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہی، پھر آخر میں ہنس کے کہنے لگی،

''آپ تو خود اچھی انگلش بول لیتی ہیں، آپ کو مترجم کی کیا ضرورت!'' ہم خوشی سے پھول کے کپا ہو گئے!

کچھ وقت لگا لیکن آہستہ آہستہ ہم اس قابل ہو گئے کہ یہاں کی انگلش سمجھ سکیں. ایک دن میاں نے کہا کہ عید پہ ان کے ایک دوست اپنی زوجہ کے ساتھ عید ملنے آنا چاہتے ہیں۔ ہم نے کہا، ''بسم اللہ، ضرور آئیں۔''

''لیکن ایک مسئلہ ہے، وہ ملائشیا کے رہنے والے ہیں. انہیں اردو نہیں آتی اور تمہیں ملائشیا کی زبان. باتیں کیسے کرو گی؟''

''انگلش تو آتی ہے ناں انہیں؟ اور ہمیں بھی آتی ہے۔ مسئلہ ختم۔'' ہم نے مسکراتے ہوئے حل تو بتا دیا لیکن لوگو! یقین کرو، ہمیں تو پسینہ ہی آ گیا انگلش بولتے بولتے۔ ہوا یہ کہ میاں کے دوست مردانے میں بیٹھ گئے اور ان کی اہلیہ ہمارے پاس آ گئیں۔

چھوٹے سے قد کی، گول مٹول، ہنستی مسکراتی ہوئی، ہمیں اچھی لگیں اور تسلی ہوئی کہ گپ شپ اچھی ہو جائے گی۔ علیک سلیک اور حال چال کے بعد سمجھ ہی نہ آئے کہ کیا بات کریں۔ وہ پاکستان سے ہوتیں تو پھر بھی آسانی ہو جاتی کہ بات سے بات نکل ہی جاتی ہے۔ ہم انہیں بتاتے کہ ہم ملتان کی طرف سے ہیں تو وہ ہم سے سوہن حلوے کی تعریف کرتیں، وہ ہمیں بتاتیں کہ وہ پشاور سے ہیں تو ہم ان سے چپلی کباب کی ترکیب ہی پوچھ لیتے لیکن صد افسوس کہ ہمیں ملائشیا کے بارے میں بس اتنا ہی یاد تھا کہ اس کا دارالحکومت کوالالمپور ہے اور اس وقت ملائشیا کے صدر مہاتیر محمد تھے۔ باتیں کہاں سے ہوتیں۔ اوپر سے ہمارے ذائقے الگ، ملائشین لوگ پینٹ بٹر peanut butter بہت پسند کرتے ہیں، ان کی ہر چیز میں یہ موجود ہوتا ہے، ہمارے لیے بہت محبت سے پینٹ بٹر کے چاول بنا کے لائی تھی جو ان کے سامنے انہیں خوش کرنے کے لیے ایک چمچ تو ہم نے بڑی مشکل سے نگل لیے، باقی نہ کھائے گئے. ہم تو ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے، ''ہور سناؤ۔''

لیکن اللہ کا شکر، اس نے ہماری اور ہماری انگلش کی لاج رکھ لی، مہمان خوشی خوشی رخصت ہوئے۔ میاں نے آ کے پوچھا، ''کیسا رہا؟''

''ٹھیک. انگلش بول بول کے منہ میں درد سا ہو رہا ہے. اتنی انگلش تو ہم نے پوری زندگی میں نہیں بولی تھی جتنی ان دو گھنٹوں میں بولنی پڑی۔''

''تمہاری انگلش انہیں سمجھ آ بھی رہی تھی کہ تکے پہ کام چل رہا تھا؟؟!'' ہنستے ہوئے کہا گیا اور ہم دانت کچکچا کے رہ گئے۔

ہم لوگوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اگر انگلش میں بات کرنی ہو تو بے ساختہ ہمارے منہ سے انگلش نہیں جھڑتی، پہلے ذہن میں اردو جملے کا انگلش میں ترجمہ کرتے ہیں، پھر بولتے ہیں. یعنی 'پہلے سوچو، پھر بولو' پہ پورا پورا عمل کرتے ہیں!!

ایک دفعہ ہم ہسپتال گئے. وہاں ڈاکٹر سے مل کے جب رخصت ہونے لگے تو نرس بولی، ''شکریہ، خدا حافظ۔'' ہم نے خوشگوار حیرت سے اسے سر سے پیر تک دیکھا کہ کہیں سے اپنی دیسی بندی لگے لیکن وہ سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں کے ساتھ پکی انگریز تھی۔ ہماری حیرت بھانپ کے مسکرائی اور بتانے لگی کہ اس ہسپتال میں کام کرنے سے پہلے وہ ایک اور ہسپتال میں کام کرتی تھی جو ایشیائی لوگوں کے علاقے میں تھا. قدرتی طور پہ وہاں ایشیائی مریض ہی زیادہ آتے تھے، ہر روز کا رابطہ تھا اس لیے اسے اردو زبان کے کافی الفاظ آ گئے تھے۔ ہم نے فرمائش کر کے اس سے اردو کے کچھ مزید الفاظ سنے اور ولائتی لہجے میں دیسی الفاظ کا مزا لیتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔

کچھ لوگ حیران ہو کے ہم سے پوچھتے ہیں کہ انگلش میں ماسٹرز کیا ہے اور کہانیاں اردو میں لکھتی ہیں۔ بھئی انگلش زبان میں وہ بے ساختگی کہاں جو اردو زبان میں ہے۔ دو تین دفعہ انگلش میں کہانیاں لکھی تھیں لیکن بالکل بھی مزا نہیں آیا۔

بات کہاں سے چلی تھی اور کہاں پہنچ گئی۔ میاں جی کو ہماری ٹوٹی پھوٹی انگلش سن کے ہماری قابلیت کا کہاں یقین آنا تھا، سو گھر آ کے اپنے سامان والا بیگ کھولا، سارے کپڑے نکال کے بستر پہ رکھے اور بیگ کے سب سے نیچے سے اپنی ڈگری ان کے سامنے لہرائی۔

''یہ دیکھیں اور یقین کریں ہماری تعلیمی قابلیت کا۔''

''ارے تم یہ بھی لائی ہو پاکستان سے؟''

''جی ہاں، تا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے! اب یقین آ گیا ناں؟'' اور انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا. انہیں یقین آنا ہی تھا، ہمیں ناراض کر دیتے تو بستر پہ پڑے کپڑوں کا ڈھیر انہیں جو اٹھانا پڑتا!

واہ، مشہور زمانہ جملہ یاد آ گیا،

''ڈگری ڈگری ہوتی ہے، چاہے اصلی ہو یا جعلی!''

ساجدہ غلام محمد کا تعلق پاکستان سے ہے لیکن کئی برسوں سے انگلستان میں مقیم ہیں۔ کہانیاں لکھنے میں کمال رکھتی ہیں۔ بچوں کے ادب سے لگاؤ ہے۔ اندازِ تحریر نہایت جاندار اور شگفتہ ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کی خصوصی کرم فرما ہیں۔

شوکت جمال

پان کھائیں سیاں ہمارے۔۔۔

اسکول کے زمانے میں کسی جاندار یا بے جان شئے پر مضمون لکھنے کے لیے سب سے پہلے میں یہ تعیّن کرتا تھا کہ بنی نوع انسان کو اس سے کیا کیا فائدے ہیں اور کیا کیا نقصانات۔ مگر جب میں نے پان کے بارے میں کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو اس کا کوئی فائدہ میرے ذہن میں نہیں آیا۔ ہاں، شعراء کو مختلف طریقوں سے پان ''باندھتے'' ضرور پایا۔ مثال کے طور پر میرے ہی یہ دو اشعار ملاحظہ کیجیے ۔

پان، سگرٹ سے ہمیں پرہیز کرنا چاہیے
ہو اگر اُس بزم میں کوئی بڑا بیٹھا ہوا

اور

دشمن کے ہاتھ سے جو کبھی پان کھاؤ ہو
ایسا لگے ہے میرا کلیجا چباؤ ہو

اسی طرح دوسرے شعراء نے بھی پان پر طبع آزمائی کی ہے۔ شیخ ابراہیم ذوقؔ نے فرمایا ۔

چھپا کے پان یہ کس کے لیے بناتے ہو
ہمارے قتل کا بیڑا کہیں اٹھاتے ہو

کسی نامعلوم شاعر کا شعر ہے ۔

پان اُس نے کبھی چبایا تھا
سرخ کلّا ہے تا دہن اب تک

پان کے سلسلے میں نواب مرزا شوقؔ کا یہ شعر بھی مقبول ہے ۔

یاد اپنی تمہیں دلاتے جائیں
پان کل کے لیے لگاتے جائیں

ابن بطوطہ نے دنیا ایسے ہی نہیں گھومی، بلکہ پان تک کے بارے میں تحقیقات کی ہیں۔ معلوم ہوا کہ پان اسی قسم کی ایک بیل میں پھلتا ہے جیسے انگور کی بیل۔ اس بیل میں کوئی پھل نہیں اُگتا اور اسے صرف اس کے پتوں کے لیے کاشت کیا جاتا ہے۔

پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے علاوہ پان انڈونیشیا، میانمار، لاؤس، ویٹنام، فلپائن، تھائی لینڈ، کمبوڈیا اور جنوبی ایشیا کے کئی ملکوں میں پایا اور کھایا جاتا ہے۔ بنگلہ دیش میں تو پان خوری تہذیب کا ایک اہم حصہ ہے۔ مرد اور عورتیں اپنے فارغ اوقات پاندان کے ارد گرد ہی گزارتے ہیں۔ مسلسل سگرٹ پینے والے حضرات کی طرح، مسلسل پان چباتے رہنے کے شوقین بھی اس کرہ ارض پر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

کسی مذہبی کتاب میں لکھا ہے کہ صبح کو دانت صاف کرنے کے بعد، اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھ کر، اور منہ کو خوشبودار کرنے کے لیے ایک پان کھا کر آدمی کو اپنا دن کا کام شروع کرنا چاہیے۔ ایک جگہ پان کے بارے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ یہ منہ کو صاف رکھتا ہے، آواز، زبان اور دانتوں کو طاقت بخشتا ہے اور بیماریوں سے بچاتا ہے۔ یہ نظام ہاضمہ کو بھی درست رکھتا ہے اور خون کو صاف رکھتا ہے۔ بہرحال، موجودہ دور میں پان کے متعلق حکماء کے تاثرات یکسر مختلف ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ پان دانتوں کی بہت سی بیماریوں کی اصل وجہ ہے، اور منہ میں کینسر کی بڑی وجوہات میں سے ایک ہے۔ کینسر پر تحقیق کے عالمی ادارے کے مطابق تمباکو کے ساتھ یا تمباکو کے بغیر پان کھانے سے اور خاص طور پر چھالیہ کی وجہ سے کینسر ہونے کے مواقع دس فیصد تک بڑھ جاتے ہیں۔ پان خود نشہ آور یا تسکین کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ اس میں جو لوازمات شامل کیے جاتے ہیں ان میں سے بیشتر ضرر رساں ہوتے ہیں۔ کراچی یونیورسٹی میں پان کے ۳۶ مختلف نمونوں پر تحقیق کرنے سے جو نتائج سامنے آئے ہیں، وہ کافی ہولناک ہیں۔ پان منہ کے عضلات کو سخت کر دیتا ہے اور زبان کی حالت ایسی ہو جاتی جیسے بے جان ربڑ کا ٹکڑا ہو۔ کینسر کے یہ ابتدائی مراحل ہیں اور پھر اس کا علاج ناممکن ہو جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پان قدیم بھارت میں ہزاروں سال پہلے دریافت ہوا۔ لیکن انسان نے اسے خود چبانے سے پہلے اس کا تجربہ چوہوں پر کیا۔ یہ دیکھا گیا کہ پان کھانے سے چوہوں کا ہاضمہ درست ہو جاتا ہے اور انہیں بھوک کھل کر لگتی ہے۔ مغلیہ دور میں پان کھانے کی روایت کو ملکہ نور جہاں نے مزید وسعت دی۔ بعد میں اُسی دَور کے ایک شہنشاہ شاہجہاں نے تاج محل جیسی عمارت بنوائی جہاں اب پان تھوکنا منع ہے۔ اُس زمانے میں خواتین بناؤ سنگھار کے لیے جڑی بوٹیاں استعمال کرتی تھیں۔ ملکہ نور جہاں نے دریافت کیا کہ پان میں کچھ خاص اجزاء شامل کر کے چبانے سے ہونٹوں پر ایک دلکش سی سرخ رنگت آ جاتی ہے۔ اس لیے پان کا لطف لینے کے علاوہ خواتین اِسے ہونٹ لال کرنے کے لیے بھی کھانے لگیں۔ اب بھی جو خواتین مہنگی لپ

فلپائن اگرچہ ترقی یافتہ ملکوں میں شامل نہیں لیکن وہاں مغربی تہذیب اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ رائج ہے۔ زیادہ دن نہیں گزرے کہ اس ملک میں بھی انگلیوں سے کھانا کھانے کو گنوار پن سے تعبیر کیا جاتا تھا لیکن اب صورت حال مختلف ہے۔ چند جدت طراز ہوٹل مالکان نے اپنے اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں یہ طریقہ متعارف کرانے کا رسک لیا۔ ان کا مقصد تو محض ایک تبدیلی لانا تھا لیکن چونکہ تبدیلی اوپر سے آئی تھی اور بڑے بڑے لوگوں نے (بطور فیشن ہی سہی) اسے اپنا لیا ہے لہٰذا اسے قبول عام کی سند حاصل ہوتی جا رہی ہے اور کثیر تعداد میں لوگ چھری کانٹے سے نجات حاصل کر رہے ہیں۔ یہ خبر مغربی ذرائع ابلاغ سے دنیا میں پھیلی ہے اس لیے لازماً دوسرے ممالک کے لوگ اس کا اثر قبول کریں گے۔

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

کاغذ کے بغیر بہت سے کام رُک جاتے ہیں۔ کاغذ انسان کے فاسد خیالات کا امین ہے۔ کاغذ پر معاہدے لکھے جاتے ہیں، جن کی کوئی پابندی نہیں کرتا۔ کاغذ پر رسیدیں لکھی جاتی ہیں جو عموماً جعلی ہوتی ہیں۔ کاغذ پر حکم لکھا جاتا ہے، جس پر کوئی عمل نہیں کرتا۔ کاغذ پر درخواست لکھی جاتی ہے، جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ کاغذ پر حساب لکھا جاتا ہے جو انکم ٹیکس والوں کو دکھانے کے لئے ہوتا ہے اور جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ کاغذ پر اخبار چھپتے ہیں، جس میں سے بعض غلط اور جانبدار خبروں سے لوگوں کا ذہنی سکون برباد کرتے ہیں اور بعض پریس سے سیدھے ردی فروخت کرنے والوں کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ کاغذ پر رسالے طبع ہوتے ہیں جنھیں ردی فروخت کرنے والے بھی نہیں خریدتے۔ کاغذ پر ہمارا نامۂ اعمال لکھا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ہم پکڑے جاتے ہیں اور سزا پاتے ہیں۔ کاغذ پر پولیس والے اپنا روزنامچہ لکھتے ہیں جس سے قصوروار بچ جاتے ہیں اور بے قصور پکڑے جاتے ہیں۔ کاغذ پر سیاستدان اپنی تقریریں لکھتے ہیں جن میں لفظوں کے وہ معنی نہیں ہوتے جو لغات میں درج ہیں۔

خامہ بگوش از مشفق خواجہ

اسٹک نہیں خرید سکتیں وہ بیچاری پان سے ہی کام چلا لیتی ہیں۔ ویسے بھی پان کی لالی، لپ اسٹک کی سرخی سے زیادہ پائیدار ہوتی ہے۔ ذوقؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

دیکھنا اے ذوقؔ ہونگے آج پھر لاکھوں کے خون
پھر جمایا اس نے لعلِ لب پہ لاکھا پان کا

برِّصغیر میں پان عام طور پر کھانے کے بعد کھایا جاتا ہے اور شادی بیاہ کی تقریبات میں بھی کھانے کے بعد پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ خالص ہندوانہ رسم ہے لیکن مسلم گھرانوں میں کئی دوسری غیر مذہبی رسموں کی طرح یہ رسم بھی ہمارے معاشرے میں دَر آئی ہے۔ کئی جگہ تو کھانے کے علاوہ پان، پوجا اور شادی کی رسوم میں بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ لوگ کسی کے گھر ملنے جاتے ہیں تو تحفے میں پان بھی لے جاتے ہیں۔ پان کھانے والوں کا کہنا ہے کہ پان نہ صرف ہاضمہ درست رکھتا ہے بلکہ ماؤتھ فریشنر کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ ویسے پان خور کی صحبت میں مجھے تو یہ احساس اور شدّت سے ہونے لگتا ہے کہ ؎

میں جب آیا تھا یہاں تازہ ہوا لایا تھا

پان کی تعریف میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دو اشخاص میں گفتگو شروع کرنے کے لیے پان برف پگھلاتا ہے یعنی ice breaker ہے، لیکن یہ بات غیر معقول ہے کیونکہ اگر دونوں حضرات کے منہ میں پان ہوگا تو وہ بولیں گے کیسے؟

پان کی کئی قسمیں ہوتی ہیں مثلاً بنارسی پان، بھوپالی پان، کلکتیہ پان، ڈھاکیہ پان، سادہ پان، میٹھا پان، خوشبودار پان، تمباکو والا پان، قوام والا پان، اسپیشل پان، گنگا جمنا، نورتن، وغیرہ وغیرہ۔ بنے ہوئے پان کو بیڑا، کھلی یا گلوری کہا جاتا ہے۔ خاص موقعوں پر گلوری کو چاندی کے ورق میں بھی لپیٹ دیا جاتا ہے۔ گلوری کا ذکر آیا تو قدیم شاعر خواجہ وزیرؔ یاد آ گئے، جنھوں نے کہا تھا ؎

کیا لگائی ہے گلوری گورے گورے ہاتھ سے
ہو گیا چونے کی صورت پان میں کتھا سفید

یا، جیسا کہ حضرتِ رندؔ فرما گئے ہیں ؎

آنکھیں نیچی کیے شرمائے ہوئے منہ پھیرے
مسکرا کر وہ گلوری کو چبانا تیرا

جب پان کو چبایا جاتا ہے تو اس میں شامل ایک سرخ جز جسے عرفِ عام میں کتھا کہتے ہیں ہمارے منہ کو اندر سے لال سرخ کر دیتا ہے۔ اکثر لوگ پان کو حلق میں نہیں اتارتے، اس طرح ان کے منہ میں ایک سرخ لعاب بھر جاتا ہے جو خود ان کے لیے بھی تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ پان کھا کر اس کے لعاب کو تھوکنے کے لیے مہذّب لوگ اگالدان کا استعمال کرتے تھے۔ اب لوگ اتنا تکلف نہیں کرتے بلکہ اس دَور میں پان کی پیک تھوکنے کے لیے بہت سی سہولیات مہیا کی گئی ہیں جیسے سرکاری دفتروں کے فرش، سیڑھیاں، کھڑکیوں اور دروازوں کے پٹ، سڑکیں، فٹ پاتھ، وغیرہ وغیرہ۔ جہاں لکھا ہو "یہاں پیک تھوکنا منع ہے" وہاں خاص طور پر پیک تھوک کے حساب سے تھوکی جاتی ہے۔ اس

صورتِ حال سے متاثر ہو کر شعورؔ نے کہا۔

بیاں جو کرتے ہیں ہم اُن سے دردِ گوش کا حال

بیاں جو کرتے ہیں ہم اُن سے دردِ گوش کا حال

آپ کے منہ سے سرخ پچکاری جتنی دور جائے گی آپ پان خوری میں اتنے ہی ماہر سمجھے جائیں گے، چنانچہ ؎

وہی فنکار ہیں جو پان کھا کر مار سکتے ہوں

جہاں چاہیں وہیں پر پیک سے پچکاریاں سیدھی

پان کھانے کے رواج نے غیر منقسم ہندوستان میں تقسیم سے چند سال پیشتر بہت عروج پکڑا۔ خاص طور پر لکھنو میں جہاں پان کھانا اور کھلانا وہاں کی تہذیب کا ایک لازمی جزو ہو گیا۔ جس نفاست اور نزاکت سے پان کھایا اور پیش کیا جاتا تھا وہ لاجواب تھا۔ پان بنانے، رکھنے اور پیش کرنے کے روایتی طور و طریقے بھی کافی دلچسپ تھے۔ مہمانوں کو پان پیش کرنے کے لیے چاندی کے چھوٹے بڑے طشت ہوتے تھے۔ پان کے پتے نم آلود نرم کپڑے میں لپیٹ کر رکھے جاتے تھے جسے شال باف کہا جاتا تھا۔ پان اور اس کے لوازمات رکھنے کے لیے خوبصورت اور منقش پاندان استعمال کیے جاتے تھے، جن میں ہر آئیٹم کے لیے علیحدہ خانہ بنا ہوتا تھا اور ہر خانے کے لیے ایک ایک ڈھکنا بھی ہوتا تھا۔ لوگ باگ تیار شدہ پان چاندی کی ایک ڈبیہ میں رکھا کرتے تھے جسے خاص دان کہا جاتا تھا۔ اب تو پان، کاغذ کی پڑیا میں لپیٹ کر ویسے ہی جیب میں رکھ لیتے ہیں یا شلوار کے نیفے یا ساڑی کے گھیر میں کھونس لیتے ہیں چونکہ چاندی کی ڈبیہ موبائل فون کی طرح کسی وقت بھی چھینی جا سکتی ہے۔ پاندان، خواص دان، اُگال دان وغیرہ بھی اب عام طور پر پان کے سلسلے میں استعمال نہیں ہوتے لیکن شاعروں کے ہاں قافیوں کے طور پر ان کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔

پان بنانا بھی ایک ہنر ہے اور اس کا تعلق اس سے بھی ہے کہ آپ پان کس کے ہاتھ سے کھا رہے ہیں۔ ایک ماہر پان فروش ہمارے ہاں پان والا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اکثر لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو گفتگو میں اپنے پان والے کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ پان فروش ہر محلّے کی اہم ضرورت ہے۔ دروغ بر گردنِ راوی، چند پان والے پان کے ساتھ ساتھ کچھ زیرِ زمین کاروبار بھی کرتے ہیں جس کے لیے اُن کو علاقے کی پولیس کا تعاون درکار ہوتا ہے۔ اس کاروبار میں مضرِ صحت اور نشہ آور اشیاء کی فروخت بھی شامل ہے۔ پان کا پتہ ہتھیلی پر جما کر اس میں چونا، کتھا، ڈلی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، زعفران، الائچی، ناریل کا سفوف اور کھانے والے کی خواہش کے مطابق زردہ یا تمباکو کی کوئی قسم ڈال کر اس کو ایک مثلث شکل میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ یہ مثلث کھل نہ جائے اس لیے اس کے بیچ میں ایک لونگ کھونس دیا جاتا ہے۔ لونگ کو عربی میں مسمار کہتے ہیں، مسمار کیل کو بھی کہتے ہیں۔ خواتین کی ناک میں جو کہیں کہیں لونگ لگا نظر آتا ہے اُسے کیل بھی کہا جاتا ہے۔ کیل اور نکیل میں بہت فرق ہے اگرچہ یہ دونوں ناک میں ہی ڈالے جاتے ہیں۔ ویسے آج کل پان والے لونگ سے زیادہ ذکر مسرّت نذیر کے اُس لونگ کا ہوتا ہے جو ایسا ''گواچا'' کہ ابھی تک نہیں ملا۔

پان کھانے کا ایک اور نقصان ہے، وہ ہے مالی نقصان۔ اکثر ایسا ہوا ہوگا کہ آپ نے پان خرید کر بڑے اہتمام سے منہ میں رکھا نہیں کہ آپ کو زوردار ہنسی یا چھینک آ گئی، یا کسی نے آپ سے کوئی پتہ یا وقت پوچھ لیا۔ ایسے میں، پان کو منہ میں hold رکھنے سے زبان کٹ جانے کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ اس کے علاوہ، جن لوگوں کے منہ میں پان ہوتا ہے، وہ لاکھ چاہنے کے باوجود کچھ اور کھا پی نہیں سکتے اور سامنے پڑی نعمتوں کو حسرت سے دیکھتے رہتے ہیں۔ چنانچہ، پان خریدو، اُسے منہ میں رکھو، چباؤ اور پھر تھوک دو۔ اس سے بہتر ہے کہ پان کھانے کے خیال کو ہی ''آخ تھو'' کر دیا جائے!

شوکت جمال عرصہ دراز سے ریاض میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ ایک معروف مزاح نگار کنبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے والد ابوظفر زین اور بھائی ابوالفرح ہمایوں بھی صاحبِ کتاب مزاح نگار ہیں۔ خود شوکت جمال کے کئی طنزیہ و مزاحیہ مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں۔ وہ نہ صرف شگفتہ شاعر ہیں بلکہ خاصے شگفتہ نثر نگار بھی ہیں۔

حنیف عابد

دُو کی کوڑی

''اللہ اللہ کب ان بچوں کو چین آئے گا! خدا جھوٹ نہ بلوائے تو صبح سے یہ وقت ہوگیا ہے مجال ہے جو اُن شیطانوں کو چپ لگی ہو۔ ارے کم بختو کچھ دیر کے لئے تو خاموش بھی بیٹھا کرو اپنے گلے کو بھی آرام دیا کرو۔'' خالہ نصیبن اپنے کمرے میں تخت پر بیٹھی بڑبڑاتی جارہی تھیں اور ہاتھوں میں سروتہ پکڑے ہوئے چھالیہ بھی کترے جارہی تھیں۔

جب سے ان کی بڑی بیٹی جہاں آرا میکے رہنے آئی تھی گھر میں رونق لگ گئی تھی۔ ماشا اللہ اس کے تلے اوپر کے تین بچے تھے، گھر میں اس کے دو بھائیوں کے بھی چھوٹے بچے تھے۔ جن کی کل تعداد آٹھ ہوجاتی تھی۔ جہاں اتنے سارے بچے ہوں وہاں محلے کے دو چار بچوں کا بھی آجانا اچنبھے کی بات تو نہیں قرار دی جاسکتی۔ بہرحال گھر میں تقریباً ایک درجن بچے تھے جو مشترکہ طور پر کھیل رہے تھے۔ اس صورتحال میں شور کا مچنا فطری عمل تھا۔ خالہ نصیبن جو فجر سے قبل اٹھ جاتی تھیں اور دن کے دس بجے تک ان کے معمولات چلتے تھے جن میں نماز، وظائف، ناشتہ، بہوؤں سے دن کے کھانے کی مشاورت اور ان کے کام سے عدم اطمینان کا اظہار سمیت مسلسل پان دان سے استفادہ شامل ہوتا تھا۔ دس بجے خالہ نصیبن سو جاتیں اور دو گھنٹے کی بھرپور نیند لے کر بیدار ہوتیں۔ یہ دو گھنٹے اُن کی بہوؤں کے لئے کسی نعمت سے کم نہیں ہوتے تھے۔ بچوں کے گھر میں جمع ہونے کا بہوؤں کو یہ فائدہ ہوتا تھا کہ خالہ کی توجہ ان سے ہٹ کر بچوں کی جانب مبذول ہوجاتی اور وہ بغیر کسی دخل در غیر معقولات کے اپنا کام باآسانی انجام دے لیتیں۔

گرمیوں کے دنوں میں بجلی کا جانا دہرے عذاب میں مبتلا کردیتا ہے۔ ایک جانب گرمی چین نہیں لینے دیتی تو دوسری جانب مکھیوں اور مچھروں کی بہتات زندگی اجیرن بنا دیتی ہے۔ ایسے میں اگر بچوں کی بہتات ہوجائے تو سونے پر سہاگے والی مثال صادق آتی ہے۔

جب سے بچے گھر آئے تھے خالہ نصیبن ہر نماز میں دعا مانگ

رہی تھیں کہ ''یا اللہ بجلی دن میں بے شک چلی جائے رات میں نہ جائے!''

دو دن تو خیریت سے گزر گئے دن میں دو مرتبہ ایک ایک گھنٹے کے لئے بجلی جاتی اور خالہ یہ وقت یو پی ایس کے مرہونِ منت چلنے والے پنکھے کے نیچے بیٹھ کر گزار لیتیں ۔ تیسرے دن رات کے دوسرے پہر اچانک بجلی چلی گئی ۔ دن میں تو سب گھر والے ایک کمرے میں جمع ہو کر ایک پنکھے کے نیچے بیٹھ کر گزارا کر لیتے تھے رات کے دوسرے پہر جب سب گھر والے سو رہے تھے یہ ممکن نہیں تھا ۔ چاروں کمروں میں مجبوراً پنکھے یو پی ایس پر چل رہے تھے ۔ دن میں جو یو پی ایس ڈیڑھ گھنٹہ آرام سے گزار دیتا تھا وہ آدھے گھنٹے میں ہی بول گیا ۔ اب کیا تھا ایک ایک کر کے ہر کمرے سے بچے اٹھنا شروع ہو گئے ۔ خالہ نصیبن جو پہلے ہی اختلاجِ قلب کا شکار تھیں شدید گرمی اور حبس کی وجہ سے ان کی طبیعت اور خراب ہونے لگی بچوں کے رونے اور شور نے ان کی طبیعت مزید بگاڑ دی ۔ خالہ کی بگڑتی حالت دیکھ کر ان کے بیٹے نے فوراً فون کیا اور ایمبولینس منگوا کر اُنہیں اسپتال لے گیا۔

اللہ نے کرم کیا اور خالہ کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہونے سے بچ گئیں ۔ رات بھر تمام گھر والے پریشان رہے ، بجلی کی مصیبت کہیں رفو چکر ہو گئی تھی ۔ بچے کسی حد تک حد میں آگئے تھے ۔ دادی اور نانی کی بیماری نے اُنہیں شرارتوں سے روک دیا تھا ۔ خالہ نصیبن تین دن اسپتال میں رہیں ، بچے ہر روز دو وقت ان سے ملنے جاتے تھے۔

دوسرے دن خالہ نصیبن کے ایک پوتے شاکر نے ان سے پوچھا ''دادی یہاں آپ کب تک رہیں گی ؟''

خالہ نصیبن بولیں ''پتہ نہیں بیٹا! یہ ڈاکٹر لوگ جب بولیں گے تو گھر چلی جاؤں گی ۔''

شاکر یہ سُن کر چپ ہو گیا ۔ اور بات آئی گئی ہو گئی۔

چوتھے دن خالہ نصیبن خیر سے اپنے گھر آ گئیں ۔ ایک آدھ دن کے بعد وہی معمول شروع ہو گیا ۔ جہاں آرا اپنے بچوں سمیت واپس سسرال چلی گئی ۔ گھر میں سکون کا ماحول ہو گیا لیکن بجلی کی آنکھ مچولی خالہ نصیبن کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی ۔ ادھر بجلی گئی نہیں کہ خالہ کی طبیعت بگڑنے لگتی ۔ ایک دن رات کا کھانا کھا کر سب بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ اچانک بجلی چلی گئی ۔ پہلے تو یہ معمول کی بات سمجھی گئی ۔ فوری طور پر یو پی ایس کی بجی سے گھر میں بلیک آؤٹ تو نہیں ہوا لیکن فوری اضافی لائٹیں بجھا دی گئیں ۔ خالہ نصیبن بولیں ''اے ہے یہ کون سا وقت ہے بجلی جانے کا ؟ ابھی تو لوڈ شیڈنگ کے ٹائم میں پورا ایک گھنٹہ باقی ہے ۔''

خالہ کی بات سن کر اُن کا بیٹا بولا ''اماں ، لگتا ہے کوئی ٹیکنیکل فالٹ ہے ۔''

ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ باہر سے شاکر گھر میں داخل ہوا ۔ اس نے آتے ہی آواز لگائی ''لائٹ رات بھر نہیں آئے گی ۔''

خالہ یہ سن کر بولیں ''ارے منہ سے بدفال نہ نکال ۔''

شاکر بولا ''دادی یہ بدفال نہیں حقیقت ہے ، پی ایم ٹی جل گئی ہے ، کل دن میں تبدیل ہوگی جب تک لائٹ نہیں آئے گی ۔''

یہ سنتے ہی خالہ کی طبیعت بگڑنے لگی ۔ شاکر بولا ''دادی آپ جلدی سے بیمار ہو جاؤ ہم آپ کو اسپتال لے چلتے ہیں وہاں بڑا جنریٹر لگا ہوا ہے لائٹ نہیں جاتی ۔ آپ تین دن وہاں رہنا جب تک پی ایم ٹی ٹھیک ہو جائے گی ۔''

شاکر کی بات سُن کر سب گھر والوں کو جیسے سکتہ ہو گیا ۔ بچہ پتہ نہیں کس روانی میں یہ بول گیا تھا لیکن بہت دور کی کوڑی لایا تھا ۔ پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ دادی کی طبیعت بگڑنے لگی اور گھر والوں نے اسپتال جانے کی تیاری شروع کر دی۔

حنیف عابد شاعر ، ادیب ، نقاد ، کالم نگار ، مضمون نگار ، فکشن نگار ، ناول نگار ، بچوں کے ادیب اور سینئر صحافی ہیں ۔ آپ کا تعلق کراچی سے ہے ۔ ۳۰ سال سے زائد عرصے سے صحافت سے وابستہ ہیں ۔ موصوف اپنی غیر جانبدار اور دوٹوک رائے رکھنے کے حوالے سے بدنام ہیں ۔ بہترین تجزیہ کار ہیں ، ان کی رائے کو رد کرنا عمومی طور پر ممکن نہیں ہوتا ۔ ملکی اور عالمی سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں ، پرنٹ کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا میں بھی کام کرنے کا تجربہ رکھتے ہیں ۔ موصوف کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ایک شاعری کا مجموعہ بھی شامل ہے ۔ مزید کئی کتابیں زیر ترتیب ہیں جو جلد ہی منظر عام پر آنے والی ہیں ۔ ایک سال سے زائد عرصے سے ارمغانِ ابتسام میں تسلسل کے ساتھ لکھ رہے ہیں ۔

نورم خان

چراغِ طُور جلاؤ۔۔۔

گزشتہ گرمیوں کی بات ہے۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ اپنے حصے کی لوڈشیڈنگ بھگت کر بڑی دعاؤں کے بعد لائٹ آئی تھی اس لئے ہلکی رفتار سے پنکھا چلا کر سونے کی کوششوں میں لگ گئے۔ یہاں 'کوشش' کا لفظ ہم اس لئے استعمال کر رہے ہیں کہ ہماری چند بُری عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک آدھ گھنٹہ تو صرف آنکھ لگنے ہی میں گزر جاتا ہے۔ جبکہ گھر کے دوسرے لوگ بستر پر گرتے ہی خراٹے لینے لگتے ہیں۔ اللہ جانے کیا وقت ہوا ہوگا کہ نیم غنودگی کے عالم میں سرہانے رکھے موبائل نے تھرک تھرک کر' آنکھ مار مار کر اور شوخ دھن بجا بجا کر ہمیں اٹھادیا۔ یاد آیا کہ شام کو چھوٹے صاحبزادے اس کا معائنہ فرما رہے تھے۔ یہ انہی کی مہربانی تھی کہ اسکا وائبریشن' بیک لائٹ اور رنگ ٹون سمیت ساری چیزیں آن تھیں جو ہمیں فوری جگانے کا باعث بنیں۔

''ہیلو۔۔۔کون صاحب؟'' ہم نے بھرائی ہوئی بھاری آواز میں کالر سے پوچھا۔

''ارے بھائی۔۔۔ کیا اتنی جلدی سو گئے؟ یہ میں ہوں مستقیم!'' ایک چہکتی ہوئی آواز آئی جسے سُن کر جی چاہا کہ اگر بذریعہ کال یا ایس ایم ایس یا ایم ایم ایس ایسے لوگوں کو سبق سکھانے کے لئے گھونسوں یا تھپڑوں کی ترسیل ممکن ہوتی تو بخدا آج ہم وہ بھی استعمال کرنے سے دریغ نہ کرتے۔ لیکن یہ عملی طور پر ممکن نہ تھا اس لئے خود پر قابو پاتے ہوئے' دل پر جبر کر کے ہم نے پوچھا ''کہو۔۔۔کیا پریشانی ہے؟ کیسے یاد کیا؟''

یہ ہمارے بزعمِ خود یارِ غار مستقیم صاحب تھے جن کا فلیٹ ہمارے گھر کی سیدھ میں تیسری گلی میں واقع تھا۔

''پریشانی۔۔۔؟ کیسی پریشانی بھائی؟ یہ تو میرا فرض تھا۔۔۔!'' وہ پہیلیاں بجھوانے سے اب بھی باز نہیں آ رہے تھے۔ ہم نے کروٹ بدل کر' غصہ ضبط کر کے موبائل دوسرے ہاتھ میں تھاما تا کہ دورانِ خون نارمل رہے۔

''یہ آدھی رات کو کونسا فرض ادا کر رہے ہو؟ اور تمہارے اس فرض سے ہمارا کیا تعلق ہے؟'' ہم نے بھنائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ارے یار کیوں خفا ہوتے ہو۔ شاید سو رہے تھے۔ کسی نے

سچ کہا ہے کہ سوئے ہوئے شیر کو نہیں جگانا چاہئے تمہیں پتہ ہے کہ یہاں ''شیر'' پر نہیں بلکہ ''سوتے ہوئے'' پر زور ہے۔ یعنی یہ وہ پیاری شے ہے کہ کہتے ہیں پھانسی کے تختے پر بھی نیند آجاتی ہے۔ یعنی پھانسی پر بھی جھولنے سے پہلے آدمی نیند کی بانہوں میں جھولنا نہیں بھولتا۔''

''دیکھو بھائی۔۔۔ہم دن بھر تمہاری اس طرح کی بکواس بغیر کسی اعتراض کے سنتے رہتے ہیں اور وہ بھی بغیر منہ بسورے۔ مگر یہ جو تم آدھی رات کو کال کر کے ہمیں ستا رہے ہو تو اللہ کرے تم پر بھی ''کے۔الیکٹرک'' کی مار پڑے اور تم بھی قرار مانگو مگر قرار کو ترسو۔۔۔''

''سمجھ گیا بھائی! ایک تو تمہارے لئے اب تک جاگا ہوا ہوں کہ کب گھڑی کی سوئی بارہ پر آئے اور کب میں تمہیں کال کروں اور تم ہو کہ نیم خوابیدگی، نیم دیوانگی کے عالم میں مجھے کوس رہے ہو؟''

''ہمارے لئے رات بارہ بجے کا انتظار۔۔۔؟ بندۂ خدا ہمارے ہمسایہ ملک کی ایک قوم بیشک ''بارہ بجے'' کے مسئلے پر بہت جذباتی ہے مگر جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے تو تمہارے آباء واجداد صدیوں پہلے مسلمان ہوگئے تھے۔ لیکن لگتا ہے کہ تم بارہ بجے دن سے ترقی کرتے کرتے بارہ بجے رات تک تو آپہنچے لیکن اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکے۔'' ہم نے انہیں چھیڑا تو وہ بپھر گئے ''دیکھ یار۔۔۔ رات کے بارہ بجے سے ہی اگلا دن شروع ہوجاتا ہے۔ جبھی تو ۳۱ دسمبر کی آدھی رات ہی سے نئے سال کی تقریبات شروع ہوجاتی ہیں، پٹاخے پھوٹنے لگتے ہیں، بغیر سائیلنسر کی موٹر سائیکلیں سڑکوں پر آجاتی ہیں کلبوں اور ساحلِ سمندر پر لوگ کھانے پینے اور ناچنے گانے لگتے ہیں۔۔۔''

''ایک منٹ، ایک منٹ۔۔۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے کہ ۳۱ دسمبر کو گزرے تین ماہ بیت چکے ہیں اور اگلے دسمبر کی تشریف آوری میں بھی کم از کم نو مہینوں کا عرصہ درکار ہے۔۔۔ پھر ابھی سے تمہارے پیٹ میں مروڑ کیوں اٹھ رہا ہے۔۔۔؟ ہم نے ان کی بات کاٹی۔ اس پر ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ بھرائی ہوئی آواز سے شکایتی لہجے میں بولے ''میں نے تو صرف مبارکباد دینے کے لئے تمہیں کال کی تھی۔''

''مبارکباد؟ کس چیز کی مبارکباد اور وہ بھی آدھی رات کو؟ ذرا بتاؤ گے کہ وہ کون سی خوشی ہے جس کے بارے میں ہمیں بھی کچھ نہیں معلوم؟'' ہم نے تقریباً چیختی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''لگتا ہے کہ تم ہی جیسے شوہروں کی وجہ سے اکثر طلاقیں ہوتی ہیں۔ بھول گئے بارہ بجنے کے بعد اب نئی تاریخ شروع ہوگئی ہے۔۔۔؟

''یار تم کیوں ہماری رات غارت کرنے پر تلے ہوئے ہو؟ تاریخوں کا حساب کتاب تو خواتین رکھتی ہیں۔ ہمیں کیوں پریشان کر رہے ہو؟''

''ٹھیک ہے۔۔۔ تم خاصے کوڑھ مغز ہو، یہ تو مجھے پتہ تھا مگر یہ پتہ نہیں تھا کہ دو تین دہائیوں ہی میں تمہارا حافظہ اتنا کمزور ہوجائے گا۔''

''لو اور سنو۔۔۔ اب اس وقت حافظہ کیسے ٹھیک کروں؟ جو کہنا ہے جلدی کہو۔ کیوں اپنا بیلنس برباد کر رہے ہو؟''

لگتا ہے کہ یہ بات اُن کے دل کو لگی اور انہیں بھی احساس ہوا کہ اُن کی طویل فضول گوئی سے انہی کا نقصان ہو رہا ہے۔ اسلئے جلدی سے بولے ''تم جیسے آدمیوں سے تو بات بھی مشکل ہے۔ بہرحال اب لائن پر آہی گئے ہو تو شادی کی سالگرہ مبارک ہو۔''

یہ کہہ کر انہوں نے لائن کاٹ دی۔ تب ہمیں یاد آیا کہ ارے ہاں واقعی کل۔۔۔ بلکہ بارہ بجنے کے بعد آج ہی ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ ساتھ والے بستر پر بیگم خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھیں۔ مستقیم سے ہماری گفتگو کے دوران دو چار سخت مقام بھی آئے تھے، آوازیں بھی بلند ہوئی تھیں مگر مجال ہے جو انہوں نے کروٹ بھی بدلی ہو۔ گھر والوں کا بھی یہی خیال ہے کہ اگر کبھی بغیر ہلائے جلائے انہیں اٹھانا ہو تو کم از کم جوہری بم کے دھماکے کی ضرورت پڑے گی۔ کیونکہ وہ کسی کے چیخنے چلانے پر تو کبھی ٹس سے مس ہوتیں نہیں۔ ان حالات میں معصوم الارم کلاک کی تو حیثیت ہی کیا ہے۔ ہم نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ہمارے علاقے میں

لوڈشیڈنگ کا نیا دورانیہ شروع ہونے میں چند ہی منٹ رہ گئے تھے۔دل سے ایک آہ نکلی "کم بخت مستقیم۔۔۔تیرا بیڑا غرق ہو۔ ذرا سی آنکھ لگی تھی کہ اٹھا دیا۔ سارا دن پڑا تھا مبارکباد دینے کو۔" مگر بہت سے خودساختہ دوستوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر چیز کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔اب بھلا جو چیز ہمیں یا ہماری بیگم کو بھی یاد نہ تھی' انہیں یاد رکھنے اور رات کے بارہ بجے یاد دلانے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے یہ حرکت کیوں کی۔ ظاہر ہے کہ ہماری شادی میں جن دوستوں کا ہاتھ تھا' ان میں سے جو حضرات ابھی تک بقیدِ حیات ہیں' وہ بھی اُنہی میں سے ایک ہیں۔اور غالباً آدھی رات کو مبارکباد بھی یہ جتلانے کو دے رہے تھے کہ" دیکھا بچو۔۔۔ہماری کرائی گئی شادی کتنی پائیدار نکلی کہ ابھی تک برقرار ہے۔" اب پتہ نہیں یہ شادی کی پائیداری ہے یا ہماری بزدلی کہ ابھی تک بھگت رہے ہیں۔

ایک دم ذہنی رو بھٹکنے پر پھر بجلی کی یاد آ گئی۔ پھر لوڈشیڈنگ سے ہوتے ہوئے اس کے تیز رفتار میٹر کی طرف دھیان گیا۔ پھر دوگنے بل پر سوئی آ کر اٹک گئی۔ یہ خیال آتے ہی منہ میں ایک کڑواہٹ سی گھل گئی۔ دنیا کی تمام الیکٹرانکس کی چیزیں بجلی کے بغیر بیکار ہوجاتی ہیں مگر میٹر کے سامنے سے کوئی خاتون اپنا دوپٹہ بھی لہرا کر گزر جائے تو اتنی بادی بجلی پیدا ہوجاتی ہے جو اسکے چل پڑنے کو کافی ہے۔ بیشک بنجامن فرینکلن جیسا شخص بھی بجلی دریافت کرسکتا تھا مگر فائدہ تو اسی شخص نے اٹھایا جس نے سب سے پہلے بجلی کا میٹر بنایا تھا۔ ابھی ہم اسی ادھیڑبن میں تھے کہ وہی ہوا' جو ہونا تھا۔ اچانک آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ معاف کیجئے کسی ہتھوڑا گروپ نے ہمارے سر پر ہتھوڑا نہیں مارا تھا۔ حسب معمول صرف بجلی چلی گئی تھی۔ اچانک کمرے میں گھٹن کا احساس بڑھنے لگا تو اٹھ کر گیلری میں آ گئے۔ سارا علاقہ تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ دور کہیں کسی بلڈنگ میں' کسی فلیٹ کی کھڑکی سے ایمرجنسی لائٹ کی ایک کمزور سی کرن نظر آ رہی تھی۔ ایک دم ہمیں موسیٰ علیہ اسلام یاد آ گئے۔ ایک ایسی ہی اندھیری رات میں وہ اپنی زوجہ کو لیکر لوٹ رہے تھے کہ دوران انہیں بھی ایک ایسی ہی روشنی نظر آئی تھی۔ اس سحر زدہ روشنی سے بے خود ہو کے بے اختیار یہ شعر ہونٹوں پر مچل اٹھا۔

ذرا قریب تو آؤ بڑا اندھیرا ہے
چراغ طور جلاؤ بڑا اندھیرا ہے

چراغ پر مٹی کے دیئے یاد آ گئے کیونکہ موم بتیاں بھی اتنی مہنگی اور جلنے میں اتنی سرعت انگیز ہوگئی ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس میں کس کا قصور ہے؟ مگس کا؟ باغ کا؟ یا پروانے کا کہ ابھی جلاؤ ابھی ختم۔۔۔ ایک بڑا پرانا چلتا ہوا شعر ہے کہ۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانوں کا ہوگا

یعنی شاعر چاہتا ہے کہ مگس (شہد کی مکھی) کے باغ میں جانے پر پابندی لگنی چاہیئے تاکہ وہ پھولوں کا رس چوس کر شہد کے چھتے نہ بنائے جن سے موم نکال کر موم بتیاں بنائی جاتی ہیں کیونکہ جب یہ موم بتیاں جلائی جاتی ہیں تو پروانے ان پر جل جل مرتے ہیں۔ نرم دل شاعر کی بات سرآنکھوں پر۔ مگر آج وہ زندہ ہوتے تو عوام کی بیچارگی کا احساس کرتے ہوئے خود مگس کو باغ میں اوورٹائم لگانے کا مشورہ دیتے۔

خیر۔۔۔اب ہمیں مزید دو گھنٹے کا عذاب جھیلنا تھا۔ بھائی مستقیم کے لئے پھر بددعا نکلی۔ جس طرح انہوں نے ہمیں کچی نیند سے جگا کر خوار کیا تھا' جی چاہا کہ اب انہیں بھی فون کر کے ستاؤں اور ان کے کیے کا مزا چکھاؤں۔ یہ خیال آتے ہی ہماری نگاہ جو اُن کے فلیٹ کی طرف اٹھی تو بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی۔ ہماری کسی انتقامی کارروائی سے پہلے ہی "کے۔الیکٹرک" کا پیدا کردہ اندھیرا اُنہیں بھی ان کے فلیٹ سمیت نگل چکا تھا!

نورم خان (نور محمد خان) کا تعلق کراچی سے ہے۔ طنز و مزاح ان کا میدان ہے۔ نثرِ لطیف میں نہایت شستہ اندازِ تحریر کے مالک ہیں۔ اخبارات میں طویل عرصہ سے مضامین اور کالم نگاری کے "مرتکب" ہو رہے ہیں۔ فیس بک پر طنز و مزاح پر مبنی ایک گروپ کے منتظمِ اعلیٰ بھی ہیں۔ برقی مجلّے "ارمغانِ ابتسام" میں خاصی مستقل مزاجی سے لکھ رہے ہیں۔

محمد ایوب صابر

ٹیکس کی پکڑ

اُونٹ کو صحرا کا ہوائی جہاز کہا جاتا ہے۔ ہماری ہوائی سروس کا حال دیکھ کر یہ گمان ہو رہا ہے کہ چند سالوں بعد ہوائی سفر کے لئے اِسی جانور پر انحصار کرنا پڑے گا۔ شتربان کے جا کر اپنے ٹکٹ کی بکنگ کرانا ہوگی۔ گویا شتربان بھی آئی ایم ایف کی طرح ہماری نکیل اپنے ہاتھ میں پکڑ لے گا پھر وہ جس طرف لے جانا چاہے گا، ہم بے چون و چرا اُس کا چارہ کھانے کے لئے چلتے رہیں گے۔ جیسے شتربان پچھلے ۶۵ برسوں سے نخلستان کا خواب دکھا کر پوری قوم کو صحرا میں گھما رہے ہیں اور ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ منزل بہت قریب آ گئی ہے۔ ہم ٹھہرے بدھو کے بدھو، یہ بھی نہیں سوچتے کہ جس قوم نے بھی ترقی کی ٹھان لی وہ دو سے تین دہائیاں میں منزل پر پہنچ گئی۔ اس کے برعکس ہم چھ دہائیوں سے ترقی کی دہائیاں دے رہے ہیں لیکن ابھی تک اپنے سفر کی سمت بھی نہیں طے کر پائے۔

بچپن میں نانی اماں سے سنا تھا کہ اونٹ کے بال رات بھر پانی پینے والے مٹکے کے نیچے رکھیں تو صبح کے وقت تک پیسوں کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ ہم بھی بڑے شوق سے اونٹ کے بال لے پانی والے مٹکے کے نیچے رکھ دیتے تھے مگر صبح کو اونٹ کے بال پیسوں میں تبدیل ہونے کے بجائے ہمارے ملکی خزانے کے زر کی طرح خود بھی غائب ہو جاتے تھے۔ ہم نے بڑے ہو کر یہ کھیل چھوڑ دیا کیونکہ ایک دفعہ ایک سیانے نے ہمیں سمجھایا کہ بیٹا نانی

اماں تو تمھیں سلانے کے لئے اس طرح کی کہانیاں سناتی تھیں پھر سمجھ میں آیا کہ ''اونٹ کا پاؤں زمین کا نہ آسمان کا'' اب پوری قوم اِسی کھیل میں مگن ہے۔قوم کو بتایا جاتا ہے کہ فلاں پارٹی کو منتخب کرنے سے ملکی حالات رات بھر میں تبدیل ہو جائیں گے۔ پوری قوم اپنا قیمتی ووٹ اُس ٹولے کو دے دیتی ہے۔ وہ ٹولہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد چند سال تک سرکار کے مزے لوٹ کر کہتا ہے کہ ہمارے پاس کوئی الہ دین کا چراغ تو نہیں کہ چٹکی بجاتے ہی تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ہم تو کہتے ہیں کہ الہ دین کو وفات پائے صدیاں گزر گئیں، اُسے قبر میں آرام کرنے دیں۔ہم تو اُس چراغ کی تمنا کر رہے ہیں جو چین، ملائیشیا اور سنگاپور نے اِس دور میں روشن کر کے اپنے ممالک سے اندھیرے دور کئے۔

ہمارے عوام مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ کی چکی میں پس رہے ہیں۔پہلی حکومتیں ریلیف کے نام پر اونٹ کے منہ میں زیرہ دینے کی کوشش کرتی تھیں۔آج ہمارے صاحبانِ کا یہی طرۂ امتیاز ہے کہ انہوں نے اونٹ کے منہ سے زیرہ چھیننے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔اب اونٹ جب انتخابات کے پہاڑے کے نیچے آئے گا تو اُس کو اپنی اونچائی کا اندازہ ہو جائے گا۔اُس وقت بیلٹ بکسوں کا پہاڑ کھودنے سے بھی ووٹ نام کا چوہا نہیں نکلے گا پھر انہیں ''عوام اوجھل ، پہاڑ اوجھل'' کے معانی سمجھ آئیں گے۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جب ہمیں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر پہاڑے یاد کرنے پڑتے تھے تو پہاڑوں کے ساتھ نانی یاد آ جاتی ہے۔اُس وقت ایسا لگتا تھا کہ ہم دنیا میں صرف پہاڑے یاد کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔پہاڑے اِس طرح کورس میں یاد کرائے جاتے تھے کہ بہت سے بچے پہاڑے یاد کرتے ہوئے اِس قدر سُر تال سے واقف ہو جاتے تھے کہ جوان ہو کر وہی بچے اچھے قوالثابت ہوئے ہیں۔اب پہاڑوں کی جگہ ٹیبل آ گئے ہیں ویسے بھی کیلکولیٹر کے دور میں پہاڑوں کے پہاڑ پر چڑھنا کسے پسند ہے۔

عوام بھی بہت بھولے ہیں اتنا بھی نہیں جانتے کہ'' اونٹ جب بھاگتا ہے تو پچھم کو''۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری قوم ہی

پچھم کی طرف بھاگنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ پچھم نے اپنی ترقی کا راز پورب سے حاصل کیا اور اہلِ پورب اپنی کامیابی کے لئے یورپ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اسی لئے تو آج پوری دنیا کو Globe-ill-village کا نام دیا گیا ہے تاکہ پورب اور پچھم کا فرق ہی ختم ہو جائے۔ ہم نے ۲۵ برس قبل کی خاطر اپنا گاؤں چھوڑا اور آج 25 سال بعد بھی ہم بیمار گاؤں میں رہ رہے ہیں۔

پہلے زمانے میں کہتے تھے کہ اونٹ کی پکڑ اور عورت کے مکر سے خدا بچائے۔ اب اس محاورے کی جدید تشریح یہ ہے کہ جی ایس ٹی کی پکڑ اور حکومت کے مکر سے خدا بچائے۔ ملک تباہی کے دھانے پر کھڑا ہے اس کے باوجود صاحبانِ حل و عقد چین کی بانسری بجا رہے ہیں۔ اب ہمارا حال بھی وہی ہے کہ اونٹ ڈوبیں اور بھیڑیں تھاہ مانگیں۔ ہر ادارہ افراتفری کا شکار ہے۔ غیر ملکی قرضوں کو ہی لیجئے، اونٹ سستا اور پٹا مہنگا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ قرضہ کم لیکن سود زیادہ ہے۔ ہم غیر ملکی قرضے کا سود ادا کرنے کے لئے مزید قرض لیتے ہیں۔ غیر ملکی ادارے بھی قرض دیتے وقت اونٹ کے گلے میں بلی جیسی شرائط عائد کر دیتے ہیں۔ یہ قرضے ہماری معیشت کے لئے اونٹ کٹارا ثابت ہوتے ہیں جہاں پاؤں رکھو وہیں کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ جب ہم غیر ملکی ادارے سے قرض مانگنے جاتے ہیں تو ہمارا وہ حال ہوتا ہے کہ اونٹ بلیاں لے گئیں ہاں جی ہاں جی کہتے۔ ہم اِن اداروں کی ہاں میں بڑھ چڑھ کر ہاں ملاتے ہیں اگر وہ کہیں کہ اپنے ملک کا دیوالیہ نکال سکو گے تو ہم کہتے ہیں سو دفعہ، اگر وہ فرمائش کریں کہ یوٹیلیٹی بلوں کی قیمت بڑھا کر معیشت تباہ کر لو گے تو ہم کہتے ہیں ہاں جی حضور، اگر وہ شرط عائد کریں کہ غریب عوام کا تیل نکال پاؤ گے تو ہم کہتے ہیں کہ تیل کیا خون تک نچوڑ لیں گے۔

مجھے یاد آ رہا ہے کہ بچپن میں جب بھی میں عقل کی کوئی بات کرتا تو میری ماں فوراً کہہ دیتی کہ تم بھی بھیڑوں میں سے اونٹ پہچان لیتے ہو۔ میں کہتا امی جان! یہ کون سا مشکل کام ہے اگر اونٹ اور بھیڑ ایک جگہ کھڑے ہوں تو اُن کو پہچاننے کے لئے اُن کی دوڑ لگوا کر دیکھ لیں، جو آگے نکل جائے وہ اونٹ ہو گا اور جو پیچھے رہ گئی وہ بھیڑ ثابت ہو گی۔ میری ماں ہنستے ہوئے کہتیں کہ تم بڑے ہو کر فکاہ نگار بن جاؤ گے جو اِس طرح کے مشکل مسائل آسانی سے حل کر لیتے ہو۔

ایک خبر کے مطابق امریکہ کی ریاست ورجینیا میں ایک ٹی وی چینل کی نیوز رپورٹر اونٹ کے حملے سے بال بال بچ گئی کیونکہ اونٹ نے اُس کے سر کے بال کھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اِس صورتحال سے گھبرا گئی اور موقع پر موجود کیمرہ مین نے خاتون رپورٹر کو اونٹ سے نجات دلانے میں مدد فراہم کی۔ مجھے اِس خبر کی صداقت پر شک گزرا تھا۔ میں نے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے ایک دوسرے ٹی وی چینل کا سہارا لینے کا فیصلہ کر لیا جس نے پورے واقعے کی چھان بین کے بعد خبر دی ہے کہ وہ نٹ کھٹ اونٹ بھی میڈیا کی طاقت پر یقین رکھتا ہے۔ اِس لئے اونٹ نے سوچا کہ اپنے شتربان کی شکایت میڈیا کے ذریعے پوری دنیا تک پہنچائی جائے۔ اونٹ کو شکایت ہے کہ شتربان نے اس پر دہشت گردی کا جھوٹا الزام لگایا ہے۔ دراصل وہ بہت شریف النفس اونٹ ہے اور شتربان کئی کئی دن تک اُس بے چارے کو چارہ نہیں دیتا ہے۔ اِس لئے اونٹ نے اپنی بلبلاہٹ دنیا تک پہنچانے کے لئے نیوز رپورٹر کے کان میں اپنی روداد سنانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ نیوز رپورٹر دراصل اونٹ کی فریاد نہ سمجھ سکی اور اُسے دہشت گردی کا مرتکب سمجھتے ہوئے شور مچانا شروع کر دیا کہ اونٹ نے مجھ پر حملہ کر دیا ہے۔

اس سارے واقعے میں یہ پہلو سامنے آیا ہے کہ میڈیا کے ذریعے کسی کو بھی مجرم یا بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہی اونٹ جو اپنی فریاد لے کر ٹی وی رپورٹر کے پاس گیا تھا اُسے دہشت قرار دے کر ساری دنیا میں بدنام کر دیا گیا۔

محمد ایوب صابر کا تعلق سیالکوٹ سے ہے جبکہ ۲۷ سال سے دہران (سعودی عرب) میں مقیم ہیں، ہوٹل مینجمنٹ پیشہ ہے۔ ظرافت نگار، شاعر، کالم نگار، افسانہ نگار، ناول نگار، تحقیقی مضمون نگار سبھی کچھ ہیں۔ غزلوں اور افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور کئی زیرِ اشاعت ہیں۔ دو فکاہیہ مضامین کے مجموعے "دریچۂ ظرافت" اور "نسخہ ہائے لطافت" بھی شائع ہو چکے ہیں۔ مزید ایک مجموعہ "چشمۂ فکاہت" زیرِ اشاعت ہے۔ "ارمغانِ ابتسام" کو اُن کے مسلسل قلمی تعاون کا افتخار حاصل ہے۔

سیّد ممتاز علی بخاری

پاکستانی مصنوعات

چمچے

یوں تو چمچے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو دیگ میں ہوتے ہیں اور دوسرے آپ وزیروں، مشیروں وغیرہ کے آس پاس اس طرح منڈلاتے دیکھ سکتے ہیں جیسے گدھ مردار کے آس پاس۔۔۔۔۔! پاکستان میں اس دوسری قسم کے چمچوں کی اکثریت ہے اور سارے کے سارے پاکستان ہی میں بنے ہیں۔ ان چمچوں کی کچھ خصوصیات ہیں جو اِن کو دوسروں سے الگ کرتی ہیں۔ جس کے ساتھ یہ ہوتے ہیں اس کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملانا، عوام اور اس کے اثرات سے انہیں محفوظ رکھنا، دوسرے لیڈروں کی ہرزہ سرائی اور ان کی کردار کشی کے ماہر ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو شاہ سے بڑھ کر شاہ کے وفادار ثابت کرنے کے لیے یہ کسی بھی حد تک گر سکتے ہیں بلکہ ہر حد سے بھی گر جاتے ہیں۔ اپنے لیڈر کے ہر کالے دھندے میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ انہیں جی حضوری، چاپلوسی اور مکھن لگانے کی خصوصی تربیت حاصل ہوتی ہے۔

فتویٰ ساز فیکٹری

یہ فیکٹریاں پاکستان میں ہر گلی محلے میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے حوالے سے پاکستان نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ دوسرے ممالک کی مانگیں بھی پوری کرنے کے قابل ہے۔ یہ فیکٹریاں دو ٹانگوں والے انسانوں پر مشتمل ہوتی ہیں جنہیں عرفِ عام میں مولوی کہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو دوسرے علومِ دینیہ تو ایک طرف، قرآن پاک بھی پورا نہیں پڑھے ہوتے۔ ان نام نہاد مولویوں کو بنانے کا انتہائی آسان طریقہ ہے۔ کسی بھی گھر میں جو بچہ پڑھنے لکھنے کے قابل نہ ہو، والدین اسے بوجھ سمجھتے ہوں، محلے والے اس سے تنگ ہوں۔ اسے کچھ مہینوں کے لیے کسی مدرسے کی دالیں کھانے بھیج دیں اگر وہ دالیں ہضم کر گیا تو وہ ''مولوی'' بن گیا۔ اب جو مسجد خالی نظر آئے وہاں وہ ڈیرہ جما لے۔ ایسے مولوی دین کی خاطر تو کبھی آواز بلند نہیں کرتے، ہاں! جب ان کا مفاد آ جائے تو اسلامی تعلیمات کو یوں توڑ موڑ کر

بیان کرتے ہیں کہ یہ چاہیں تو کسی جانور کو بھی شہید و غازی قرار دیں اور چاہیں تو بڑے بڑے اولیاء کو بھی کافر کا خطاب دے دیں۔ان میں جو لیڈر ٹائپ کے مولوی ہوتے ہیں وہ اکثر حکمرانوں کے دامن سے بغل گیر رہتے ہیں اور ان کی خاطر حق کو باطل اور باطل کو حق ثابت کر کے حقِ نمک ادا کرتے ہیں۔ یہ فیکٹریاں چمچے بھی بکثرت پیدا کرتی ہیں۔

لوٹے

لوٹے بھی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو باتھ روم میں ہوتے ہیں اور دوسرے ڈرائنگ روم میں۔۔۔۔!!دونوں لوٹے یکساں طور پر مفید ہوتے ہیں۔ ڈرائنگ روم والے لوٹوں کو گھوڑے بھی کہا جاتا ہے اس صورت میں جب وہ اسمبلی میں ہوں تبھی تو ان کی خرید و فروخت ہارس ٹریڈنگ کہلاتی ہے۔ یہ ہوا کا رخ ایسے پہچان لیتے ہیں جیسے گدھ مردار کی بو سونگھتی ہے اور پھر یہ موسم کی طرح بدل جانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ان کی اولین ترجیح ان کا مفاد ہوتا ہے اور یہ اپنے مفاد کے لیے اپنا سب کچھ بیچ دیتے ہیں گویا کہ OLX پر آئے ہوئے ہوں۔

سیّد ممتاز علی بخاری جامعۂ کشمیر سے ارضیات میں ایم فل کر چکے ہیں۔ادب سے خاصا شغف رکھتے ہیں۔عرصہ دس سال سے طنز و مزاح، افسانہ نگاری اور کالم نگاری کرتے ہیں۔طنز و مزاح پر مشتمل کتاب ''خیالی پلاؤ'' جلد شائع ہونے والی ہے۔گستاخانہ خاکوں کی سازش کو بے نقاب کرتی ایک تحقیقاتی کتاب ''عصمت رسول پر حملے'' شائع ہو چکی ہے۔بچوں کے ادب سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ مختلف اوقات میں بچوں کے دو مجلّے ''سحر'' اور ''چراغ'' بھی ان کے زیر ادارت شائع ہوئے ہیں۔آج کل ایک آن لائن میگزین ''رنگ برنگ'' کے چیف ایڈیٹر ہیں،

گھریلو سطح پر ٹرانسپورٹ کا مسئلہ تو کہیں بھی نہیں۔

حافظ مظفر محسن

دیسی میم

"مجھے کتے سے ڈر لگتا ہے۔۔۔؟" مگر مجھے کتوں کی صحبت میں کافی وقت نہ چاہتے ہوئے بھی گزارنا پڑتا ہے کیونکہ میرے دوست ڈاکٹر بوٹا صاحب کتوں کے بہترین معالج ہیں۔ان کے پاس عجیب وغریب طرح کے عجیب و غریب بیماریوں میں مبتلا کتوں کو میں نے بار ہا دیکھا ہے۔کبھی کبھی تو کتوں کو میں نے اپنے دوست کی طرف اس معصوم اور پیار بھرے انداز میں آنکھیں چار کرتے دیکھا ہے کہ میں نے سوچا کہ اگر یہ کتا بول سکنے کی صلاحیت رکھتا اور دو چار جماعتیں پڑھا ہوا بھی ہوتا تو یقیناً وہ کہہ رہا ہوتا۔

"بوٹا مائی فرینڈ۔۔۔لو یو۔۔۔"

مگر چونکہ وہ یہ دونوں خوبیاں نہیں رکھتا اس لیے وہ ڈاکٹر بوٹا کو معصوم اور پیار بھرے انداز سے دیکھ کر ہی اپنی خواہش پوری کر رہا ہے۔ایک دن میں دیر گئے ڈاکٹر بوٹا کے پاس بیٹھا رہا۔ڈاکٹر حیران بھی تھا کہ میں وہاں سے جا کیوں نہیں رہا۔۔۔؟ مگر وہ خوش بھی تھا کہ میں اس وقت اسے تازہ اور کرارے لطیفے سنائے جا رہا تھا جب کہ وہ اپنے کلائنٹ میں بری طرح سے گھرا ہوا تھا۔ایک کلائنٹ کتے سے ڈاکٹر ایک دم پرے ہٹ گیا اور اس کی ماڈ سکوڈ مالکن کو ڈانٹنے بھی لگا۔۔۔!

"ہنی۔۔۔ڈولی تم نے بے بی کو بر وقت مجھے کیوں نہیں دکھایا۔۔۔مجھے پتہ ہے تم امریکن اسکول میں پڑھاتی ہو اور خاصی مصروف رہتی ہو مگر ڈولی۔۔۔اس کو تو شدید بخار ہے۔۔۔اس کو تو ۔۔۔(ڈاکٹر نے بڑی ہی مشکل سی کسی بیماری کا نام لیا۔۔۔مجھے لگتا ہے اُس کا اشارہ خارش کی طرف تھا)۔۔۔وہ ہے اور اگر اس کا بر وقت علاج نہ ہوا تو پھر تمہیں اس کی جدائی بھی سہنا پڑے گی اور یقیناً اس کی یاد میں تم کچھ نہایت اداس کر دینے والی اسی طرح کی نظمیں لکھو گی جس طرح کی پچھلے سال تمہارے اسکول کے میگزین میں تمہارے نام سے چھپی تھی (تم نے بتایا تھا کہ وہ نظم تم نے کسی پرانی انگریزی کی اس کتاب سے لی تھی جو تم نے لاہور کی پرانی انارکلی کے ایک تھڑے سے چار روپے کی خریدی تھی)۔

اس دوران ہنی کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھنے لگی اور میں نے شرم کے مارے سر کو جھکا لیا، جیسے میں نے کچھ سنا بھی نہیں اور۔۔۔دیکھا بھی نہیں۔۔۔! (کتا جانے، ڈاکٹر جانے یا پھر ہنی جانے۔۔۔؟)۔

ہنی اپنے کتے کے ساتھ کلینک سے باہر نکلی تو اس وقفے کے

دوران میں نے جلدی سے ڈاکٹر کے ساتھ پنجابی میں فقروں کا تبادلہ کیا۔۔۔مفہوم کچھ یوں ہے۔۔۔''ڈاکٹر تم یہ اِن ماڈرن قسم کی عورتوں سے اس قدر خوش کیوں ہوتے ہو اور ''تیسری مخلوق'' کے لہجے میں باتیں کیوں کرتے ہو۔کیا کتوں میں بھی ''کھسرے'' ہوتے ہیں، جبکہ ''میاں چنوں'' میں پڑھائی کے دوران تم ہمارے ساتھ ٹھیٹھ سرائیکی میں بات کیا کرتے تھے اور ہم تمہیں ڈبہ پیر کہہ کر چھیڑا کرتے تھے؟

ڈاکٹر میرے سوال پر گھبرا گیا اور بول پڑا۔۔۔''او۔۔۔ میرے بچپن کے کمینے دوست ''تہہ کوں کیویں سمجھاواں ۔۔۔ دولت کماون لئے ایں سارے حربے آزمانے پیندے ہن۔۔۔!''

ہماری بحث وتکرار جاری رہتی کہ ایک اور ماڈرن سی خاتون کلینک میں ہانپتی کانپتی داخل ہوئی ''ہیلو بوٹا'' ۔۔۔ ہائے روما (جیسا منہ ویسی چپیڑ) اور روما نے اپنا بھاری بھر کم کتا ڈاکٹر کے سامنے گرا دیا۔ سخت بدبُو دار کتا۔۔۔ اور ماڈرن خاتون کے بارے میں میں کیا کہوں۔۔۔؟ جو مجھے دیکھ کر تھوڑا سا غرایا اور اپنی مالکن کو دیکھ کر شرمایا مگر جب اس کی نظر ڈاکٹر پر پڑی تو بے چارہ خوب گھبرایا اور ڈاکٹر نے معائنہ کرتے ہوئے جب اس کو گردن سے ذرا مخصوص انداز میں دبایا تو ''چاؤں چاؤں'' کرنے لگا اس دوران میں نے آہستہ سے کہہ دیا ''ڈبہ پیر'' ڈاکٹر کی ہنسی نکل گئی اور اس نے کتے کی گردن کو دبانا چھوڑ دیا۔۔۔ کلائنٹ نے سکھ کا سانس لیا؟

''ڈولی۔۔۔ تم شیرون کو ہر ماہ چیکنگ کے لیے کیوں نہیں لاتی۔۔۔ یہ گڑبڑ کرے گا اور تمہارے پاپا کو جرمن سے نیا پپی تمہارے لیے بھیجنا پڑے گا۔۔۔؟''

''بوٹا۔۔۔ ڈیئر میں جرمن ہی تو پپا کے پاس گئی ہوئی تھی۔ پیچھے سے بشیراں اسے آپ کے پاس نہ لے کر آئی۔۔۔ حالانکہ میں اسے آنے جانے کا کرایہ دے کر تاکید کر کے گئی تھی؟ یہ نوکر کیا جانے ''پیٹس'' کو کیسے سنبھالا جاتا ہے۔۔۔؟''

یہ کلائنٹ باہر نکلا تو میں نے ڈاکٹر سے پوچھا ''یار یہ تم سب

خواتین کو ڈولی کہہ کر کیوں بلاتے ہو؟''

''یار یہ بڑا خوش ہوتی ہے اس لہجے میں بات کرنے سے اور چپکے سے چیک اپ کی فیس دے جاتی ہیں جو ہر بار میں باتوں باتوں میں بڑھاتا جا رہا ہوں'' ڈاکٹر بوٹا نے وضاحت کی''اور سنو جس نوکرانی کا یہ ذکر کر رہی تھی وہ بشیراں دراصل اس کی ماں ہے ایک دفعہ ساتھ آئی تو میں نے پوچھا یہ کون ہے۔۔۔؟ تو شوشا میں اس کے منہ سے نکل گیا کہ یہ ہماری ملازمہ بشیراں ہے۔ وہ عورت میرے سامنے ہی اسے بری طرح سے گھورنے لگی۔ بعد میں باہر کھڑے سکیورٹی گارڈ نے بتایا کہ بشیراں نے اس کو بالوں سے پکڑ کر خوب گھسیٹا۔۔۔؟ اور پنجابی میں گندی گالیاں بھی دیں۔۔۔ اب یہ ہر بار خود ہی وضاحت کرتی ہے کہ مجھے شک نہ پڑے

بشیراں ملازمہ ہی ہے ماں نہیں۔۔۔؟''

''یار۔۔۔مظفر ہمارے ہر کام میں بناوٹ کیوں ہے۔۔۔ ہر جگہ ہر وقت ہم جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟ ہماری سیاست کے تازہ جھوٹ تمہارے سامنے ہیں۔۔۔فوج کی نگرانی میں ہونے والا الیکشن بھی لوگوں کو پسند نہیں آ رہا۔۔۔ہم سب نے لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔۔۔ یہاں اچھا خاصا کاروبار چھوڑ چھاڑ کر ایجنٹوں کو لمبے نوٹ دے کر یورپ بھاگ جانے کے چکر میں رہتے ہیں اور وہاں جا کر انگریزوں کے برتن صاف کرنے اور کتوں کو نہلانے کو ہم لوگ ترجیح دیتے ہیں۔۔۔؟''

حالانکہ انگریزوں کے کتے بھی تو کتے ہی ہوتے ہیں بس ذرا ادب آداب سے واقف ہوتے ہیں۔

مجھ سے رہا نہ گیا اور میں بول پڑا ''ڈاکٹر تم بھی تو گھر میں سرائیکی بولتے ہو۔۔۔ ہماری بھابھی بھی ڈاکٹر ہیں مگر اس جانوروں کے کلینک میں تم منہ بگاڑ بگاڑ کر انگریزی لہجے کی اردو بولتے ہو۔۔۔!''

ڈاکٹر چپ کر گیا مگر پھر بول پڑا ''سارا دن کتوں میں رہ کر میں نے اندازہ لگایا ہے کہ کتا آج بھی وفادار ہے۔۔۔ مالک پر دل و جان سے نثار ہونے کا جذبہ رکھتا ہے۔۔۔وفاداری بدلنے میں بھی یہ انسانوں سے بالکل مختلف ہے۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر نہیں ہوتا۔ روز روز مالک نہیں بدلتا۔ کیونکہ اُسے شرمندگی پسند نہیں۔''

''ہاں ہاں ڈاکٹر میں تیری یہ وضاحت سمجھ چکا ہوں!'' میں نے سر ہلایا۔

میں نے بوٹا سے پوچھا ''یار بوٹا! جانوروں، خاص طور پر کتوں کے درمیان گھرے رہنے کے دوران کوئی انوکھا یا ناقابل فراموش واقعہ ہوا ہو۔۔۔؟؟''

''ہاں یار۔۔۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری اور دل پر ہاتھ رکھ لیا ''ایک دفعہ میں انعامی بانڈ سامنے رکھے انعامی نمبروں کی لسٹ چیک کر رہا تھا کہ میرا پانچ لاکھ روپے والا پہلا انعام نکل آیا میں خوشی سے مسرور تھا کہ ایک کلائنٹ آ گیا۔ ایک نہایت خوبصورت سیاہ کالا ڈوبر مین کتا تھا جس کے جسم پر نہایت خوبصورت سفید بڑے سپاٹ تھے جو عام طور پر نہیں ہوتے۔ اِدھر کتے کے مالک نے اسے میرے سپرد کیا اُدھر اس نے میرے ہاتھ میں پکڑا انعامی بانڈ منہ میں ڈال لیا۔ یہ وہ نسلی کتا ہے کہ جس کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ ''بون بریکر'' ہے یعنی انسانی ٹانگ منہ میں ڈال لے تو ہڈی توڑ دیتا ہے۔۔۔اس کے مالک نے سر دھڑ کی بازی لگا دی مگر وہ کمینہ میرا پانچ لاکھ نگل گیا۔ دل تو چاہا اسے کوئی ہمیشہ کی نیند سلانے والا ٹیکہ لگا دوں مگر پھر ۸۰۰ روپے فیس نہ ملنے کا خوف تھا پانچ لاکھ کا نقصان تو برداشت ہو گیا جیسے تیسے کر کے پانچ لاکھ آٹھ سو روپے کا نقصان میں کیونکر کرتا ڈاکٹر سب کچھ کر سکتا ہے اپنی فیس پر سودے بازی نہیں کر سکتا''۔ ڈاکٹر بوٹا نے سینہ تان کے پُرعزم لہجے میں کہا۔

مجھے اُس وقت وہ ایک کاروباری ڈاکٹر دکھائی دیا۔

ایک اور ماڈرن مالکن ایک نہایت چھوٹے سے کتے کو لے کر اندر داخل ہوئی۔

''ہائے ڈولی؟'' ڈاکٹر نے چہکتے ہوئے کہا۔

''ہیلو بوٹا'' وہ بولی اور اس نے اپنا کتا ڈاکٹر کی گود میں لٹا دیا اور ڈاکٹر کتے کا گال تھپتھپانے لگا اور میں سوچتا ہوا باہر نکل آیا کہ انسان نے خود کو ہر طرح سے بدل ڈالا کتے نے اپنا چلن کیوں نہیں بدلا؟ یہ کل بھی وفادار تھا، یہ آج بھی وفادار ہے۔ ہم نہ کل وفادار تھے، نہ ہی آنے والی صدی میں وفادار ہوں گے۔ دنیا پر غالب نیا ''وحشی'' ڈونلڈ ٹرمپ من مرضی کر رہا ہے ہم چپ۔۔۔ ہم شاید چپ ہی رہیں کہ بولنے کے لیے ''وفادار'' ہونا ضروری ہے؟

حافظ مظفر محسن کا تعلق لاہور سے ہے۔ بچپن سے لکھ رہے ہیں۔ بچوں کے ادب کے سلسلے میں اِن کی خدمات گراں قدر ہیں۔ طنز و مزاح اِن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ''طنز و مزاح'' کے عنوان سے ایک اخبار میں کالم بھی لکھتے ہیں۔ طنز و مزاح پر مبنی اِن کی کئی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ شاعری بھی کرتے ہیں، ایک عدد شاعری کی کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ لاہور کے ادبی محافل میں خاصے متحرک ہیں۔ برقی مجلّے ''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے اِن کی محبت ہمارے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔

نیاز محمد

کان انسانی جسم کا اہم عضو ہے۔ تعداد میں دو ہوتے ہیں۔ سر کے اطراف میں ہوتے ہیں۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سر کو پکڑے رکھتے ہیں۔ اونٹ کی طرح اس کی بھی کوئی کل سیدھی نہیں۔

مختلف جانداروں میں یہ مختلف سائز اور شکل کے ہوتے ہیں۔ سننے کے ساتھ ساتھ یہ مروڑنے کے کام آتے ہیں۔ جن کی نظر کمزور ہو تو اس کا خمیازہ بھی اسے بھگتنا پڑتا ہے اور عینک کو اپنے اوپر بٹھائے رکھتے ہیں۔

ناک کی طرح اسے بھی بہت سردی لگتی ہے۔ یہ حالات کی مناسبت سے اپنا رنگ بھی تبدیل کرتے ہیں۔۔۔ گھبراہٹ میں پیلے پڑ جاتے ہیں اور اگر مروڑے جائیں تو سرخ بھی ہو جاتے ہیں۔

کان کھڑے بھی ہوتے ہیں اور ایسی آوازیں سننے کی کوشش کرتے ہیں جو پہنچ سے باہر ہوں۔ بعض اوقات معمولی سی معمولی آواز بھی سن لیتے ہیں اور کبھی کان پڑی آواز بھی نہیں سن پاتے۔

کان کام کے جتنے پکے ہوتے ہیں اُتنے ہی کام چور بھی۔۔۔

صدارت کرنا بڑا مشکل کام ہے، لیکن دو چار جلسوں کی صدارت کر کے ہمیں یہ محسوس ہوا کہ اس کے لیے باقاعدہ مشق کی ضرورت ہے۔ لیکن مشکل کام یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اتنے جلسے نہیں ہوتے، جتنے یہاں صدر ہیں، اور صدارت کی امیدوار تو ان سے بھی زیادہ ہیں۔ اب ہمیں کو دیکھئے جہاں یہ سن گن پاتے ہیں کہ فلاں جگہ جلسہ ہونے والا ہے تو ہم جلسہ ہونے سے پہلے ہی مہتمم جلسہ بڑا سے ٹیلیفون پر یہ پوچھ لیتے ہیں کہ کیوں صاحب..... بھائی صاحب جلسے کا صدر کون ہوگا؟ اور جب مہتمم جلسہ..... صدر کا نام بتاتا ہے تو ساتھ ہی یہ پوچھ لیتے ہیں کہ کیوں صاحب مہمان خصوصی کا بھی کوئی بندوبست ہوا یا نہیں؟...... نیک بخت پھر بھی ہماری بات نہیں سمجھتا اور یہ کہتا ہے ابھی تو ہم نے مہمان خصوصی کے بارے میں ہم نے نہیں سوچا۔ اور پھر ہم ہی سے پوچھتا ہے کہ اگر آپ کے خیال میں کوئی معقول شخصیت ہو تو بتایئے۔ اب بتایئے کہ کوئی کیا بتائے۔

صدارت کروالو از نصر اللہ خان

اکثر باتوں کی خبر ہوتے ہوئے بھی بے خبر رکھتے ہیں۔

سننے میں آیا ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔۔۔ اگرچہ آج تک کسی نے دیکھے نہیں۔۔۔ اسی طرح صاحب کان بھی بعض اوقات بہت کچھ سننے سمجھنے سے رہ جاتا ہے اور بہت کچھ ہونے کے باوجود بھی اسے کانوں کان خبر نہیں ہو پاتی۔

پہاڑوں اور زمین کو کھود کر بھی ان میں کان بنائے جاتے ہیں۔ ان کانوں سے بہت کچھ نکلتا بھی ہے جو ہماری مختلف ضروریات پوری کرتے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ کان میں پن، بال پوائنٹ، ماچس کی تیلی یا اور کوئی نوک دار چیز پھیرنے سے منع بھی کیا جاتا ہے۔ سنا ہے اس کے اندر پردہ ہوتا ہے جو پھٹ جاتا ہے۔۔۔ آج کل ہم پردے کا بالکل خیال نہیں کرتے اور شوق سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ پہلے زمانے میں خواتین پردے کا بہت اہتمام کیا کرتی تھیں لیکن اب پتہ نہیں ان کے کانوں میں کیا پڑا ہے کہ سب کچھ بھول گئی ہیں اور پردہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ کانوں کے پردے اگر پھٹ جائیں تو آواز سننے کے قابل نہیں رہتے، خدا جانے عورتوں کا پردہ نہ کرنا کس قسم کی خرابی کا باعث بنے گا۔

اب تو ہر چیز "میڈی سیف پیکنگ" میں ملتی ہے اور بغیر پیکنگ کے کوئی چیز قبول نہیں کی جاتی کیونکہ گرد و غبار، گندگی، جراثیم اور موسمی اثرات سے خراب ہونے کا احتمال رہتا ہے، خواہ یہ کچھ بھی ہو۔

انسانی جان کبھی بہت قیمتی اور اہم ہوا کرتی تھی لیکن اب اس کی وہ وقعت اور قدر و منزلت نہیں رہی۔ اب اسے گاجر مولی کی طرح کاٹا جاتا ہے۔ اس کا خون بے دریغ بہایا جاتا ہے۔۔۔ اکنامکس کا ایک اصول ہے کہ جو چیز مقدار اور تعداد میں زیادہ دستیاب ہو اور مانگ کم ہو اس کے دام گر جاتے ہیں۔ انسانی جان بھی شاید اسی اصول کی نذر ہو گئی ہے، جس کی کوئی قیمت نہ ہو اسے اسی طرح ضائع کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے ایسی چیز کو پیکنگ کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔۔۔ ہو سکتا ہے صنف نازک کے کانوں میں یہ بات پڑی ہو اور اسی لیے انہوں نے پردہ کرنا چھوڑ دیا ہو۔

اب دیواروں کے اگر کان ہیں تو یہ بھی پتہ چل جائے گا اور اگر کسی کے کان بند ہیں ان کا بھی۔۔۔ کچھ کے تو کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی وہ کسی کو کانوں کان کیا خبر ہونے دیں گے، ویسے اگر کان بند ہو جائیں تو بروقت صفائی کر لینی چاہیئے۔ خود نہیں۔۔۔ کسی مستند معالج سے۔

نیاز محمود صاحب کا تعلق چھوٹا لاہور صوابی سے ہے۔ ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ سے ایم۔ فل کیا ہے، مقالے کا عنوان تھا "قدرت اللہ شہاب کی نثر کے فنی محاسن" ناردرن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی جاری ہے۔ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ انشائیہ، افسانہ لکھنے میں دلچسپی ہے۔ طنز و مزاح سے بھی دلچسپی ہے جو انہیں "ارمغانِ ابتسام" کی طرف لے آیا ہے۔

خرباش

عائشہ تنویر

پچھلے دِنوں خبرنامہ ”خر نامہ“ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ہمارا مطلب ہے کہ ہر دوسرے دن گدھوں کی درآمد، برآمد ہی خبروں کا موضوع ہوتی تھی۔ کبھی گدھے ملک سے باہر بھیجے جاتے ،ان کی کھال استعمال کی جاتی تو کبھی وہ کسی ہوٹل کے فریزر سے برآمد ہو جاتے۔ جب اتنا ذکر سنا تو ہم نے بھی غور کیا کہ ہمارے بچپن کی نسبت اب ملک میں گدھوں کی کمی ہے۔ واضح رہے کہ ہم چار ٹانگوں والے گدھوں کی بات کر رہے ہیں، دو ٹانگوں والے گدھوں کی تیزی سے بڑھتی آبادی تو گدھے بھی جانچ لیں۔

پنجاب فوڈ اتھارٹی کی رپورٹ اور اصلی ،نسلی گدھوں کی کمی نے ہمیں تشویش میں مبتلا کر دیا۔ عالم تشویش میں سوچا کہ گدھے پورے گدھے ہوتے ہیں، پھر بھی اتنی عقل رکھتے ہیں کہ انسان نہ کھائیں تو گھاس نہ کھانے کے دعوے کرنے والا انسان کیونکر گدھا نوش جاں کر لیتا ہے۔ شاید اس لیے کہ گدھے کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے۔ اس کی گواہی وہ تمام افراد دیتے ہیں جو بخوشی گدھا بن چکے ہیں۔ ہمارا مطلب گدھے کا گوشت کھا چکے ہیں۔

ہمیں پرانے دور کے وہ سہانے دن یاد آئے جب ہر طرف امن وامان تھا۔ باہر نکلنے والے گدھوں کو جان کا خوف لاحق نہ تھا سوا کثر ہی چہلیں کرتے نظر آتے۔ اُس دور کے گدھے تقریریں کرنے نہیں نکلتے تھے بلکہ وہ درویش صفت جانور اپنے مالک کے ساتھ بار برداری کے لیے سر جھکائے نکلتے اور پھر سڑک کے عین درمیان میں گدھا گاڑی چھوڑ کر مالک صاحب فرصت سے غائب ہو جاتے اور گدھے میاں اپنی ازلی سادگی کی بدولت سر جھکائے اطراف کی ٹریفک جام کیے وہیں کھڑے رہتے۔ کوئی لاکھ ہارن بجائے، گدھے کے سامنے آ کر منتیں کرے، مجال ہے وہ فقیر صفت جانور نظر اٹھا کر دیکھ لے۔ اتنی بے نیازی کے باوجود حضرت کی دولتی کی ہیبت یوں دل پر طاری ہوتی کہ کوئی انہیں ہٹانے کے لیے زبردستی کرنے کی ہمت خود میں نہ پاتا۔ جب تک کہ مالک خود آ کر اپنی شاہی سواری آگے نہ بڑھاتا۔ لیکن اب تو گدھوں کی کڑاہی بننے کے ڈر سے مالک انہیں لمحہ بھر کو تنہا نہیں چھوڑتے۔

جوابی اظہارِ محبت کے لیے گدھے بھی مالک کو تنہا نہیں چھوڑتے۔ دہری، تہری ذمہ داریاں نبھاتے، کبھی لیاری کی گدھا ریس میں شریک ہو کر مالک کی تفریح طبع کا باعث بنتے ہیں، تو کبھی اپنی ذمہ دار طبیعت کے مطابق گھر بھر کا بوجھ خود ڈھوتے ہیں۔ کبھی دو پل کو مالک الگ ہو جائے تو وہ شور ڈالتے ہیں کہ اردگرد کے لوگ دست بستہ مالک کی خدمت میں حاظر ہو جاتے ہیں۔

امریکہ میں سمندری طوفان SandyHurricane نے تباہی مچائی ہوئی ہے،اس سے پہلے Katrina نام کے طوفان نے بھی کافی تباہی مچائی تھی۔امریکہ میں یہ طوفانوں کے نام خواتین کے نام پر خوب رکھے جاتے ہیں اور حیرت ہے وہاں کی خواتین اعتراض بھی نہیں کرتیں۔اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے اس خطے کو طوفانوں سے محفوظ رکھا ہے ہاں البتہ ہمارے ہاں انسانوں کو مارنے کے دوسرے اسباب موجود ہیں۔اگر خدانخواستہ اس خطے میں بھی طوفانوں کا سلسلہ ہوتا اور اس کے نام بھی خواتین کے نام پر ہوتے تو بریکنگ نیوز کچھ اس طرح کی ہوتیں:

''بنگال سے اٹھنے والی ''نرگس'' آج رات چاٹگانگ کے ساحل سے ٹکرائے گی۔بحیرہ عرب میں پیدا ہونے والی ''وینا ملک'' نے ممبئی کے ساحل سے ٹکرا کر بڑی تباہی مچائی ہے۔بھارت کے پردھان منتری نے مہاراشٹر کے عوام کو مبارک باد دی ہے کہ انہوں نے ''وینا ملک'' کا بہادری سے مقابلہ کیا ہے۔بحر ہند سے اٹھنے والی ''ریما'' بڑی تیزی کے ساتھ مکران کے ساحل کی طرف بڑھ رہی ہے۔بلوچستان کے وزیر اعلیٰ نے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ ''ریما'' سے بچنے کے لئے حفاظتی اقدامات کریں۔''

حنیف سما

''محنت میں عظمت'' گدھوں کا موٹو ہے۔تمام گدھے بہت محنتی ہوتے ہیں لیکن تمام محنتی گدھے ہرگز نہیں ہوتے۔اتنی محنت کے باوجود گدھوں کو گھوڑوں کے برابر مقام نہ دینا دراصل حضرت انسان کی حسن پرستی ہے کیونکہ اپنی سادگی پسند طبیعت کے باعث وہ گھوڑوں کی طرح ذاتی آرائش پر توجہ نہیں دیتے۔

ایک بار ہم نے کسی سے گدھوں کی اقسام پوچھیں تو انہوں نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا ''گدھوں کی بہت اقسام ہیں لیکن ان سب میں ایک بات مشترک ہے۔''

''وہ کیا؟'' ہم مارے تجسس کے پاس سرک آئے۔

''سب کے سب گدھے ہوتے ہیں۔'' سوٹا لگاتے اُنہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔

یوں تو گدھے کی شان ظاہر کرنے کے لیے یہ مقولہ ہی کافی ہے ''خر باش، برادر خرد مباش۔'' (گدھا بن جاؤ، چھوٹا بھائی نہ بنو۔) اس جملے میں موجود گدھے پن کے لیے ترغیب محسوس کر کے ہم ہمیشہ ہی گدھوں کو بہت معتبر خیال کرتے۔اسی لیے کسی کو بھی اس اعلیٰ مرتبت ہستی سے نہیں ملاتے مگر سب کے دل تو ہماری طرح اچھے جذبات سے مزین نہیں ہوتے۔

ایک بار کسی نے کرپٹ سیاستدانوں کو گدھا کہہ دیا۔برا لگنے والی بات تھی سو بہت بری لگی۔تمام گدھوں نے شدید احتجاج کر کے شہر کا نظام زندگی معطل کر دیا۔

تقاریر میں اپنی ایمانداری اور وفاداری کا حوالہ دیتے ایک گدھا تو بے اختیار رو دیا۔''کمہار پر بس نہ چلا گدھی کے کان اینٹھے، انسانی فلاح کے لیے ہماری اتنی خدمات کے باوجود ہمیں کرپٹ سیاست دانوں سے ملایا گیا۔''

دوسرے گدھے نے تو صاف صاف انسان کہلانے سے ہی انکار کر دیا ''نیکی برباد گناہ لازم، آخر محنتی اور مضبوط قوت ارادی کے مالک ہوتے ہوئے ہم ناروا کلمات کیوں برداشت کریں۔''

انسان بھی انسان ہیں، اپنی ہزار خامیوں کے باوجود اشرف المخلوقات ہونے کا زعم نہیں جاتا سو وہ بھی گدھا کہلانا پسند نہیں کرتے۔ایک بار ہمارے بھولے بھالے کولیگ کو کسی نے گدھا کہہ دیا۔غصے سے نتھنے پھلا کر بیٹھ گئے، ہم نے بہتیرا سمجھایا ''گدھا کیا جانے زعفران کا بھاؤ۔۔ کہنے والا آپ کے مقام سے کہاں واقف ہے۔''

بات نہ بنی تو یہ بھی کہہ ڈالا ''شاید انہوں نے آپ کے کسرتی جسم اور تندہی سے کام کی ادائیگی کرنے کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔'' لیکن ان کا بگڑا مزاج ٹھیک نہ ہوا۔آخر ہم نے ٹرمپ کا پتہ نکالا۔''امریکہ کی ڈیموکریٹک پارٹی کا علامتی نشان گدھا ہے۔شاید وہ آپ کو امریکن شہریت اور حکومت کا اہل سمجھتے ہیں۔آپ بس ان کی زبان مبارک ہونے کی دعا کریں۔''

وہ واقعی خر دماغ واقع ہوئے تھے یا گرین کارڈ کا ہرا ہرا من کو بھا گیا۔بہرحال ہماری قینچی سی چلتی زبان نے کام کر دکھایا۔اس بات پر بے اختیار اش اش کرتے وہ اللہ سے گدھوں کے دیس جانے کی دعا مانگنے لگے۔

عائشہ تنویر صاحبہ کا تعلق کراچی سے ہے۔محترمہ نے ریاضی میں ایم ایس سی کیا ہوا ہے۔میدان ادب میں نو وارد ہیں لیکن اندازِ بیان کی پختگی سے ''دوڑ'' کے معیار کا پتہ چلتا ہے۔طنز و مزاح، بچوں کی کہانیاں اور سماجی، معاشرتی موضوعات کو تختۂ مشق بنایا ہے۔مختلف جرائد کے لیے لکھتی ہیں۔ارمغان ابتسام کے لیے یہ ان کی پہلی تحریر ہے۔

خادم حسین مجاہد

پرچۂ سیاست

کُل نمبر: عوام کی تعداد کے برابر۔
کامیابی کے نمبر: سیاستدانوں کی تعداد کے برابر۔
وقت: پانچ سال (اسمبلی ٹوٹنے کی صورت میں پرچہ پہلے بھی چھینا جاسکتا ہے)
نوٹ: چیٹنگ پر ایمرجنسی نافذ کر دی جائے گی۔ زیادہ بیان بازی، دھاندلی، بار بار لڑ جھکنے اور ہارس ٹریڈنگ پر زیادہ نمبر ملیں گے۔ امیدوار کے پاس سے شرافت، انسانیت یا ضمیر نامی چیز برآمد ہونے کی صورت میں پرچہ کینسل کر دیا جائے گا، غیر پارلیمانی الفاظ کا استعمال منع ہے، امیدوار اپنا لوٹا ہمراہ لائیں اور جوابی کاپی پر اپنے لفافے اور لوٹے کا نمبر واضح طور پر درج کریں۔

سوال نمبرا: خالی جگہ پر کریں؟
ا۔ ہر شخص ۔۔۔۔۔۔کا دیوانہ ہے۔ (حسن ۔ دولت ۔ کرسی ۔ جائیداد)
۲۔ سیاستدانوں کا انجام عموماً ۔۔۔۔۔ ہوتا ہے۔ (خوشگوار ۔ عبرت ناک ۔ یادگار)
۳۔ الیکشن ہر دو ۔۔۔۔ بعد ہونے چاہئیں۔ (ماہ ۔ صدی ۔ سال ۔ گھنٹے)
۴۔ ۔۔۔۔جلدی رنگ بدلتا ہے۔ (گرگٹ ۔ سیاستدان ۔ موسم ۔ محبوب)
۵۔ موٹروے کی تعمیر سے ہم ۔۔۔۔ صدی میں پہنچ گئے ہیں۔ (انیسویں ۔ بیسویں ۔ اکیسویں)

۶۔۔۔۔۔۔۔۔زیادہ وفادار ہوتا ہے۔(گھوڑا۔سیاستدان ۔کتا)

۷۔کشمیر ۔۔۔۔۔۔۔ سے آزاد ہوگا (بیانات۔ جنگ ۔باتوں۔اعلان لاہور۔)

۸۔لاہور دہلی بس سروس سے بھارت اور پاکستان کے عوام میں ۔۔۔۔۔میں اضافہ ہوا۔(نفرت۔محبت۔فلرٹ)

۹۔محبت اور ۔۔۔۔ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔(جنگ ۔بجٹ۔سیاست)

۱۰۔ریڈیو اور ٹی وی حکومت کے۔۔۔ہوتے ہیں۔(ناقد۔ رہنما۔ترجمان۔کاسہ لیس)

۱۱۔ ماسٹر علم دین کا ووٹ مجھے گنوار کے ووٹ سے ۔۔۔۔۔ہوگا۔ (بڑا۔چھوٹا۔برابر)

۱۲۔ہم ہر جنگ میدان میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کر میز پر ۔۔۔۔۔۔۔جاتے ہیں(ہار۔جیت)

۱۳۔شکاری صدر کا شکار کیا ہوا، ایک ایک پرندہ قوم کو۔۔۔۔ میں پڑتا ہے۔(سینکڑوں۔ہزاروں۔لاکھوں)

۱۴۔ سقوط ڈھاکہ کی ذمہ داری ۔۔۔۔۔۔ پر عائد ہوتی ہے۔(فوج۔سیاستدانوں۔عوام۔عمران خان)

۱۵۔۔۔۔۔۔۔۔حکومت سب سے بہتر ہے۔(زنانہ۔ مردانہ۔ہیجڑوں کی)

۱۶۔ہم پر حکمرانی دراصل ۔۔۔۔۔۔۔نے کی ہے۔(امریکہ ۔فوج۔آئی ایم ایف)

۱۷۔۔۔۔۔۔۔میں لڑائی قانوناً جائز ہے۔(باکسنگ رنگ۔ اسمبلی۔نیوز چینل)

۱۸۔ وعدہ کر کے مکر جانا ۔۔۔۔۔۔۔کی خصلت ہے۔ (محبوب۔سیاستدان۔مقروض)

۱۹۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔وہ چھڑی ہے جس سے لیڈر قوم کو ہانکتا رہتا ہے۔(چمچہ گیر۔پولیس۔جاگیردار)

۲۰۔ قانون نافذ کرنے والوں کے لئے تعلیم کی شرط ۔۔۔۔۔جبکہ قانون بنانے والوں کے لئے۔۔۔۔۔(ہے۔نہیں ہے)

۲۱۔ظلم سہنے والوں کو گھر کے اندر۔۔۔۔۔ اور گھر کے باہر۔۔۔۔۔کہتے ہیں۔(عوام۔شوہر۔ووٹر۔لیچڑ)

سوال ۲: درست اور غلط جملے کی نشاندہی کریں۔

۱۔شریف آدمی آسانی سے الیکشن جیت سکتا ہے۔

۲۔الیکشن اور دھاندلی لاچولی دامن کا ساتھ ہے۔

۳۔پارٹی کے پرچم بنوانے سے بہتر ہے اپنے کپڑے بنائے جائیں۔

۴۔ لوگوں کی لاٹھی لوگوں کے سر مارنے کا نام جمہوریت ہے۔

۵۔ سیاستدان ہر وقت لوگوں کی خدمت کے لئے کمر بستہ رہتے ہیں۔

خط کی کئی قسمیں ہیں۔سیدھے خط کو خطِ مستقیم کہتے ہیں۔چونکہ یہ بالکل سیدھا ہوتا ہے اس لئے سیدھے آدمی کی طرح نقصان اٹھاتا ہے۔ تقدیر کے لکھے خط کو خطِ تقدیر کہتے ہیں، جسے فرشتوں نے سیاہی سے لکھا ہوتا ہے۔اس لئے اس کا مٹانا مشکل ہوتا ہے۔جس خط میں ڈاکٹر صاحب نسخے لکھتے ہیں اور جو کسی سے پڑھے نہیں جاتے اسے ''خطِ شکستہ'' کہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آج کل لوگ بیماریوں سے زیادہ نہیں مرتے بلکہ غلط دوائیوں سے مرتے ہیں۔

خط کی دو قسمیں اور بھی ہیں مثلاً حسینوں کے خطوط۔۔۔یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک وہ جو حسینائیں اپنے چاہنے والوں کے نام لکھتی ہیں، جن میں دنیا کے اُس پار جانے کا ذکر ہوتا ہے جہاں ظالم سماج دو محبت کرنے والوں تک نہ پہنچ سکے۔

دوسرے ''حسینوں کے خطوط'' یعنی نقش و نگار جن کی بدنمائی چھپانے کے لئے ہر سال کروڑوں روپے کی کریمیں، لوشن، پاؤڈر اور پرفیومز وغیرہ استعمال کر لئے جاتے ہیں۔

''ابتدائی حساب'' از ابن انشاء

ایک کُل پاکستان مشاعرے میں ایک فوجی جرنیل صدر بنا دیئے گئے۔۔ان کی رعب اور طنطنے کا کچھ ایسا عالم تھا کہ دس پندرہ منٹ تک سامعین کو کھل کر داد دینے کی ہمت نہیں پڑی۔۔اتفاق سے ایک شاعر نے بہت ہی اچھا شعر سنایا۔۔سامعین کے درمیان میں سے ایک نوجوان تڑپ کر اٹھا اور بولا "مکرر ارشاد فرمایئے۔۔"

اس کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگوں نے بھی مکرر مکرر کے نعرے بلند کیے۔۔صاحب صدر نے اسٹیج سیکریٹری سے پوچھا کہ "یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟"

اسٹیج سیکریٹری نے ادب سے کہا کہ "جناب! یہ شاعر سے کہہ رہے ہیں کہ یہی شعر دوبارہ سناؤ۔۔"

اس پر جرنیل صاحب نے اپنے سامنے رکھا ہوا مائیک اٹھایا اور یوں گویا ہوئے "کوئی مکرر وکرر نہیں ہوگا۔۔شاعر صاحب آپ کے والد کے نوکر نہیں ہیں۔۔سننا ہے تو پہلی بار دھیان سے سنو۔۔"

"چشم تماشا" از امجد اسلام امجد

۶۔جمہوریت کے طرز انتخاب میں ایک مخبوط الحواس اور ایک مردِ ہوش مند کی رائے برابر ہوتی ہے۔

۷۔عوام کی تھالی میں کھانے اور پھر چھید کرنے والے کو سیاستدان کہتے ہیں۔

۸۔سیاستدان ہمیشہ وعدہ پورا کرتا ہے

۹۔ہر حکمران آسانی سے کرسی چھوڑ دیتا ہے۔

۱۰۔موت کے وقت اور سیاست دان کا کوئی اعتبار نہیں۔

۱۱۔وزارت وہ واحد ملازمت ہے جس میں تعلیم کی کوئی قید نہیں۔

۱۲۔سیاسی جلسے اور سٹیج ڈرامے میں کوئی فرق نہیں۔

۱۳۔ہماری سیاست لوٹے اور واش روم تک پہنچ گئی ہے۔

۱۴۔ٹیکس وہ عمل ہے جس میں عوام کے گوشت سے کباب بنا کر انہیں کو دے دئے جاتے ہیں جبکہ باقی خود کھا لئے جاتے ہیں۔

۱۵۔سیاست دان چھینک بھی قوم کے وسیع تر مفاد میں لیتے ہیں۔

۱۶۔سیاست دان کا فرات سے کوئی تعلق نہیں۔

۱۷۔اسمبلی کے اجلاس ملک میں غیر پارلیمانی الفاظ عام کرنے اور قوم کے اخلاق تباہ کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

۱۸۔ہیروئن کلچر، کلاشنکوف کلچر، ٹیکس کلچر اور کیبل کلچر فوجی ادوار کی سوغاتیں ہیں۔

۱۹۔چھچھ گیر دراصل عوام میں موجود میر جعفر اور میر صادق ہیں جو ذاتی مفاد کے لئے رائے عامہ کو گمراہ کرتے ہیں۔

۲۰۔اسمبلی وہ جگہ ہے جہاں قانون بنائے جاتے ہیں، صرف اسمبلی سے باہر بیٹھنے والوں کے لئے۔

۲۱۔ظلم، ناانصافی، استحصال اندھے کو بھی دکھائی دیتے ہیں۔

۲۲۔حکومت اور اپوزیشن کا مفاہمی فارمولہ ہوتا ہے کہ آدھا مل کر کھائیں۔

۲۳۔سیاست میں جانوروں کا عمل دخل انسانوں کے لئے باعث فخر ہے۔

۲۴۔سیاسی جنگ اور نورا کشتی میں کوئی فرق نہیں۔

۲۵۔جب کشمیر جل رہا تھا تو نہرو کرکٹ کھیل رہا تھا۔

سوال ۳: درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

۱۔اسمبلی ٹوٹنے اور دل ٹوٹنے میں کیا فرق ہے؟

۲۔سیاست دانوں کا پسندیدہ کھیل کونسا ہے؟

۳۔اَن پڑھ سے اَن پڑھ آدمی بھی سیاست پر گھنٹوں بول سکتا ہے، اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟

۴۔ایک سیاسی جلسے میں اوسطاً کتنی جیبیں کٹتی ہیں؟ اور کتنے پیٹ؟

۵۔ہماری سیاست اور میوزیکل چیئر میں کیا قدر مشترک ہے؟

۶۔کرکٹر وزیراعظم نے اپنے دورِ حکومت میں کتنے ارب کی کرکٹ کھیلی؟

۷۔ہر سیاست دان اداکار ہوتا ہے لیکن ہر اداکار سیاست دان نہیں ہوتا کیوں؟؟ اداکار کا شو مہنگا پڑتا یا سیاست دان کا؟

۸۔ اس کھیل کا نام بتائیں جس کا کوئی قانون نہیں جس کے کھلاڑیوں میں سپورٹ مین سپرٹ سرے سے موجود نہیں جو کھیلا جاتا ہے نہ کھیلنے دیا جاتا ہے؟

۹۔ حکومت اور اپوزیشن عوامی دولت کے علاوہ اور کس کس بات میں ایک دوسرے سے متفق ہوتی ہے؟

۱۰۔ اگر تمام سیاست دان اور اداکار مکمل ٹیکس ادا کریں تو پاکستان کون کون سے یورپی ملک خرید سکتا ہے؟

۱۱۔ نت نئی غیر ملکی سیاسی فلمیں دیکھنے والوں کو اپنا وی سی آر کب نصیب ہوگا؟

۱۲۔ الیکشن سے قبل کتوں اور بلیوں کی موت کی تعزیت کے لئے آنے والے امیدوار الیکشن کے بعد ووٹروں کی تعزیت کے لئے کیوں نہیں آتے؟

۱۳۔ اگر کسی وزیر کے پیر میں کانٹا چبھ جائے تو وہ کس یورپی ملک سے علاج کروائے گا؟

پرچہ سیاست۔ جزو ۲

سوال نمبر۱: درج ذیل مختصر سوالات میں سے آٹھ کے تفصیلاً جوابات دیں۔ (تمام سوالات لازمی ہیں)۔

۱۔ اگر فوج سیاست کرے تو دفاع کون کرے گا؟

۲۔ حکومتوں کی مضبوط کرسیاں اچانک سے ٹوٹ کیسے جاتی ہیں؟

۳۔ مقبول سیاست دانوں کی رخصتی پر کوئی آنسو بہانے والا کیوں نہیں ہوتا؟

۴۔ اگر خواص کے گھوڑے اور کتے سیب کے مربے کھائیں تو بھوکی عوام کیا کھائے؟

۵۔ حکمرانوں کے چاروں طرف دیوارِ خوشامد کیوں بن جاتی ہے؟

۶۔ کیا محلوں میں بیٹھ کر جھونپڑیوں والوں کی کالی شب دیکھی جاسکتی ہے، اگر ہاں تو کیسے، اگر نہیں تو کیوں نہیں؟

۷۔ سیاست میں گدھے کو باپ بنانے کے دس رائج الوقت طریقے بیان کریں۔

۸۔ اگر ایک حکومت اپنے دشمن کو اس کے باغیوں کی لسٹیں فراہم کرے تو دوسری کیا کرے گی؟

۹۔ اگر ایک حکومت سرے محل خریدے تو دوسری کیا خریدے گی؟

۱۰۔ انسان نے سیاست شیطان سے سیکھی یا شیطان نے انسان سے، تاریخی حوالوں سے واضح کریں؟ نیز یہ بھی بتائیں کہ کیا آدم کو جنت سے نکلوانے کے لئے شیطان کی اختیار کردہ حکمت عملی کو سیاست کہہ سکتے ہیں؟

۱۱۔ ایک مقبول سیاست دان بننے کے لئے کتنے جرائم کرنا، کتنے شر انگیز جلسے کرنا اور کتنی بار جیل جانا ضروری ہے، اعداد وشمار سے، واضح کریں نیز یہ بھی بتائیں کہ سیاستدان بار بار جیل جانا کیوں پسند کرتے ہیں، اگر ہر مجرم کو جیل میں وہی سہولتیں دی جائیں جو سیاستدانوں کو دی جاتی ہیں تو جرائم میں کتنے فی صد اضافہ ہوگا؟

۱۲۔ ''بال اتارو گنج سنوارو سکیم'' پر مفصل نوٹ لکھیں اور بتائیں کہ عوام کے بال اتار اتار کے کس کس کا گنج سنوارا گیا؟ کیا خواص میں سے بھی کسی نے اس اسکیم میں حصہ لیا؟

سوال نمبر۲: مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیں؟

استحقاق، احتساب، سروے فارم، سی ٹی بی ٹی، ڈبل سواری، تحریک نجات، مہنگائی، عبوری حکومت، آئین، لانگ مارچ، دھرنا، لاٹھی چارج، لوٹا کریسی، فلور کراسنگ، کالا باغ ڈیم، ہارس ٹریڈنگ، رول بیک، ہیوی مینڈیٹ، غیر ملکی دورے، منی بجٹ۔

سوال نمبر۳: ہماری سیاست ایٹمی سیاست ہے اور سیاست دان تابکار عناصر جو وقتاً فوقتاً سیاسی آلودگی کا باعث بنتے ہیں اس بیان کی حمایت یا مخالفت میں دلائل سے بھرپور مقالہ لکھیں نیز یہ بھی بتائیں کہ ایٹم بم کا سیاست سے کیا تعلق ہے؟ ایٹمی پروگرام رول بیک کرنے کے لئے فوجی حکومت موزوں ہے یا عوامی؟

سوال نمبر۴: اگر ایک سیاستدان نے الیکشن کمیشن میں پچاس شہروں اور اسی دیہات کے دورے کیے ہوں تو وہ اقتدار میں آکر

کتنے غیر ملکی دورے کرے گا؟

سوال نمبر۵۔ اگر عوامی حکومت کے پچاس وزیر اور پچھتر مشیر ہوں تو فوجی حکومت کے کتنے وزیر اور مشیر ہوں گے جبکہ وہ سادگی کی علمبردار بھی ہو،نسبت،تناسب کی مدد سے حل کریں؟

سوال نمبر۶: مندرجہ ذیل محاروات کو جملوں میں استعمال کریں؟

فصلی بٹیر، تھالی کا بینگن، بے پیندے کا لوٹا، چڑھتے سورج کی پوجا کرنا،طوطا چشمی، اپنا اُلو سیدھا کرنا، ضمیر فروشی۔

سوال نمبر۷: خوردبینی مشاہدے کے ذریعے ملک میں کرپشن سے پاک کوئی محکمہ تلاش کرنے کی کوشش کریں اور کرپشن کی پچپن سالہ تاریخ پر مفصل نوٹ لکھیں نیز یہ بھی بتائیں کہ نصف صدی کی لوٹ مار کے باوجود یہ ملک قائم کیسے ہے اور اسے ملک کے فوجیوں نے زیادہ نقصان پہنچایا یا سیاستدانوں نے۔

سوال نمبر۸: کمیشن اور مہنگائی میں کیا تعلق ہے ؟ دس فیصد کمیشن کے باعث بجلی کتنے سو فی صد مہنگی ہوئی؟ پٹرول کی قیمت بڑھنے سے آٹا کیوں مہنگا ہو جاتا ہے۔اگر عالمی منڈی میں پٹرول کی قیمت کم ہو تو پاکستان میں کتنے گنا اضافہ ہوگا؟

سوال نمبر۹: مزاح کی نئی صنف سیاسی مزاح پر مفصل نوٹ لکھیں جس میں حوالے کے طور پر مختلف سیاستدانوں کے مزاحیہ بیانات اور تقاریر کے اقتباسات بھی درج کریں؟

سوال نمبر۱۰: کرسی کتنے ہارس پاور کی ہوتی ہے؟ اسے گرانے کے پچاس طریقے لکھیں؟

سوال نمبر۱۱: اگر ایک امیدوار نے الیکشن سے قبل دس لاکھ کا قرض واپس کیا ہو تو الیکشن کے بعد وہ کتنا قرض لیکر معاف کرائے گا؟

سوال نمبر۱۲: ایسے ایک سو ایک تیر بہدف نسخے لکھیں جس کی مدد سے ممبران اسمبلی اپنے حلقے کے لوگوں کو ٹالتے ہیں؟

سوال نمبر۱۳: لوٹے کی مذہبی اہمیت اور روزمرہ استعمال پر مفصل نوٹ لکھیں اور اس کے سیاسی استعمال کی مذمت کریں نیز لوٹا بم جیسی ایجادات کا مفصل ذکر کریں؟

> حفیظ صاحب اپنے بقول ساتویں جماعت سے بھاگے ہوئے تھے۔انگریزی جتنی سیکھی تھی زندگی اور انگریز بیوی سے سیکھی تھی۔ انگریزی ناول بہت پڑھتے تھے۔سفر میں بھی انگریزی کتابیں ساتھ رہتی تھیں۔ انگریزی روانی سے بول نہیں سکتے تھے البتہ انگریزی میں روانی سے لڑ سکتے تھے۔ ہماری انگریزی کی چار سطریں نہیں چلنے دیتے،انگریزی میں لکھ نہیں سکتے مگر انگریزی میں اصلاح دے سکتے تھے۔ان کی اصلاح لفظوں کی جنگ ہوتی تھی۔ ان کے نزدیک ایک وقت میں ایک لفظ ایک ہی مفہوم ادا کر سکتا تھا۔اگر نہیں کر رہا تو لفظ کو کاٹ کر کہیں گے''میری جان کوئی اور لفظ لاؤ۔۔۔لفظ موجود ہے بس چھپا ہوا ہے۔ڈھونڈھو،ڈھونڈھو،بات بنی نہیں،تم تھک گئے ہو۔''
>
> ''ضمیر حاضر ضمیر غائب'' از سیّد ضمیر جعفری

سوال نمبر۱۴: ایک سیاستدان ایک گھنٹے میں دو سو وعدے کرتا ہے اس کے وعدے کرنے کی رفتار فی سیکنڈ معلوم کریں نیز مثالوں سے واضح کریں کہ سیاستدانوں کے وعدوں پر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ ''جو بھونکتے ہیں وہ کاٹتے نہیں۔''

سوال نمبر۱۵: اگر ہر ممبر اسمبلی ایک لاکھ روپیہ ماہانہ تنخواہ وغیرہ لیتا ہو اور سال میں اسمبلی دو قوانین تیار کرتی ہو تو ایک قانون عوام کو کتنے میں پڑتا ہے جبکہ قومی اسمبلی کی نشستوں کی تعداد ۲۱۷ ہو؟

سوال نمبر۱۶: آٹھویں ترمیم اب تک کتنی اسمبلیوں کو شہید کر چکی ہے ہر ایک کا مفصل حال قلمبند کریں اور بتائیں کہ ہر شہادت قوم کو کتنے میں پڑی؟ نیز آٹھویں ترمیم کی پیدائش اور موت کا حال لکھیں؟

سوال نمبر۱۷: آئندہ الیکشن کے لئے کم از کم پچیس نئے نعرے گھڑیں جن کی مدد سے عوام کو پھر بے وقوف بنایا جا سکے؟

سوال نمبر۱۸: سیاسی علماء ،ادباء، شعراء اور صحافیوں کے سیاست پر اثرات کے بارے میں مفصل نوٹ لکھیں؟

سوال نمبر۱۹: ایک الیکشن میں ایک امیدوار ایک لاکھ آبادی کو بیوقوف بناتا ہے تو وہ ایک ماہ بعد واپس آنے والی پارٹی میں آجاتا ہو تو اس نے ایک ماہ میں کتنی پارٹیاں بدلیں، باقائدہ قاعدے کی

مدد سے حل کریں؟

سوال نمبر۲۰: ایک رکن اسمبلی حکومت سے ملنے والی گرانٹوں میں سے سالانہ بیس کروڑ خورد برد کرتا ہے، پانچویں سال اس کا بینک بیلنس کیا ہوگا جبکہ اس نے پچاس کروڑ کا قرض بھی لیکر معاف کرایا ہو؟

سوال نمبر۲۱: ایک سیاستدان ہر دو دن بعد پارٹی بدلتا ہے اگر وہ ایک ماہ بعد واپس پہلی والی پارٹی میں آجاتا ہو تو اس نے ایک ماہ میں کتنی پارٹیاں بدلیں اکائی کے قاعدے کی مدد سے حل کریں؟

سوال نمبر۲۲: ایک الیکشن میں ایک امیدوار ایک لاکھ آبادی کو بیوقوف بناتا ہے تو آیندہ الیکشن میں وہ کتنی آبادی کو بیوقوف بنائے گا، جبکہ آبادی میں اضافے کی شرح تین فیصد سالانہ ہے؟

سوال نمبر۲۳: اگر ایک قومی اسمبلی کے ممبر کے لئے تعلیم شرافت، قابلیت، اور دیانت کی شرائط رکھی جائیں تو کتنے سیاستدان نااہل قرار پاجائیں گے؟ اعداد و شمار سے واضح کریں۔

سوال نمبر۲۴: مندرجہ ذیل مساوات کو حل کریں

طوطا چشمی۔ضمیر فروشی ۔ فریب کاری ۔ خودغرضی

خرمستی۔ بددیانتی۔ وعدہ خلافی۔ عیش پرستی۔

سوال نمبر۲۵: فرض کریں آپ قومی اسمبلی کے ممبر ہوں تو؟

ا۔کسی بیروزگار کے لئے کیسا رقعہ لکھیں گے کہ وہ مطمئن بھی ہوجائے اور اسے ملازمت بھی نہ ملے۔

۲۔ طویل عرصے سے اپنے حلقے میں غیر حاضری پر کیا تقریر کرکے اپنے ووٹروں کو مطمئن کریں گے۔

۳۔ملک میں کوئی بڑا حادثہ ہونے پر آپ کیا بیان دیں گے۔

۴۔ایک رفاہی ادارے کے ارکان چندے کے لئے آپ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، انہیں کیسے ٹالیں گے۔

۵۔ پارٹی بدلنے پر لوگوں کو کیسے مطمئن کریں گے۔

۶۔ سیاست میں اِن رہنے کے لئے آپ وقتاً فوقتاً کیا بیانات دیتے رہیں گے۔

۷۔ دوسری پارٹی کی حکومت میں اپنے کام کیسے نکلوائیں گے۔

۸۔ بچوں کی رشتہ داریاں اپنی پارٹی میں کریں گے یا دوسری پارٹیوں میں؟

۹۔مخالف امیدوار پر آپ کون کون سے مقدمات درج کروائیں گے؟

۱۰۔کس کس بات پہ آپ کا استحقاق مجروح ہوگا؟

۱۱۔آپ اسمبلی کے اسپیکر کا زیادہ احترام کریں گے یا مسجد کے لاؤڈ سپیکر کا؟

۱۲۔وزارت نہ ملنے پر پارٹی لیڈر کو کن طریقوں سے بلیک میل کریں گے؟

۱۳۔کون کون سی اداکاراؤں کے سر پر ”دستِ شفقت“ رکھیں گے؟

۱۴۔اِضافی آمدنی کس ملک میں رکھنا پسند کریں گے اور کیوں؟

۱۵۔اپنے کتنے رشتہ داروں کو زرخیز نوکریاں دلوائیں گے؟

ہدایات: اگر آپ سگریٹ نہیں پیتے، مطلب یہ کہ ابھی تک تھکے نہیں ہیں تو ”زبانی امتحان“ کے لئے بغیر کسی سمن کے انتظار کے بمع پروٹوکول نیب کے دفتر تشریف لے آیئے تاکہ کلین چٹ دیئے جانے تک آپ کو اپنی آئندہ سیاسی زندگی کے لئے ”ایشوز“ کا دانہ دُنکا میسر ہو سکے اور انتخابات کے مواقع پر آپ بغیر کسی ہیلمٹ یا اپنے پالے ہوئے ”بھائی لوگوں“ کی اخلاقی و آتشی سپورٹ کے اپنے حلقۂ انتخاب میں تشریف لے جانے کا شرف حاصل کرسکیں، شکریہ۔

خادم حسین مجاہد کا تعلق سرگودھا سے ہے۔ موصوف بچپن سے ہی لکھتے آرہے ہیں۔ بچوں کے لئے بہت کچھ لکھا۔ شستہ اندازِ تحریر کے مالک ہیں۔ ظرافت نگاری کے ساتھ ساتھ ان کے طنز کی کاٹ سے بھی انکار ممکن نہیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ”ارمغانِ ابتسام“ کی مجلسِ مشاورت میں شامل ہیں اور اوّلین شمارے سے اس کے ساتھ ہیں۔

قندِ شیریں

ساری محبتیں ناناجی کے لئے

ثناء کاظمی

نانا جی تو سب کو ہی پیارے اور دل عزیز ہوتے ہیں۔ مجھے بھی اپنے نانا سے بے حد محبت تھی اور ہے اور رہے گی کہ موت روح کو قبض کرتی ہے، دلوں سے محبتوں کو نہیں۔

ہمارے مرحوم نانا تو سو سال سے اوپر کی زندگی گزار چکے تھے پر شاید ہر روز فرشتوں کو بھی چکمہ دے کر صبح صبح صحیح سلامت اٹھ بیٹھتے تھے۔اُن کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ فرشتے بھی پاس سے گزرتے تو منہ بنا کر خدا سے پوچھتے کہ اِن کا بلاوا کب ہے۔تو خدا بھی اوپر سے ہاتھ ہلا کے اشارے سے ایسے منع کرتے کہ گویا فرشتوں کو تجسس ہوتا کہ کیا موصوف نے ابھی سو سال اور جی کر گینس بک آف ریکارڈ میں اپنا اندراج کروانا ہے۔

ویسے تو ہماری محبت اُن سے لازوال تھی اور اُنہیں محبتوں کے چکر میں اگر انہیں کبھی چکر آ جاتا تو ہم سب اُن کے اردگرد جلدی سے جمگھٹا لگا کر کھڑے ہو جاتے کہ کہیں روح قبض ہوتے ہوئے جسم زمین سے نہ ٹکرا جائے لیکن نانا جی غصے سے ہمیں دھتکارتے ہوئے پیچھے کو دھکیل دیتے اور نہایت خشمگیں لہجے میں کہتے کہ جو چکر تم سب مجھے دینا چاہتے ہو ناں، وہی چکر پلٹ کر مجھے آ رہے ہیں۔۔۔ میں اس بات پر تھوڑا سا مسکرا دیتا اور کہتا کہ نہیں نانا جانی، یہ وہ چکر ہیں جو آپ نے ساری زندگی لوگوں کو دیے ہیں۔

اُن کے خراٹوں اور کھانسی ساری ساری رات ہمیں جاگنے پر مجبور تو کرتی ہی تھی لیکن آج معمول سے زیادہ کھانسی نے ہمیں پریشان کر دیا۔۔۔ آخر ہماری ساری محبتوں کا مرکز و محور اُنہیں کی ذات تو تھی۔

ہم کھانستے ہوئے نانا جی کے پاس ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور اُن کی زندگی کے پرانے قصے چھیڑ دیئے۔ ساتھ ساتھ موبائل کی ریکارڈنگ بھی چل رہی تھی جیسے ان کی کہی گئی ہر بات آخری ہو۔ان کی کچھ باتوں سے تو میرا پورا چہرہ بھیگ چکا تھا مثلاً جب اُنہوں نے اپنی میت کو دفنانے کی جگہ بتائی اور ساتھ ساتھ قبر کو سجانے کی بھی تلقین کی۔ اُن کا ہر لفظ میرے اندر اس طرح پیوست ہوتا جا رہا تھا جیسے کسی خوبصورت گلاب میں کانٹے۔۔۔اُن کی وصیت کی نشریات چل ہی رہی تھیں کہ معاً مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ یومِ ماتم پر پکائے جانے والے ممکنہ کھانے کے اہتمام کے بارے بھی کوئی وصیت کروالی جائے۔۔۔ میں نے بات کو آن ائر کرتے ہوئے اپنی پسندیدہ ڈش بریانی کی فرمائش بھی کر دی اور ساتھ ساتھ کوک کی بھی (بھلا کوک کے بغیر بریانی کا خاک مزا)۔ یہ فیصلہ بھی اِس لئے کیا تھا کہ لوگ دور دراز سے سفر کر کے فوتگی میں

شرکت کریں گے لہٰذا کھانا اچھا ہونا چاہیے اور وہ بھی آپ کے پینشن کے پیسوں سے۔

میرے اس معصوم سے بیانیئے پر تو گویا نانا جی بھڑک ہی اُٹھے۔ چمک کر بولے ''بھول جاؤ! میں ابھی مرنے والا نہیں ہوں، تم لوگ تو سچ مچ مجھے زندہ درگور کرنے پر تُل گئے ہو!''

میں نے بڑی محبت سے یقین دلاتے ہوئے کہا ''یہ کیا بات ہوئی نانا جی! میری تو ساری کی ساری محبتیں آپ سے جڑی ہوئی ہیں۔۔۔ میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ شان سے جینے والا بندہ شان سے دنیا سے رخصت بھی ہو، اِس لئے جاتے جاتے اپنا یہ سام سنگ موبائل بھی مجھے ہی دیتے جایئے گا، میں آپ کی قبر اور میت کی تصویریں فیس بک پر دعاؤں کی درخواست کے ساتھ لگاؤں گا ،میرے دوست نہ صرف لائک کریں گے اور بلکہ دعائیں بھی دیں گے، آپ ہی کا بھلا ہو گا کہ دوسری دنیا میں آپ کو اِن دعاؤں کی اشد ضرورت ہوگی۔''

میری یہ بات اِتنی اچھی لگی کہ نانا جی یک بیک لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھے اور گرج دار آواز میں کہنے لگے ''دور ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔۔۔''

کھانسی تو رُک گئی مگر لہجے کی گرج و چمک ماند نہ پڑی۔ پھر کیا ہوا، مجھے تو یاد نہیں لیکن یہ ہے کہ نانا جی صبح تک گالیوں کی سوغات لٹاتے رہے اور ہم سب لوگ صبر و تحمل اور محبت سے گالیاں سنتے رہے پر سونے کے بعد۔۔۔ آخر ہماری ساری محبتیں اُنہیں سے تو لازوال تھیں۔

نانا جی بھی اپنے زمانے میں خاصے اعلیٰ عہدے کے افسر تھے۔ اپنی شاندار شاہی سواری ''سائیکل'' پر بیٹھ کر جگہ جگہ ڈاک بانٹنے نکلتے تو از حد باوقار نظر آتے تھے، اور آج بھی، جب وہ پینشن لینے جا رہے تھے تب بھی اُن کے جاہ و حشمت میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔۔۔ وہ آج بھی اُسی وقار کے ساتھ پینشن لینے لاہور سے فیصل آباد گئے لیکن کس کو خبر تھی کہ اُن کا یہ پینشن لینے کا دورہ جو ہمیشہ اُن کے لئے ہمیشہ خوشیوں کا پیغام لے کر آیا کرتا تھا، اس بار قسمت کی زنبیل میں اُن کے لئے کیا تھا۔ نہ پینشن کے پیسے آئے اور نہ ہی نانا جی۔۔۔ بس اُن کی خبر آئی۔ آج واقعی نانا جی خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے۔

نانی جان اُس وقت ہمارے ہاں ہی ٹھہری ہوئی تھیں۔ خبر ملتے ہی نانی جان نے رونے دھونے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے سفید دوپٹہ لینے کو ترجیح دی اور پھر بعد ازاں رونے دھونے کا اسٹارٹ لیتے ہوئے فیصل آباد چل دیں۔ نانا جی کے دکھ کی شدت اس قدر تھی کہ نانی جان کو یکمشت اپنے جھمکے اور قیمتی لاکٹ کا خیال آ گیا۔ رُخساروں سے آنسوؤں کے بحیرۂ احمر پر بند باندھتی ہوئی نانی جان نے اپنا سارا زیور اُتارا اور اُسے کسی محفوظ جگہ پر رکھنے کا حکم جاری کر دیا۔

ابھی گاڑی فیصل آباد کی سڑکوں پر رواں دواں تھی کہ ایک کتا گاڑی کے نیچے آ کر نانا جان کی نئی دنیا کو سدھار گیا۔ اُس کی اس اوچھی حرکت پر نانی آپے سے باہر ہو گئیں اور چلانے لگیں ''اِس مردود کو بھی ہماری گاڑی کے نیچے ہی آ کر مرنا تھا۔ شام ہو چلی ہے، پہنچیں گے کب اور دفنائیں گے کب۔۔۔ اگر رات کو دفنا دیا تو قبرستان کے مردے بھی اپنا سامان چھپاتے پھریں گے کہ کوئی چور آ گیا ہے (آخر نانا جان کے کئی بچپن اور بچپن کے لنگوٹیے وہاں پہلے سے موجود ہوں گے)۔''

بولتے بولتے اُنہیں چائے پینے کا خیال آیا۔ پیشاب کا بہانہ کر کے گاڑی رکوا تو لی لیکن پھر اپنے جیون ساتھی کی فوتگی کا خیال آ گیا، کہنے لگی ''میت کے گھر تو کچھ کھانے کو ملے گا نہیں، مجھے دو گھونٹ چائے اور پیزا ہی لا دو۔''

شاید انہیں شوہر کے غم میں زیادہ کھانے کی ضرورت اس لئے بھی تھی کہ آخر رونا بھی تو سب سے زیادہ انہیں کو تھا۔

ثناء کاظمی لاہور سے تعلق رکھتی ہیں۔ ریاضی میں ایم ایس سی کیا ہوا ہے۔ حساب کتاب کرتے کرتے کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور کہانیاں جوڑتے جوڑتے اِنہیں لگا کہ یہ طنز و مزاح بھی لکھ سکتی ہیں۔ غالباً یہ ان کی اس نوع کی اولین کاوش ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے بھی یہ ان کی پہلی تحریر ہے۔ آغاز تو بسم اللہ، انجام خدا جانے۔

چار شادی

چار شادی کا جو چرچہ رات بیگم سے کیا
بے تحاشا بات پر وہ میری مسکانے لگیں
میری گدی پر انہوں نے جیسے ہی مارا چپت
ایک ہی بیگم میں پھر چاروں نظر آنے لگیں

محمد انس فیضی

شوہر

لڑتے رہتے ہیں اپنی بیگم سے
ان کی باتوں کو ٹال دیتے ہیں
رات ہوتے ہی پر سبھی شوہر
اپنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں

محمد انس فیضی

اغلام

محبوب بات کرتا ہے پر دُور دُور سے
میرے رقیب نے مجھے بدنام کر دیا
دیوار پر لکھا تھا کہ ہوں آپ کا غلام
اس نے الف کو جوڑ کے اغلام کر دیا

محمد انس فیضی

بیڑی

خبر یہ آئی ہے یوپی حکومت بین کر دے گی
مگر بیڑی کے بن یہ ذہن بھی روشن نہیں ہوتے
مجھے یوپی کے لوگوں کی بڑی تشویش رہتی ہے
بنا بیڑی کا کش کھینچے انہیں موشن نہیں ہوتے

محمد انس فیضی

لمحوں نے خطا کی تھی

اجداد کی دولت وہ بازی میں لگا آیا
تھوڑے سے جو پیسے تھے وہ بھی نہ بچا پائی
بیٹے کے بگڑنے پر بیوی نے کہا مجھ سے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

محمد انس فیضی

نسبندی

کرا تو لی ہے انس میں نے آج نسبندی
بدن میں ایک عجب ضعف سا لگے ہے مجھے
کہیں کسے کہ خبر لگ نہ جائے بیگم کو
کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے

محمد انس فیضی

ووٹر

تیری دولت پر ہی پلتی ہے حکومت، بے خبر!
اور اِس پر قرض تیرے ووٹ کا احساں بھی ہے
تُو ہی ناداں چند ''سڑکوں'' پر قناعت کر گیا
''ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے''

ابنِ مُنیب

LOVE YOU

پیار پہ بدخواہوں کا سایہ پڑ سکتا ہے
کچھ لوگوں سے لمبا پنگا پڑ سکتا ہے
آپ مرے انباکس میں آ کر بولیں نا
پوسٹ پہ لو یُو کہنا مہنگا پڑ سکتا ہے

منیر انور

امیدِ بہار رکھ!

میرٹ بغیر تجھ کو ملیں گی ترقیاں
''افسر'' کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
فائل میں رکھ کے بھیج اسے نوٹ کچھ بڑے
'' پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ''

نوید صدیقی

تازہ کاری

میں پہلے لکھتا ہوں مشکل سا ایک پیراگراف
پھر اس کو توڑ کے میں نظمیہ بناتا ہوں
اِدھر اُدھر سے اڑاتا ہوں کچھ نئے الفاظ
''نئی ردیف ، نیا قافیہ بناتا ہوں''

نوید صدیقی

ماموں

کتنے خوش قسمت محبت میں رہے
اپنی جاناں کے جو جانوں بن گئے
جو محبت میں میاں بن نہ سکے
جان کے بچوں کے ماموں بن گئے

احمد علوی

اللہ کا کرم ہے

سلسلہ قائم ابھی تک ہے خدا کے فضل سے
کتنی ہی کلیاں کھلیں کھل کر گلستاں ہوگئیں
بیویاں مرتی گئیں میں شادیاں کرتا گیا
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

احمد علوی

دورنگی

جناب چھوٹی سی عمر میں ہی قسم خدا کی
کسے خبر ہے یہ زندگی بے حساب جی لی
نماز پڑھ لی، نمازیوں کی ملی جو صحبت
شرابیوں کے جو ساتھ بیٹھے شراب پی لی

احمد علوی

جلن

اٹھا کے بھیس میں سادھو کے سیتا ماتا کو
حسین رام کی دنیا بنائی راون نے
اسی حسد میں جلاتے ہیں ہر برس اس کو
ہماری کیوں نہیں بیوی اٹھائی راون نے

احمد علوی

سرقہ باز

اگر یہ نیٹ نہ ہوتا، پکڑتا کون مجھے
چراتا رہتا اور الزام بھی نہیں آتا
کروں میں کیا مرے سرقے پکڑ لئے سارے
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

احمد علوی

ہوشیار باش!

شرمندہ آج بھی نہیں شعری زوال پر
شک ناقدینِ فن کو ہے تیرے کمال پر
یہ چاندنی جناب فقط چار دن کی ہے
زندہ رہا نہ کوئی بھی چوری کے مال پر

احمد علوی

سریلا

سننے والوں پر گذرتی کیا ہے یہ سوچا کبھی
ساری ساری رات پکے راگ فرمانے کے بعد
صرف دو ہی وقت سوتے ہیں پڑوسی چین سے
اک ترے گانے سے پہلے اک ترے گانے کے بعد

احمد علوی

ایک محفلِ مشاعرہ میں

(جہاں تمام شعرا ہی سامعین نکلے)

سجانے بزمِ سخن ناظمین آئیں گے
مشاعرے کے لئے اہلِ فن بُلائیں گے
جنابِ صدرِ گرامی بھی آ ہی جائیں گے
وہ سامعین اُٹھا کر کہاں سے لائیں گے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

امدادِ باہمی

تُم کو آزادی ہے بھائی جو بھی کہنا ہے کہو
بزمِ شعری ہے یہاں اس ہاتھ دو اُس ہاتھ لو
ہے یہاں پر نقد سودا کیوں کرے کوئی ادھار
"من تراحاجی بگویم تو مرا مُلا بگو"

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

مُرغ اُڑانے والے

اِک مولوی ہیں، مُرغ اُڑاتے ہیں شوق سے
کہنے لگے، کھلاؤ "چکن گونیا" مجھے
ہم نے کہا کہ کھائیں "چکن پاکس" آج آپ
چہرے کو دیکھا غور سے، حیراں سے ہو گئے

تنویر پھول

پیٹو اور چورن

پیٹو میاں دعوت میں گئے، کہنے لگے وہ اپنا حال
پیٹ بھرا، اوپر نکلا، اونچا اس کا گراف ہُوا
الم غلم پیٹ میں تھا، جاری وہاں تھا اِک طوفان
ہم نے جب کھایا چورن، پیٹ ہمارا صاف ہُوا

تنویر پھول

مغربی مرد اور عورتیں

صنفِ نازک پر نہیں کچھ سرد موسم کا اثر
دونوں بازو ہیں کھلے، رانیں نمایاں ہو گئیں
اہلِ مغرب! کچھ بتاؤ، کیسا اُلٹا حال ہے؟
مرد ہیں مستور، مستورات عریاں ہو گئیں

تنویر پھول

بجلی، پانی، گیس

سیاست خاندانی ہے ، حکومت خاندانی ہے
ہمارے ملک میں جمہوریت کی یہ نشانی ہے
بھری ہے گیس پیٹوں میں، وطن سے گیس ہے غائب
مصیبت میں پھنسی پبلک ، نہ بجلی ہے ، نہ پانی ہے

تنویر پھولؔ

پاکستان ہے پیکسٹن

فاطمہ امریکہ پہنچیں ، نام بولیں ''فیٹی ما''
اور '' پیکسٹن'' بنا ہے ملک پاکستان بھی
آگئیں جنت میں جیسے، عرش پر ان کا دماغ
سن کے ان کا لہجہ سب محظوظ ہیں، حیران بھی

تنویر پھولؔ

پا، کس، تان

مہرباں تم پر ہے قسمت، سلطنت دے دی تمھیں
دیس کی دولت چراؤ اور بھرو صندوق تم
''زر'' کا ''شر'' تم کو ہے پیارا، لوٹے بن کر تم رہو
''پا'' کو جلدی سے کرو ''کس''، ''تان'' لو بندوق تم

تنویر پھولؔ

پاپا کی بیٹی کا اندیشہ

پچھتائے ہیں یہ سوچ کر
ہم کس کی آپی ہو گئے !
کرسی چچا لے جائیں گے
پاپا تو پاپی ہو گئے!

تنویر پھولؔ

کیوں نکالا مجھے؟

مجھ سے اتنی عداوت بھلا کس لئے ؟
تُو تو لگتا ہے جنرل کا سالا مجھے
تیسری بار کرسی پہ بیٹھا تھا میں
کیوں نکالا مجھے ؟ کیوں نکالا مجھے ؟

تنویر پھولؔ

فضلو اور شرفو

کبھی کہتے زمیں کی ہیں ، کبھی اُڑتے فلک پر ہیں
تضادات ان کی باتوں میں، بیانات ان کے ہیں گڑبڑ
یہ فضلو اور یہ شرفو ہیں کرتے بات ست رنگی
قلابازی جو کھائی شیر نے ، وہ بن گیا گیدڑ

تنویر پھولؔ

قوم، ملک، سلطنت

قوم تو بیکار ہے اور ملک بھی بیکار ہے
سلطنت اپنی رہے قائم، یہی ہے آرزو
ہم رہیں کرسی پہ بیٹھے،قوم جائے بھاڑ میں
اپنی سلطانی رہے پائندہ، بہہ جائے لہو

تنویر پھوؔل

مولوی ڈیزل

اب مچاتا شور ہے ، لیڈر ہے اپنا ایک چور
اس کی یہ کوشش ہے،دولت میں وہ بن جائے ٹرمپ
یہ شکم اس کا ہے یارو ! یا بڑا سا اِک گلوب
توند میں اس نے چھپایا پھوؔل ! ہے پٹرول پمپ

تنویر پھوؔل

خطرہ

عمر کے تو پچی سے ہے خطرہ ظفؔر
یہ کہیں لے کے فائر نہ کردے مجھے
نوکری سے ریٹائر اگر ہو گیا
زندگی بھی ریٹائر نہ کردے مجھے

نوید ظفؔر کیانی

گھر داماد

کیا کہوں روداد گھر داماد کی
گھر کی صورت جیل ملتی ہے اُسے
اِک عروسِ شامتِ اعمال ہے
بیلنے کی بیل ملتی ہے اُسے

نوید ظفؔر کیانی

دھمکی

میرے سالے نے کہا اتنا بھی کمزور نہیں
اپنی باجی کے لئے تجھ کو مکا بھی نہ سکوں
آج کے بعد شرافت ہی سے رہنا ورنہ
''میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں''

نوید ظفؔر کیانی

خواہش

روز چھت پر آ کے ٹہلا کیجئے
روز آنکھوں کو نظارہ چاہیئے
اِس لئے رکھی ہے میں نے دوربیں
''آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے''

نوید ظفؔر کیانی

سفر وسیلۂ ظفر

باب ششم

ارمان یوسف

لندن ایکسپریس

لندن والے برا نہ مانیں، ابھی طیارہ فضا ہی میں تھا کہ ہم نے جہاز کی کھڑکیوں سے تانک جھانک شروع کر دی تھی۔ کندھے سے کندھا ملائے ترچھی چھتوں والے مکان فضا سے ایک ترتیب کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔ سڑکوں پہ رینگتی گاڑیاں اور چلتے لوگ بھی اپنے قد سے کئی گنا چھوٹے لگ رہے تھے۔ بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتا سورج گو ڈوبنے کو تھا مگر ہلکی سی دھوپ کی تپش بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جہاز خیریت سے ائر پورٹ پر اتر چکا تھا۔ لندن کے مغربی علاقے میں واقع یہ ائر پورٹ ۱۹۲۹ء میں بنا۔ ۱۹۵۵ء تک لندن ائر پورٹ کے نام سے جانا جاتا رہا، بعد ازاں اس علاقے میں موجود ہیتھرو فارم، ہیتھرو ہال اور ہیتھرو ہاؤس کی مناسبت سے ہیتھرو ائر پورٹ کہلایا جانے لگا۔ ائر پورٹ پر مسافروں کے لئے عمدہ انتظار گاہیں، کھانے پینے اور خریداری کے ساتھ ساتھ ہر مذہب کے لئے عبادت گاہیں بھی موجود ہیں۔ ۵ ٹرمینلز پہ مشتمل یہ ائر پورٹ دنیا کا مصروف ترین ہوائی اڈہ ہے جس پر ۹۰ ہوائی کمپنیاں دنیا بھر کی ۱۷۰ منزلوں کی طرف اڑان بھرتی ہیں۔ سنا ہے ہر ۹۰ سیکنڈ یعنی ہر ڈیڑھ منٹ بعد ایک جہاز یہاں سے فضا میں زقند بھرتا ہے۔ رات کے اوقات میں صفائی اور مینٹیننس کے لئے بند کر دیا جاتا ہے، ایسے میں اگر کوئی فلائٹ آ جائے تو لندن کے دوسرے ہوائی اڈوں گیٹوک، سٹینسیڈ، لوٹن یا سٹی ائر پورٹ پر اتار لی جاتی ہیں۔ ہمارا جہاز لمبے لمبے بازو پھیلائے ٹرمینل 3 پہ شریفانہ انداز میں لیٹا پڑا تھا۔ سامان سمیٹے امیگریشن کاؤنٹر کی طرف بڑھے۔ دل میں کئی خدشات تھے کہ داڑھی والے مسلمان اور وہ بھی پاکستانی کی حیثیت سے کئی طرح کے سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ امریکہ میں

ہونے والے نائن الیون کے دھماکوں نے دنیا بھر میں مسلمانوں کو مشکوک بنادیا ہوا ہے اور امریکی ہوائی اڈوں پر تو پاکستانی وزیروں تک کے چیتھڑے اور جوتے بھی اتار کر تلاشی لی جاتی ہے۔امریکی کتے سونگھ سونگھ کر القاعدہ سے تعلق رکھنے یا نہ رکھنے کی جانچ پڑتال کرتے رہتے ہیں۔

سینکڑوں لوگ ہاتھوں میں پاسپورٹ اور دیگر کاغذات تھامے قطار میں موجود تھے۔امیگریشن آفیسرز پھرتی اور مہارت سے ایک ایک مسافر کی جانچ پڑتال کر کے Entry کی مہر لگا رہے تھے۔ہماری باری آئی تو کوئی خاص سوال کئے بغیر پاسپورٹ پہ مہر لگا کے مسکراتے ہوئے Enjoy your stay کی صورت میں لندن میں خوش آمدید کہا گیا۔شیطان کی آنت کی سی ایک طویل راہداری سے ائر پورٹ سے باہر نکلے تو فضا دھلی دھلی اور صاف ستھری محسوس ہوئی۔یوں لگا جیسے فلموں میں دکھائے جانے والے کسی خوبصورت منظر کا حصہ ہو۔اب ہماری پہلی منزل دریائے تھیمز کے جنوب میں واقع لندن کا تاریخی علاقہ بریکسٹن تھی۔بریکسٹین سے نکلا یہ نام لفظی معنوں میں برکسی کا پتھر کہلاتا ہے جو ماضی میں مقامی آبادی کے کٹھ اور پنچائت کی جگہ کی حد بندی کرتا ہوا غالباً بریکسٹن کی پہاڑی پر واقع تھا۔یہ علاقہ بھی زرعی زمینوں اور باغات پہ مشتمل ہوا کرتا تھا۔الیکٹرک ایوینیو دنیا میں پہلا شاپنگ سنٹر تھا جو بجلی کے جگمگاتے قمقموں میں روشن ہوا تھا۔اس علاقے میں افریقی ممالک سے تعلق رکھنے والی زیادہ آبادی کی وجہ سے کئی بار جھڑپیں اور احتجاجی مظاہرے بھی ہو چکے۔اس مسئلے کا مستقل حل نکالنے کے لئے ہندوستان اور باقی دنیا میں Divide and rule کی پالیسی اپنانے والے چالاک انگریزوں نے یہاں مختلف گروہوں اور اقلیتوں کو آباد کرنا شروع کردیا ،سو اب یہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔پاکستان، بھارت ،بنگلہ دیش سمیت دنیا کے کئی دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والے لوگ یہاں پائے جاتے ہیں۔یہاں ہمارے

میزبان طٰہٰ قریشی تھے۔قریشی صاحب نے تو ائر پورٹ پر ہمیں ریسو کرنے کے لئے ندیم کو بھیجنا چاہا تھا،لیکن ہم نے سوچا کہ اگر چہ سفری تھکان بھی ہوگی مگر لندن کی شاہراہوں اور دیگر مقامات کو دریافت کرتے خود آ پہنچیں گے۔ایڈریس ملتان میں موجود ان کے چھوٹے بھائی طاہر ثقلین قریشی سے لے کر آئے تھے۔یوں تو انہوں نے لندن میں مقیم اپنے بڑے بھائی اور ان کی فیملی کے لئے اور بھی کئی چیزیں بھجوائی تھیں،جن کا نہ کسٹم تھا اور نہ بوجھ پھر بھی ایک اثاثہ تھیں،یعنی دعائیں اور سلام۔قریشی صاحب نے قریب ۱۹۸۹ء میں انگلستان کے شہر بریڈ فورڈ میں سکونت اختیار کی اور یہیں سے عائلی زندگی کا آغاز کیا۔ان کے بچوں کی جائے پیدائش بھی یہی شہر ہے۔ادھیڑ عمر میں بریڈ فورڈ یونیورسٹی سے چار سالہ انجینیرنگ کی ڈگری دو سال میں مکمل کی جو آج بھی ایک ریکارڈ ہے۔نسلی تعصب اور منافرت کی وجہ سے واپس ملتان چلے گئے مگر ۱۹۹۹ء میں دوبارہ آئے اور یہیں بریکسٹن میں قیام کیا۔

ائر پورٹ سے باہر ہی موجود ٹیکسی سٹینڈ پر پہنچے تو ایک پاکستانی ڈرائیور سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ولایت میں دیسی آدمی کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔مطلوبہ جگہ کا بھاؤ تاؤ معلوم کیا تو کوئی ۳۵ پاؤنڈ کرایہ بن رہا تھا،ہم ترنگ میں آ کر ۴۰ پاؤنڈ دینے کی پیشکش کر کے آرام دہ اور نئی ٹیکسی میں سوار ہوگئے۔ہم نے محسوس کیا کہ ہر گاڑی رکتے یا چلتے ہوئے ایک مخصوص فاصلہ رکھتی اور دوسرا یہ کہ نہ ہارن کا شور نہ عطاء اللہ نیازی کے گانے ،نہ دھواں نہ گرد و غبار۔۔۔۔۔ہمارا تو جی اکتا گیا۔ٹیکسی ڈرائیور سے گزارش کی کہ ایک بار ہارن کی مدھر آواز ہی سنا دے۔وہ بولا اس کی ضرورت ہی نہیں تو کیوں بجاؤں۔پھر بھی ہماری خواہش کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس نے ہارن بجایا،ہارن کیا تھا بس ایک ہلکی سی ''پیپ''ہم تو قع کر رہے تھے کہ زوردار آواز والا پریشر ہارن ہوگا،مگر سخت مایوسی ہوئی۔ایک تو ٹریفک سست تھی اور دوسرا وہی ہر گاڑی کے بیچ میں مخصوص فاصلہ۔ڈرائیور بتانے لگا یہاں اگلی گاڑی سے 'ٹو سیکنڈ گیپ' رکھنا قانونی تقاضا ہے اور بارش کی صورت میں یہ فاصلہ دوگنا ہو جاتا ہے۔

''بھئی آپ اوورٹیک کرتے ہوئے اپنی گاڑی نکالو نا، یہاں کوئی دیکھ رہا تھوڑی ہے''

''وہ سامنے دیکھو'' ڈرائیور نے ایک کھمبے کی طرف اشارہ کیا۔

''وہاں کیا ہے'' ہم نے خالی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''کیمرہ'' (کلوز سرکٹ ٹیلی ویژن۔CCTV)

''ہوتا رہے، ہمیں کیا'' ہم نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''اسی کیمرے کے ذریعے سڑک پہ موجود ہر گاڑی کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ یہاں ٹریفک پولیس اشاروں پہ نہیں ہوتی، بلکہ مخصوص جگہ پہ بیٹھی کیمروں کی مدد سے نگرانی کر رہی ہوتی ہے''

ڈرائیور نے وضاحت کی۔ کانی آنکھ سے اس نے ہمیں مرعوب ہوتے دیکھا تو بولتا چلا گیا ''یو کے میں ان کیمروں کی تعداد ساٹھ لاکھ کے قریب ہے جو شاپنگ سنٹرز، سڑکوں، ہسپتالوں، سکولوں اور عوامی مقامات سمیت بسوں اور ٹرینوں میں بھی استعمال ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ایسے بھی ہیں جو آدھے میل کے فاصلے تک چہرے کو پہچاننے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ یوں سمجھو ہر گیارہ آدمیوں کی نگرانی پر ایک کیمرہ لگا ہے، دن رات لگا تار۔ یو کے کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا ایک فیصد بنتی ہے جبکہ کیمرے باقی دنیا کے مقابلے میں یہاں بیس فیصد ہیں۔

''اگر آپ کوئی سگنل توڑیں تو کیمرے کی مدد سے دیکھتے ہوئے پولیس آپ کے پیچھے پڑ جائے گی اور جرمانہ کرے گی'' وہ ہماری دلچسپی دیکھتے ہوئے گویا ہوا ''سڑکوں اور موٹر وے پہ لگے مخصوص کیمرے اندھیرے یا بارش کی صورت میں بھی گاڑی کی نمبر پلیٹ پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اوور سپیڈ، سگنل توڑنا یا ایسی کسی صورت میں مقرر کردہ جرمانہ آپ کے گھر پہنچ جاتا ہے، آپ کی گاڑی کی تصاویر اور ویڈیو سمیت اس وقت کے مطابق، جسے آپ نے ہر صورت ادا کرنا ہے۔''

''تو بس جرمانہ ادا کر دو، بات ختم''

''محض جرمانہ ہو تو کوئی بڑی بات نہیں'' ہمارے سوال کے جواب میں وہ بولا ''ساٹھ یا سو پاؤنڈ تک جرمانے تک کی رقم اگر چہ بڑی ہے مگر اتنی بھی نہیں۔ پوائنٹنگ سسٹم بھی ہے، آپ زیادہ سے زیادہ ۱۲ پوائنٹ تک گاڑی چلا سکتے ہیں۔ اس کے بعد لائسنس کینسل ہو جاتا ہے، سال یا چھ ماہ بعد آپ دوبارہ ڈرائیونگ پاس کریں اور گاڑی چلائیں، اس معاملے میں وزیرِ اعظم ہو یا عام شہری کسی کو چھوٹ نہیں۔ برطانیہ میں لگ بھگ ساڑھے تین کروڑ گاڑیاں ہیں، ایک ایک گاڑی کی تفصیل اور مالک کی تمام معلومات متعلقہ محکمے کے پاس ہے''

''آپ تو بہت پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں، پھر ٹیکسی ہی کیوں چلاتے ہیں۔ کوئی بنک وغیرہ جوائن کر لیتے'' ہم نے ٹیکسی والے کی تعریف بھی کی اور وہائٹ کالر جاب کے لئے اکسایا بھی۔

وہ کہنے لگا ''مجھے یہی کام راس ہے، وقت کا پابند اور کسی کا ماتحت بھی نہیں اور دوسرا یہ کہ ٹیکسی کا لائسنس حاصل کرنا بھی کوئی آسان بات نہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ نے پچھلے تین سال میں کوئی اشارہ نہ توڑا ہو، لڑائی جھگڑے میں بھی ملوث نہ رہے ہوں۔۔۔۔۔۔''

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ہم نے ایک زوردار قہقہہ لگایا ''بھئی کتنے مجبور اور لاچار ہو برطانیہ والو! پاکستان میں آؤ، سو پچاس قتل کرو، منی لانڈرنگ اور میگا کرپشن میں ملوث ہو تو ہم تمہیں ملک کا وزیرِ اعظم لگوا دیں گے اور اگر خوش قسمتی سے چودہ پندرہ سال جیل بھی کاٹ چکے ہو تو با اختیار صدرِ مملکت اسلامی جمہوریہ پاکستان بن سکتے ہو۔ مگر محض لڑائی جھگڑے اور ٹریفک قوانین کی پابندی نہ کرنے کی بنا پر تو آپ کسی ایم این اے یا ایم پی اے کے چپڑاسی بھی نہیں لگ سکتے''

ٹیکسی والا کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

آگے ایک چوک سا آ گیا۔ چاروں طرف کی ٹریفک رکی

ہوئی تھی اور بتیاں بھی سرخ تھیں۔ہم سے رہا نہ گیا'' یہ کیا ہو رہا ہے یہاں، ایک طرف کے اشارے سرخ ہوں تو دوسری طرف کے تو سبز ہونے چاہئیں''

'' پیدل چلنے والوں کا اشارہ کھلا ہے، ساری ٹریفک رکی رہے گی جب تک کہ وہ گزر نہ جائیں''

ڈرائیور کی اس بات پر ہم کچھ نہ بولے، خاموش ہی رہے۔

کچھ ہی دیر میں ہمارے کاروباری ذہن میں خیال آیا یہ جو پینتیس پاؤنڈ کرایہ طے ہوا ہے یہ تو ایک بڑی رقم ہے، ہم تو اسے پینتیس روپے ہی سمجھے تھے مگر یہ تو لگ بھگ سات ہزار روپے بنتے ہیں۔اتنی رقم میں تو ہم پورا پاکستان گھوم سکتے ہیں اور وہ بھی پیدل۔اب سوچنے لگے کہ کوئی متبادل راستہ اختیار کیا جائے وہ بھی ایسا کہ جس سے پیسہ بھی بچ جائے اور وقت بھی۔ ڈرائیور سے مشورہ کیا تو اس نے ٹرین یعنی زیر زمین ریلوے جسے یہاں ''ٹیوب'' بھی کہا جاتا ہے، منزلِ مقصود تک پہنچنے کا ''کم خرچ اور بالا نشیں'' ذریعہ قرار دیا۔بڑی عمدگی سے ہم نے اسے کسی قریبی ٹیوب سٹیشن پہ اتارنے کو کہا کہ بھرم بھی رہ جائے۔

۱۸۶۳ء میں لندن میں قائم ہونے والا زیرِ زمین ریلوے کا یہ نظام دنیا کے سب سے پہلے زیرِ زمین میٹرو سسٹم کا اعزاز بھی رکھتا ہے جسے سادہ زبان میں صرف ''انڈر گراؤنڈ'' بھی کہا جاتا ہے۔یہ سسٹم ۲۷۰ سٹیشنوں پر مشتمل ہے جس سے روزانہ اوسطاً پچیس لاکھ مسافر سفر کرتے ہیں۔اولمپک کھیلوں کے دوران ۳ اگست ۲۰۱۲ء کا دن مصروف ترین دن تھا ،اس روز چوالیس لاکھ مسافروں نے انڈر گراؤنڈ کے ذریعے سفر کیا تھا۔دوسری عالمی جنگ میں یہی زیرِ زمین ریلوے پناہ گاہ کا کام بھی دے چکا ہے اور اسی کی مدد سے دو لاکھ بچوں کو قدرے محفوظ مقام پر منتقل کیا گیا تھا۔ہم Acton Town نامی ٹیوب سٹیشن پر پہنچے، رش زیادہ بھی نہ تھا۔ ہر آنے والا مسافر چھوٹے سے دروازے والے بیریئر میں سے کسی ایک پر بنے مخصوص نشان پر ایک کارڈ سا ٹچ کرتا یا ٹکٹ ایک اے ٹی ایم کے جیسے ہول میں سے گزارتا تو بیریئر کے دونوں پٹ خود بخود کھل جاتے اور مسافر پھر تیلے انداز میں گزر جاتا۔ پہلے تو ہم حیران رہ گئے ۔ یا خدا یہ ماجرا کیا ہے؟ کاش الہ دین کا یہ جادوئی چراغ ہمارے ہاتھ بھی لگ جائے جس کی ایک ہی رگڑ سے ہم کہیں سے کہیں پہنچ جائیں یا پھر ''کھل جا سم سم'' والا منتر ہی کارگر ثابت ہو جائے۔اس نیت اور امید کے ساتھ ہم بھاری بھر کم سفری بیگ کے ساتھ آگے بڑھے۔ایک مردِ مسلمان کے گھٹنوں اور ہاتھوں کے فولادی دباؤ کے ساتھ بیریئر کھولنے کی بارہا کوشش کی مگر کفار و مشرکین کے ہاتھوں سے بنا یہ جہنمی دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔اتنے میں ایک باوردی کالا پہلوان ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔شکل وصورت سے تو نہیں البتہ جثہ و جسامت کے لحاظ سے پنجاب پولیس کا تھانیدار ہی لگ رہا تھا۔ہم نے دل ہی دل میں خود کو ملامت کرنی شروع کر دی کہ اس بیوقوفی کی کیا ضرورت تھی، اب یہ حبشی ہزار باتیں سنائے گا۔کہیں نابینا ہی نہ سمجھ لے۔وہ قریب آیا اور مسکراتے ہوئے بولا:

"How may I help you Sir"

اول تو اس کے دھواں دار چہرے پر چمکتے سفید دانت نور کا ہالہ معلوم ہوئے اور دوسرا یہ کہ سرزمینِ برطانیہ پر کوئی پہلی بار ہمیں ''سر'' کہہ کر پکار رہا تھا، سو ہم نے یوں ظاہر کیا جیسے کچھ سمجھے نہ ہوں۔وہ قدرے اونچی آواز میں دوبارہ مخاطب ہوا:

"Do you need my help Sir"

ہم نے جھٹ پٹ جیب سے ایڈریس والی پرچی نکالی اور اسے دکھائی جسے ہم نے تعویذ کی طرح سنبھال رکھا تھا۔معنی خیز

انداز میں اس نے سر ہلایا اور ٹکٹ مشین کے پاس لے گیا۔سٹینڈ پر
لگے ٹیوب میپ [illegible] سے ایک نقشہ اٹھایا اور لال پینسل کے ساتھ
ہمارے آغازِ سفر والے ٹیوب سٹیشن پر ایک دائرہ لگا دیا، ایک اور
دائرہ لگا کر Acton Town کو گرین پارک سٹیشن سے ملا
دیا۔ایک دائرہ بریکسٹن ٹیوب سٹیشن پر لگایا۔گویا ہم نے گرین
پارک سے وکٹوریہ لائن کے ذریعے بریکسٹن جانا تھا۔اب ٹکٹ
لینے کا مرحلہ آیا۔اس نے ہمارے پاس موجود ایک بیس پاؤنڈ کا
نوٹ لیا اور مشین میں ڈال دیا۔ چھ پاؤنڈ کا ٹکٹ بن رہا تھا۔ہم
نے سوچا کیا خبر مشین بقیہ رقم واپس ہی نہ کرے۔مگر تمام خدشات
اس وقت دور ہوئے جب ٹکٹ سمیت بقیہ رقم واپس ملی۔اس نے
ٹکٹ استعمال کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا اور ایک بار پھر چٹے چٹے
دانت نکالتے ہوئے سفر خیریت سے کٹنے کی دعا بھی دی، ہاتھ ملایا
اور رخصت کیا۔سٹیشن کے اندر اور ٹرین میں بھی جا بجا No
Smoking کے سائن لگے تھے۔سنا ہے پہلے تو گورے بھی
ٹیوب اور ٹرینوں میں سگریٹ کے کش لگایا کرتے تھے مگر ۱۹۸۷ء
میں آگ لگنے کی وجہ سے ۳۱ مسافر جاں بحق ہو گئے تھے۔اس
افسوس ناک واقعے کے بعد نہ صرف ٹیوب میں بلکہ ٹرینوں اور
بسوں میں بھی سگریٹ نوشی پر مکمل پابندی عائد کر دی
گئی۔مسافروں نے بھی بلا چوں چراں اس پر عمل کرنا شروع کر
دیا۔ایسی بھولی قوم کہ سگریٹ پینے کی اس آزادی کے چھن جانے
پر نہ کوئی احتجاج کیا اور نہ ٹائر جلا کر سڑکیں بلاک کیں۔بیچارے!

ابھی ہم اوور گراؤنڈ ہی تھے کیونکہ ۴۰۲ کلومیٹر طویل یہ میٹرو
ٹریک ۵۵ فیصد اوور گروئنڈ ہے اور ۴۵ فیصد انڈر گراؤنڈ، یوں
لمبائی کے لحاظ سے یہ دنیا کا تیسرا بڑا میٹرو سسٹم ہے (پہلے اور
دوسرے نمبر پر کون کون سے ملک ہیں یہ آپ خود ہی معلوم کیجئے،
سارے کام ہمارے ذمے تھوڑی ہیں) مختلف لائنوں کو ناموں اور
رنگوں سے ظاہر کیا گیا تھا۔اگلے آنے والے سٹیشن سے پہلے ہی
ریل کی چھت سے لگے سپیکر میں سٹیشن کا نام پکارا جاتا اور آن کی
آن میں مسافر اترتے بھی اور چڑھتے بھی۔نہ کوئی گالی گلوچ نہ
دھکم پیل۔ہر قدم ایک ترتیب کے ساتھ۔کسی تاخیر کی صورت میں
ڈرائیور اعلان کرتے ہوئے ٹرانسپورٹ فار لندن (TFL) کی
طرف سے معذرت کرتا، رکنے کی وجہ بیان کرتا اور یہ کہتا کہ ٹھیک
تیس سیکنڈ کے بعد ہم روانہ ہو جائیں گے، کنڈکٹر کوئی تھا نہیں جو
کہتا ''اپنی سائیڈ دیکھ کے جانڑ دیو استاد جی''

جلد ہی ٹرین ایک قبر نما گولائی والے خول میں داخل ہو گئی
یعنی ہم زیرِ زمین چلے گئے تھے۔ان لائنوں کی گہرائی مختلف
مقامات پہ مختلف ہے، سب سے گہری لائن 192 فٹ زیرِ زمین
ہے۔دلچسپ بات یہ کہ پانچ لاکھ سے زائد چوہے بھی یہیں کونے
کھدروں میں بسیرا کئے ہوئے ہیں۔

لندن انڈر گراؤنڈ جسے آج ہم نے شرفِ قدم بوسی بخشا
ہے، ملکہ برطانیہ الیزبیتھ دوم نے پہلی بار گیارہ سال کی عمر میں
یہاں سے سفر کیا تھا۔

آخری سٹیشن سے گھومتی خود کار سیڑھیوں یعنی ایسکیلیٹر کے
ذریعے سطحِ زمین پر نمودار ہوئے، مجموعی طور پر یہ ایسکیلیٹر اتنے
گھومتے ہیں کہ ایک ہفتے میں پوری دنیا کے گرد دو چکر مکمل ہو
جاتے ہیں مگر یہ پاکستانی عوام اور کولہوؤں کے بیل کی طرح ایک ہی
دائرے میں گھومتے رہتے ہیں۔

بریکسٹن کے کوچہ و بازار میں گہما گہمی تھی۔سڑک پہ چلتی سرخ
رنگ کی ڈبل کیبن بسیں مسافروں کو ڈھونے کا کام سرانجام دے
رہی تھیں۔ہم نے سب سے پہلے قریشی صاحب کو حدود اربعہ
سمیت اپنے آنے کی اطلاع دی۔پتا چلا کہ آپ شہزادہ چارلس
سے ملاقات کرنے ان کے محل گئے ہوئے ہیں، ساتھ ہی ایک
قریبی جگہ کا پتا بھی دیا جہاں ہمارے ٹھہرنے کا اہتمام کیا گیا
تھا۔ہمیں لگا کہ پرنس چارلس سے ملاقات والی بات ہم پہ رعب
جھاڑنے کے لئے کی گئی ہے۔بھئی کسی گورے کا موٹا سا نام ہی
لے لیتے، یا کسی میئر یا لارڈ سے ملاقات کا کہہ دیتے، آئن سٹائن
، نیوٹن یا شیکسپیئر سے روحانی ملاقات کا حوالہ ہی دے دیتے تو ہم
تب بھی متاثر ہو جاتے کہ ہم پاکستانی گوروں سے وابستہ ہر چیز
سے بہت جلد مرعوب ہو جاتے ہیں۔مگر یہاں تو آپ نے نام ہی
شاہِ وقت کا لیا۔بے شک تو اگلے روز اخبارات دیکھ کے یقین میں

بدلا۔ یہ ملاقات بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوئی، الوداع کہتے ہوئے شہزادہ حضور نے آپ کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا:

"Keep dreaming Mr Qureshi!"

ہم ہوتے تو بقیہ عمر سو ہی جاتے کہ خواب دیکھیں گے۔ مگر سیانے کہتے ہیں کہ خواب وہ نہیں ہوتے جو آپ سوتے ہوئے دیکھیں بلکہ خواب تو وہ ہوتے ہیں جو آپ کو سونے نہ دیں اور تعبیر کے حصول کے لئے جدو جہد پہ اکسائیں۔ اسی طرح مارٹن لوتھر نے کہا تھا کہ: ''اگر تم اُڑ نہیں سکتے تو دوڑ لگاؤ، اور اگر دوڑ بھی نہیں سکتے تو چلو، چل بھی نہیں سکتے تو رینگتے ہوئے منزل کی جانب بڑھتے رہو'' یہی مقولہ شاید قریشی صاحب کے ہاتھ لگا اور انہوں اس پر دن رات عمل بھی کیا۔ یہاں آئے تو مقامی آبادی کے مسائل کے حل کے لئے جدو جہد کی، بے لوث اور طویل خدمات کے صلے میں ملکۂ برطانیہ نے شاہی خاندان کی اعزازی رکنیت یعنی Member of the Order of the British Embire(MBE) کا ایوارڈ دیا، اب بڑے فخر سے طٰہٰ قریشی ایم بی ای لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ اب سچ میں ہم متاثر ہوئے کہ واقعی ایک عظیم شخصیت نے شرفِ میزبانی بخشا ہے۔ ہم نے فوراً دوستوں اور رقیبوں کی الگ الگ فہرست تیار کر لی، دوستوں پہ رعب جھاڑنے اور رقیبوں کو جلانے کے لئے۔

خیر ہمارا جس طرف منہ تھا، اسی طرف ہی چل پڑے کہ راستے میں کسی سے پتا پوچھ لیں گے تھوڑا آگے آئے تو آدھے لباس میں ایک جواں سال گوری سنہری زلفیں بکھیرے لا پرواہی سے سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ آتے جاتے لوگ اپنی مستی میں مگن، کسی کو پرواہ نہیں ہم اس نتیجے پہ پہنچے کہ شاید یہ کوئی جادوگرنی ہے یا کوئی پری کہ کسی کو دکھائی ہی نہیں دے رہی ورنہ لوگ کائنات کے اس خوبصورت نظارے سے کیسے لاتعلق رہ سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسا ہوتا تو شوقِ نظارہ رکھنے والوں کی لمبی لائن لگی ہوتی۔ بلکہ شمعِ حسن کے یہ پروانے ایک دوسرے کا سر بھی پھاڑ چکے ہوتے۔ ان کا بھی قصور نہیں جب حسن یہاں بھی پردہ نشین تھا تو یہاں بھی معاملہ ایسا ہی تھا۔ ۱۹۳۷ء میں جب پہلی بار دو خواتین سکرٹ پہنے جلوے بکھیرتی باہر آئیں تو دیکھنے والوں کی قطاریں لگ گئیں۔ ٹریفک جام ہوگئی، ایک کار ایکسیڈینٹ بھی ہوا جس میں ۱۰ آدمی زخمی ہوگئے تھے۔

اگر وہ گوری Hi کہہ کر ہمیں مخاطب نہ کرتی تو اگلے ہی لمحے ہم اس کے بازو کی چٹکی لینے والے تھے۔ ایسے میں استاد محترم شیخ حنیف مرحوم بہت یاد آئے جو میٹرک میں اکثر انگریزی پڑھاتے ہوئے کہا کرتے ''بیٹا انگلش سیکھ لو، زندگی میں کام آئے گی''

کاش ان کی بات مان لیتے تو آج کام بن جانا تھا۔ ہم نے اسے ایڈریس دکھایا، گویا وہ ہماری ہی منتظر تھی۔ اس نے ہمارا ہاتھ تھاما، چھوٹے والا بیگ بھی خود اٹھایا اور ساتھ میں لے کے چل پڑی۔ ہم دل ہی دل میں بہت خوش بھی تھے اور متفکر بھی کہ کسی نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا۔

جی چاہا کہ یوں ہی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چلتے ہی رہیں، بقول ڈاکٹر بشیر بدر ؎

میں ترے ساتھ ستاروں سے گزر سکتا ہوں
کتنا آسان محبت کا سفر لگتا ہے

اور یہ بھی سچ ہے کہ ؎

بت بھی رکھے ہیں، نمازیں بھی ادا ہوتی ہیں
دل مرا دل نہیں، بھگوان کا گھر لگتا ہے

مگر چند قدم پہ ہماری منزل تھی، اس نے بیگ واپس کیا اور کہا "Here is your destination" یعنی آپ پہنچ گئے جہاں آنا تھا۔ ہم نے شکریہ ادا کیا اور وہ مسکراتے ہوئے واپس چل دی۔

ہم ایک بڑے آہنی دروازے سے اندر داخل ہوئے، طویل صحن عبور کر کے صدر دروازے کے قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ یہ تو مسجد اور ثقافتی مرکز ہے۔ اب کے قریشی صاحب کا مہمان بن کے پچھتاوا ہونے لگا۔ بندۂ خدا کسی پب یعنی میخانے میں بلواتے، کسی کلب میں ٹھکانا لگواتے مگر یہ کیا، بھیجا بھی تو خانۂ خدا میں۔ یہ تو احمد

ندیم قاسمی کے افسانے ''گھر سے گھر تک'' والا معاملہ ہوا۔سوچا پاکستان واپس جا کر ہم بھی اسی طرز کا ایک افسانہ لکھیں گے،جس کا عنوان ہوگا ''اسلام کے قلعے سے لندن کی کوٹھری تک'' اب تو بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ ۔

شب جو مسجد میں جا پھنسے مومن
رات کاٹی خدا خدا کر کے

خیر بسم اللہ پڑھ کے آگے بڑھے اور دایاں پاؤں مسجد کے اندر رکھا۔ایک صاحب ہمارے منتظر تھے،دیکھتے ہی کِھل اٹھے۔خوش اخلاقی سے ایک کمرے میں لے گئے اور دھیمے انداز میں کہا:''آپ تازہ دم ہولیں کھانا تیار ہے۔''

کھانے کا سن کے اجنبیت بھی ختم ہوگئی اور تھکاوٹ بھی۔

نماز اور کھانے سے فارغ ہوئے تو رسمی بات چیت کے بعد ہم نے سفید شلوار قمیض میں ملبوس سفید داڑھی والے جوان نما بزرگ پیش امام حافظ اقبال حسین سے پوچھا کہ یہاں پر کس کس مسلک سے تعلق رکھنے والے لوگ عبادت کے لئے آتے ہیں۔کہنے لگے ایشیا سمیت،عربی اور افریقی بھی۔یعنی محمود وایاز ایک صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔

ہم نے پوچھا''عربی تو دین کے معاملے میں زیادہ سمجھ بوجھ رکھتے ہوں گے؟''

امام صاحب کہنے لگے''ایک لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کیونکہ عربی ان کی مادری زبان ہے مگر ہمارے لوگوں جیسا رکھ رکھاؤ ان میں نہیں ہوتا۔مثلاً تلاوت کرتے کرتے اگر تھکاوٹ محسوس کی تو قرآن شریف سر کے نیچے رکھا اور آرام کی غرض سے لیٹ گئے یا نماز کے دوران کسی کا فون آگیا تو''انا فی الصلاۃ'' یعنی میں ابھی نماز پڑھ رہا ہوں بعد میں فون کرنا،کہہ کر جلدی سے فون واپس جیب میں ڈالا اور نماز بھی جاری رکھی۔کئی ایک تو میسج کا جواب بھی دے لیتے ہیں۔ایک بار ایسا ہوا کہ دس کے قریب لوگ جماعت ہو جانے کے بعد مسجد میں آپہنچے۔ایک صومالی نے امامت کی تا کہ الگ الگ نماز ادا کرنے کی بجائے جماعت کا ثواب حاصل کرسکیں۔دوسری رکعت کے سجدے میں تھے کہ امام صاحب کا فون بج اٹھا،کوئی اہم کال تھی،امام صاحب سرگوشی سے فون سنتے ہوئے سجدے سے اٹھے اور مسجد سے باہر چلے گئے تا کہ نمازی ڈسٹرب نہ ہوں۔مقتدیوں نے طویل سجدے سے سر اٹھایا تو آگے امام موجود ہی نہیں تھا،سو سب نے الگ الگ اپنی اپنی نماز مکمل کی۔''

ہم نے دل ہی دل میں ان کی زندہ دلی کی داد دی۔

''فرقہ یا مسلک کی بنا پہ کبھی کوئی ناخوشگوار واقعہ ہوا ہے''

ہمارے سوال کے جواب میں اب کے مفتی محمود الحسن بولے ''ہماری مسجد میں تو تقریباً تمام فرقوں کے ماننے والے موجود ہوتے ہیں،باآوازِ بلند آمین کہنے والے بھی،ہاتھ چھوڑ کے نماز پڑھنے والے بھی مگر کبھی کوئی تنازعہ پیدا نہیں ہوا۔''

''یہ تو اچھی بات ہے''

''فرقہ بندی بھی کوئی بری بات نہیں''

مفتی صاحب کے اس جواب نے ہمیں پریشان کر دیا۔تھوڑی دیر میں وہ خود ہی بولے''مختلف گروہوں اور فرقوں کے بننے میں اللہ رب العزت کی حکمت یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ کی ایک ایک ادا کو قیامت تک زندہ رکھا جائے۔تا کہ کوئی دستار پہنے،لمبے بال رکھے یا سر منڈائے،نماز جس طریقے سے بھی ادا کرے سنت تو ادا ہو رہی ہے کیونکہ آپ ﷺ نے مخصوص حالات میں ہاتھ چھوڑ کر بھی نماز پڑھی۔اگر ایک ہی ادا اپنائی جائے تو باقی زندہ نہ رہیں گی۔فتنہ تب پیدا ہوتا ہے جب ہر گروہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم ہی سچے اور جنت کے وارث ہیں۔''

''آپ نے ٹھیک کہا مفتی صاحب!''

ارمان یوسف کا پشتنی تعلق مظفر گڑھ سے ہے لیکن سکونت برسہا برس سے لندن میں ہے۔ارمان صاحب خوبصورت لب و لہجے کے شاعر اور ایک اچھے انشاء پرداز ہیں۔مختلف رسائل و جرائد میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔طنز و مزاح ان کا سلوبِ بیان ہے۔ان کی اوّلین تصنیف ''لندن ایکسپریس'' ہے۔یہ اُن کا سفرنامہ ہے جو''ارمغانِ ابتسام'' میں بھی قسط وار شائع ہو رہا ہے۔''ارمغانِ ابتسام'' کے اولین کرم فرماؤں میں سے ہیں۔

مزاحیہ

اقبال حسن آزاد

وزن

ایک اردو رسالے کے مدیر کو اِن باکس میں میسج موصول ہوا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام!"

"کیسے ہیں آپ؟"

"الحمدللہ! سب خیریت ہے۔"

"آپ کا رسالہ ماشاءاللہ بہت اچھا ہے۔"

"شکریہ!"

"کیا میں آپ کے رسالے کے لیے کوئی افسانہ بھیج سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں، ضرور۔"

"آپ اپنا ای میل ایڈریس دیں۔"

"ابھی لیجیے۔"

مدیر نے اپنا ای میل ایڈریس بھیج دیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر ایک میسج آیا۔

"میں نے افسانہ میل کر دیا ہے۔ پلیز چیک کر لیں۔"

"او کے۔"

مدیر نے میل چیک کیا۔ افسانہ موجود تھا۔ اُس نے اسے ڈاؤن لوڈ کیا اور پڑھنے لگا۔ وہ ایک عام سی کہانی تھی جس میں زبان و بیان کی بے شمار غلطیاں بھی تھیں۔ اس نے میل کی ونڈو بند کی اور فیس بک پر آ گیا۔ پھر ایک میسج آیا۔

"آپ نے میرا افسانہ دیکھا؟"

"جی ہاں! دیکھ لیا۔"

"کیسا لگا؟"

مدیر نے اس افسانہ نگار کی حوصلہ افزائی کی غرض سے اس کی مناسب و موزوں الفاظ میں تعریف کی۔

"آپ اسے کب تک شائع کریں گے۔"

یہ سن کر مدیر تذبذب میں پڑ گیا۔ پھر کچھ سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ "آپ کو کہانی کہنے کا ہنر آتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابھی آپ کو کچھ اور مشق اور مطالعے کی ضرورت ہے۔"

اس کی بات سن کر افسانہ نگار کو غصہ آ گیا اور اس نے ترش لہجے میں کہا۔ "مطالعہ کی مجھے نہیں، آپ کو ضرورت ہے۔ آپ شاید مجھے نہیں جانتے ہیں۔ اب تک میرے سینکڑوں افسانے اور کئی درجن افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جتنا آپ کا وزن ہے اس سے زیادہ میری کتابوں کا وزن ہے۔ مجھے آپ کے رسالے میں چھپنے کا شوق نہیں ہے۔ اللہ حافظ۔"

اقبال حسن آزاد کا تعلق صوبۂ بہار (بھارت) سے ہے۔ بسلسلۂ ملازمت مونگیر میں مقیم ہیں۔ گزشتہ چالیس برسوں سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ اب تک افسانوں کے تین مجموعے "قطرہ قطرہ احساس" (۲۰۰۵)، "مردم گزیدہ" (۲۰۰۵) اور "پورٹریٹ" (۲۰۱۷) شائع ہو چکے ہیں۔ چوتھا مجموعہ "اوس کے موتی" زیرِ ترتیب ہے۔ "ارمغانِ ابتسام" کے خصوصی کرم فرما ہیں۔

ڈاکٹر امواج الساحل

ہماری بکری کا بچہ

بچے چھٹیاں گزارنے ننھیال کے گاؤں گئے تو اُن کے ماموں جن کا مویشیوں کا کاروبار تھا، کے پاس ایک نومولود بکری کا بچہ تھا، جس کے ساتھ محلے کے بچے سارا دن کھیلتے رہتے تھے۔ واپسی پر انہوں نے ایک گابھن بکری بچوں کے ساتھ کردی کہ یہ تم لوگوں کے لئے تحفہ ہے اور پک اپ میں لا کر شہر بھی چھوڑ گیا۔ بچوں کی تو عید ہوگئی۔ یوں سمجھو ایک کھلونا ہاتھ لگ گیا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے. سارا دن اس کی خدمت میں لگے رہتے۔

آخر کار ایک رات کو بکری کو تکلیف شروع ہوگئی، بچے تو سو رہے تھے، اُن کی ماں نے اپنے بھائی کو فون کیا کہ اب کیا کرنا ہے، جو جانوروں کا ڈاکٹر واقف ہے وہ تو اپنی بیمار ماں کی خبر گیری کے لئے اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔

اس نے کہا کوئی مسئلہ ہی نہیں، یہ خود ہی پیدا کرلے گی، بس تم اگلی ٹانگوں کے پیچھے ہاتھ رکھ کر ذرا اس کی مدد کردو۔

اُس کا شوہر میرے پاس آیا کہ امی اب کیا کریں، آپ کو تو تجربہ ہوگا۔

میں نے ڈانٹا ''کیا مطلب ہے تمھارا؟ میں کوئی بکری ہوں؟؟''

اُس نے کہا کہ بھائی نے کہا ہے کہ خود ہی پیدا ہو جائے گا بس

آپ یہ بتائیں بعد میں کیا احتیاط کرنی ہے؟
میں نے فلسفہ جھاڑا ''بعد کی احتیاط تبھی کریں گے جب وہ خیریت سے فارغ ہوگی بے وقوف۔''
''اچھا پھر بتائیں!''
''اب اگر مجھے پتہ ہوتا تو اب تک بتا نہ دیتی!''
''کیا آپ نے کبھی نہیں دیکھا بکری کو بچہ کیسے پیدا کرواتے ہیں؟''
''نہیں، البتہ عورت کو دیکھا ہے۔''
''تو وہی بتا دیں۔۔۔''
اب جو میں نے بتانا شروع کیا تو اس کی بیوی نے آ کر اسے بلا لیا، وہ گیا اور فوراً واپس آ گیا، کہنے لگا'' آپ صرف یہ بتائیں بعد میں کیا کرنا ہے۔''
میں نے کہا ''سب سے پہلے تو ناف کاٹنی ہوگی تاکہ وہ انڈیپینڈینٹ ہو جائے۔''
اس نے کہا ''پھر؟''
میں نے کہا ''پھر دونوں کی غذا کا بندوبست کرنا ہے۔''
اس نے پوچھا'' کیا کھلانا ہے؟''
میں نے کہا ''وہ تو کسی سے پوچھ لیں گے، پہلے ناف کاٹنی سب سے اہم ہے ورنہ ماں بیٹا دونوں مر بھی سکتے ہیں۔''
اس نے پوچھا ''کیسے کاٹیں؟''
میں نے پھر فلسفہ بگھارا'' اب کوئی خاص چیز تو ہے نہیں ہمارے پاس، تو چھری کو آگ پر خوب گرم کرو، یہاں تک کہ سرخ ہو جائے، تاکہ جراثیم وغیرہ مر جائیں، پھر ٹھنڈی کرو پھر اس سے ناف کاٹ دیں گے اور کام ختم۔ یا ٹھہرو، ایسے کرو ڈیٹول سے صاف کر لیتے ہیں، مگر کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔''
اس نے کہا ''گاؤں فون کر کے بھائی سے نہ پوچھ لیں؟''
میں نے کہا ''یہ بھی ٹھیک ہے۔''
اس نے کہا ''دیکھوں تو کیا پوزیشن ہے!''
وہ پچھلے صحن میں گیا اور میں نے نیٹ پہ سرچ کرنی شروع کر دی، یقین کریں اُردو، عربی اور انگلش، تینوں زبانوں میں تلاش کیا

مگر کسی ویب سائٹ پر یہ انفارمیشن نہ ملی کہ بکری کا بچہ کیسے پیدا کروایا جاتا ہے۔
اتنے میں وہ بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا'' امی، وہ بچہ تو پیدا ہوتے ہی صحن میں اچھلنے کودنے لگ گیا!''
میں نے کہا ''ہائیں، کہیں کچھ ہو نہ جائے اسے، آرام کرواؤ۔''
اس نے کہا ''ہم نے بھائی سے پوچھا ہے، اس نے کہا ہے کہ جانور ایسے ہی پیدا ہوتے ہیں، یہ انسانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔''
مگر میں کس کام کی فلسفی تھی آخر، سوچنے لگ گئی کہ اگر یہ پیدا ہوتے ہی بھاگنا شروع کیا ہے تو ماں کے پیٹ میں زندہ کیسے رہا، غذا کیسے ملتی رہی اسے؟ اور پیٹ کے ساتھ جڑا ہوا تھا تو علیحدہ کیسے ہوا بغیر کسی مدد کے؟
پھر ہم ماں بیٹا سرچ کرنے لگ گئے، مگر مجال ہے جو کسی نے یہ بات لکھی ہو۔ دو دن اسی سسپینس میں گزر گئے، شرم کے مارے دونوں میاں بیوی گاؤں والے بھائی سے جس نے یہ تحفہ دیا تھا کچھ نہ پوچھ سکے۔ آخر دوسرے گاؤں سے رشتے دار ملنے آئے تو میں نے ان سے اس بابت پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کمزور سی جھلی ہوتی ہے جو کہ پیدائش کے جھٹکے سے الگ ہو جاتی ہے اور بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تب جا کر میری تسلی ہوئی۔

ڈاکٹر خورشید نسرین، ادبی دنیا میں امواج الساحل کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ قطر کے مختلف تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتی رہی ہیں، عربی شاعری ان کا میدانِ سخن ہے، سب سے پہلے انکی رباعیاں قطر میں چھپیں، عرب شاعری کو ہائیکو سے روشناس کرایا، عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں افسانے ترجمہ کئے، اپنے بھی دونوں زبانوں میں لکھے، عربی شاعری کا اردو شاعری میں اور اردو شاعری کا عربی شاعری میں بھی ترجمہ کیا۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں مستقل لکھتی ہیں۔

مزاحیہ

میرے تیماردار

دلشاد نسیم

اکثر اوقات انسان موذی سے موذی مرض اور مہلک ترین بیماری سے تو بچ سکتا ہے، حکیم یا ڈاکٹر کے حملوں سے تو بچ جاتا ہے لیکن تیمارداروں کی یلغار کی تاب نہ لا کر چل بستا ہے۔ کچھ ''پیشہ ور'' تیماردار تو ایسے موقع کی ٹوہ میں رہتے ہیں کہ خاندان میں کہیں کسی کی ناساز طبیعت کی افواہ بھی سن لیں تو عین ناشتہ یا کھانے کے وقت بمع اہل وعیال موقع پر پہنچ جائیں گے اور اپنے خطرناک مشوروں، آزمودہ ناکام نسخوں اور ٹوٹکوں سے مریض کو ہلکان کر ڈالیں گے۔ شاید ان دِنوں میرے بھی ستارے گردش میں تھے کہ مجھے بخار نے آلیا۔ سب نے آ کر امی کے کان بھرنے شروع کر دیے کہ خدا خیر کرے، آج کل ڈینگی اور کانگو جیسے مہلک اور جان لیوا اَمراض کا رواج ''فیشن'' کی طرح عام ہو چکا ہے۔

رات تو خیریت سے گزر گئی لیکن صبح آٹھ بجے جب امی کے اصرار پہ میں نے چائے رس زہر مار کیے تو اس کے بعد امی مجھے لے کر ہسپتال آ گئیں۔ ڈاکٹر نے تسلی کی خاطر چند ٹیسٹ لکھ دیے۔ ابھی ٹیسٹ چل ہی رہے تھے کہ ہمارے دور پار کے خالو قدرت اللہ اپنی مٹکا سی توند سہلاتے نمودار ہوئے۔ اُن کے پیچھے سرتا پیر سفید چادر میں ملفوف اُن کی اہلیہ بمع اپنے چار بچوں کے تھیں۔ خالہ جان نے ہمارے سرہانے بیٹھ کر میرا ہاتھ اپنے آہنی ہاتھوں سے لے لیا اور انگوٹھے سے فرضی آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں ''اماں حد ہو گئی، نوبت یہاں تک آ گئی اور ہمیں خبر بھی نہیں، وہ تو تمہاری پھوپھی نے نسرین کو اتفاقاً فون کیا تو یہ الم ناک خبر سننے کو ملی، یہ تو رات ہی آنے کا کہہ رہے تھے، میں نے بہت مشکل سے سمجھا بجھا کر روکا، اب صبح سے تمہارے لیے مونگ کی دال کی کھچڑی، دلیہ اور کریلے کا سوپ بنانے میں لگی ہوئی تھی۔ ہمت کرو۔ اللہ چاہے تو تنکے میں جان ڈال دے۔ ویسے اللہ نہ کرے

ڈینگی تو نہیں ہوگیا ناں؟''

امی سن کر بے ہوش ہونے ہی والی تھیں کہ خالہ کی محبت امڈی میرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولیں۔''اے ہے دیکھو تو بچی ایک دن میں کیسی پیلی پڑ گیا جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا۔ یہ کمبخت مارا پیلیے کا مرض ہی نہ ہو، ہائے ہائے بڑا خطرناک مرض ہے۔ پچھلے ہفتے ہمارے گلی میں مرزا چھکن اسی موذی مرض سے۔۔۔''

''اوہو آپ بھی حد کرتی ہیں۔ مرزا تو گردے فیل ہونے کی وجہ سے اللہ کو پیارے ہوئے تھے'' خالو بولے ''مجھے تو ہیضے کی علامات لگ رہی ہیں۔'' اور پھر ہمارے اوپر مشفقانہ نظریں ڈالتے ہوئے کہنے لگے ''ارے بھئی نکالو وہ مونگ کی دال کی کھچڑی اور کریلے کا سوپ۔۔۔''

''نن۔۔۔نہیں میں ابھی ناشتہ۔۔۔''

خالو کی تو ندا اچھلی ''ارے بھئی، ہم نے بھی ابھی ناشتہ کرنا ہے۔''

ابھی میں خالو کے لگائے ہوئے زخموں کو سہلا رہی تھی کہ ہماری تائی اماں لڑکھڑاتی ہوئی، ہانپتی کانپتی وارد ہوئیں۔ امی نے اُن کو سہارا دے کر کرسی پر بٹھایا۔ جب ان کی سانس کچھ درست ہوئی تو میری طرف متوجہ ہوئیں۔

''ارے بس تمہاری محبت میں کھنچی چلی آئی ہوں۔۔۔ تم نے بھی کیسا بیہودہ ہسپتال چنا ہے، بھلا بتاؤ گیٹ پر دیکھتے ہی دو پہلوانوں نے ہمیں دبوچ لیا اور زبردستی اسٹریچر پر ڈالنے لگے۔'' اس کے بعد ہماری طرف قابل رحم نظر ڈالتے ہوئے خالہ سے کھسر پھسر کرنے لگیں ''ڈاکٹر کیا کہتا ہے۔۔۔ ہے کچھ امید۔۔۔ بے چاری عمر ہی کیا ہے اس کی۔۔۔''

''بس دعا کریں، مجھے تو رہ رہ کر نسرین کا خیال آتا ہے۔ کیسے گزرے گی ممتا بڑی چیز ہے!''

میں نے اِن بزرگان کے وسوسے سن کر محسوس کیا کہ واقعی میں اب قریب قریب مرنے والی ہوں۔

اِسی دوران ابا کے دوست مولوی انور علوی تسبیح گھماتے ہوئے داخل ہوئے۔ چونکہ بیٹھنے کے لیے جگہ نہ تھی اس لیے امی نے اخلاقاً پلنگ سے اٹھ کر بیٹھنے کی دعوت دی، جسے انہوں نے اطمنان سے قبول کر لیا۔ اب امی کھڑی تھیں اور علوی انکل ہمارے پلنگ پر تقریباً نیم دراز ہوگئے۔ میں تکیے پر بیٹھ گئی۔۔۔ علوی انکل کہنے لگے ''اوہو، چہرے پر ایک دن میں اتنی سوجن، بلاوجہ ڈاکٹروں کے چکروں میں پڑے ہو۔ حاجی اللہ بخش کی خاک شفا کی صرف دو چٹکیاں کافی تھیں۔''

زیر لب کچھ بڑبڑائے، پھر پھونک کے ساتھ تھوک کی پھوار نے میرا چہرہ تھوڑا بھگویا مجھے بہت غصہ آرہا تھا۔ لیکن مجھ سے زیادہ غصہ انکل کو آنے لگا جب میرے تکیہ کے نیچے سے جھانکتے خواتین کے ناول پر نظر پڑتے ہی لاحول کہتے ہوئے کھڑے ہوگئے کہنے لگے۔ ''حد کرتی ہیں آپ بھابی۔ ایسے نازک وقت میں اس قسم کی کتابیں پڑھنے کے بجائے سورۃ یسین کا ورد رکھو۔ اللہ نے توبہ کا دروازہ آخری سانس تک کھلا رکھا ہے۔''

ابھی موجودہ تیمارداروں کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی کہ ہماری محلے والی خالہ کمیٹی کی کرخت آواز سنائی دی، جو کسی سے ہمارا پوچھتی ہوئی آرہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ پورا کمرہ گھوم رہا ہے اور میں کسی گہری کھائی میں گرتی جارہی ہوں کیونکہ انہوں نے آ کر مجھے تقریباً مار ہی دیا تھا۔ امی سے گھبرا کے کہا ''امی میرا بخار اتر چکا ہے۔۔۔''

امی نے میری صورت دیکھ کے تمام تیمارداروں سے معذرت کی اور کہا ''ایک ذرا ٹمیسٹ ہی تو ہے پھر کرالیں گے۔''

دلشاد نسیم صاحبہ کا میکہ تو کراچی ہے مگر روایتی ہجرت کے بعد مستقل سکونت زندہ دلانِ شہر لاہور میں ہے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے۔۔۔ افسانہ۔۔۔ ناول۔۔۔ ناولٹ۔۔۔ ڈرامہ سبھی کچھ لکھتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن بھی فرماتی رہتی ہیں۔ فیس بک پر ادبی گروہ ''ادبیکا'' کی منتظم بھی ہیں اور شعراء کو مشقِ سخن کروانے کے سلسلے میں خاصی متحرک ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں یہ ان کی پہلی کاوش ہے۔

صداقت حسین ساجد

ایک دیہاتی بکرا خرید کر اپنے گھر جا رہا تھا کہ چار ٹھگوں نے اسے دیکھ لیا

ایک بولا ”کیوں ناں! آج اس بکرے کی دعوت نہ اڑائی جائے؟“

یہ سن کر باقی اچھل پڑے۔”نیکی اور پوچھ پوچھ۔۔۔ بہت نیک ارادہ ہے۔“

پھر وہ چاروں سر جوڑ کر منصوبہ بندی کرنے لگے۔ چاروں ٹھگ اس کے راستے پر کچھ فاصلے سے کھڑے ہوگئے۔ وہ دیہاتی کچھ آگے بڑھا، تو پہلا ٹھگ اس سے آ کر ملا اور بولا”بھائی صاحب! ایک بات پوچھوں؟“

دیہاتی سادگی سے بولا”جی جی۔۔۔ پوچھیے!!“

”یہ کتا کہاں لے کر جا رہے ہو؟“

یہ سن دیہاتی نے اسے گھور کر دیکھا اور بولا”بے وقوف! تجھے نظر نہیں آ رہا کہ یہ بکرا ہے۔۔۔ کتا نہیں۔“

”اچھا! میں سمجھا کہ یہ کتا ہے۔۔۔“ اتنا کہہ ٹھگ دوسرے راستے پر مڑ گیا۔

دیہاتی بڑبڑاتے ہوئے اپنے راستے پر چلتا رہا۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا، تو دوسرا ٹھگ آن ٹکرایا، اُس نے کہا”یار! یہ کتا تو بڑا شان دار ہے۔۔۔ کتنے کا خریدا؟“

دیہاتی نے اسے بھی جھڑک دیا "تم اندھے ہو؟"
"نہیں۔۔۔کیوں؟"
"نہیں۔۔۔اگر تم اندھے نہ ہوتے، تو تمھیں یہ بکرا، بکرا ہی دکھائی دیتا۔۔۔کتا نہیں۔۔۔"
"اوہ! تم اسے بکرا کہتے ہو، تو یہ بکرا ہی ہوگا۔۔۔ورنہ مجھے تو کتا ہی دکھائی دے رہا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ بھی آگے بڑھ گیا۔
اب دیہاتی تیز قدموں سے اپنے گھر کی جانب بڑھنے لگا۔
وہ ابھی تھوڑا ہی آگے گیا تھا کہ تیسرا ٹھگ سامنے آگیا۔ اس نے کہا "جناب! یہ کتا کہاں سے لیا؟"
یہ سنتے ہی دیہاتی تشویش میں مبتلا ہو گیا کہ کہیں واقعی کتا تو نہیں۔ تاہم بولا "تمھیں غلط فہمی ہو رہی ہے، یہ کتا نہیں، بکرا ہے۔"
"اوہ! واقعی مجھے ہی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" یہ ٹھگ بھی آگے بڑھ گیا۔
اب دیہاتی اسی شش و پنج میں مبتلا باقی ماندہ راستہ کاٹنے لگا۔
آخر چوتھے ٹھگ سے اس کا ٹکراؤ ہوگیا۔ وہ بولا "جناب! کتا تو تم نے شان دار لیا ہے۔۔۔کیا اس کتے کو گھاس کھلاؤ گے؟"
اب تو دیہاتی کے اوسان خطا ہو گئے اور اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ چار بندے تو جھوٹ نہیں بول سکتے تھے اور وہ اندھے بھی نہیں ہو سکتے تھے۔
"یہ واقعی کتا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ اس بکرے کو چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔
یوں اُن چاروں ٹھگوں نے بکرا ٹھگ لیا اور پھر اسے بھون کر مزے سے ہڑپ کر گئے۔
من حیث القوم ہمارا بھی عین اِسی دیہاتی والا حال ہے۔

ساجد حسین صداقت بچوں کے ادیب ہیں، نو عمری میں ہی کئی کتابوں کے مصنف بن چکے ہیں۔ بچوں کے تقریباً ہر رسالے میں ہر ماہ اِن کی تحریریں تسلسل سے شائع ہو رہی ہیں۔ اُن کا اندازِ تحریر خاصا شگفتہ اور دلآویز ہے۔ "ارمغانِ ابتسام" ان کی تحریریں میں پچھلے برس سے شائع ہو رہی ہیں۔

جوتے

اِس دفعہ میں نے جوتوں کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے، میرے جوتے اتنے آرام دہ ہیں کہ اب تو جوتوں کے ساتھ ہی سوتا ہوں اور اس نیت سے شب نیند میں گزار لیتا ہوں کہ صبح ہو تو گھومنا پھرنا شروع کر دوں۔
گزشتہ چند دن سے مجھے یہ حیرت انگیز تجربہ بھی پہلی بار ہوا کہ جوتے آرام دہ ہوں تو خواہ مخواہ نامعلوم سمتوں بھاگنے کو جی مچلتا ہے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس دفعہ میں لاہور سے ایبٹ آباد کی جانب بھاگنے کی تیاری کر رہا ہوں، یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ آرام دہ جوتے اس مشہور شخصیت نے پہنے ہوں گی جس نے لاہور کی گرمیوں سے تنگ آ کر مانسہرہ کے خوش گوار موسم کی طرف بھاگ کر اپنی ہجرت مکمل کر لی تھی۔
میرا ایک استاد کہا کرتا تھا کہ جب تمہارا کسی کی بدگوئی کرنے کا بہت جی کرے اور کیے بغیر رہا بھی نہ جائے تو اس ذلیل کا نام نہ لینا، نام ظاہر نہ کر کے تم جتنی بھی بدگوئی کرو گے تمہارے گناہوں کے کھاتے میں جمع نہیں ہوگا، تو میں کسی کا نام نہیں لینا چاہتا، میں نیک انسان ہوں اور چھوٹے گناہوں سے بطورِ خاص خود کو بچا کر رکھتا ہوں، وہی بات کہ:

دامن نچوڑے تو فرشتے وضو کرے

میں اپنی ساکھ کا بٹہ نہیں لگا سکتا اور جب بہت سارے فرشتے میرے دامن نچوڑنے کے انتظار میں رہتے ہیں وضو کرتے ہیں، تو یہ بالکل نہیں چاہوں گا کہ اِتنے سارے فرشتوں کے وضو میں مشکلات پیدا کر دوں۔
میرے جیسے تو گنتی کے چند بھی نہیں محض ایک ہم ہیں، جو آپ سے مخاطب ہیں تو کوئی مجھ سے یہ جاننے کی کوشش ہرگز نہ کرے کہ ایسے جوتے خرید کر جس میں خواہ مخواہ بھاگنے کو جی مچلتا ہے کس کی سنت پوری کرنے کے لئے ہے۔

راشد حمزہ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

کہتے ہیں کہ زندگی میں سب سے وفادار اور پائیدار موٹاپا ہی ہوتا ہے کہ جو ایک بار انسان میں آ جائے تو عمر بھر اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ موٹاپے کا یہ فائدہ بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں کہ اس کا شکار کبھی ڈھکا چھپا نہیں رہ سکتا۔ اور بہت دور سے ہی نظر آ جاتا ہے ۔ موٹاپا زدہ انسان نہ صرف دوسروں کے طنز کا نشانہ بنتا ہے بلکہ خود اس کی اپنی زندگی بھی وبال جان بن جاتی ہے ۔ شستہ مزاحیہ شاعری میں اگرچہ تضحیک کا پہلو نمایاں ہونا کوئی احسن بات نہیں ۔ اور کسی کے قد، کاٹھ، رنگت اور جسمانی عیوب کی نشاندہی کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی تخلیقات ہیں ۔ مگر مٹاپا اس سے تھوڑا سا اس لئے مختلف ہے کہ بقول سید ضمیر جعفری ؎

یہ بڑھاپا تو مجھ کو خدا نے دیا
ہے مٹاپا مگر میرا خود ساختہ

اور ڈاکٹر مظہر عباس اس خود ساختگی کا ذمہ دار انسان کے نفس کو ٹھہراتے ہوئے کہتے ہیں ؎

تیری بیماری کا ذمہ دار ہے تیرا چکن
یعنی بریانی، نہاری، قورمہ، کٹلس، چکن

موٹے حضرات پر گھڑے گئے لطائف کی کمی نہیں اور مزاحیہ شعراء نے بھی اس موضوع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر محفل میں موجود افراد کچھ نہ کچھ طنز کر ہی ڈالتے ہیں۔ کسی

صاحب کی جب ایسے لطیفوں کے باعث فربہ حضرات کی دل آزاری کی طرف توجہ دلائی گئی تو وہ کہنے لگے کہ آپ نے دیکھا نہیں موٹے لوگ تو اکثر خود بہت بذلہ سنج اور خوش مزاج ہوتے ہیں اور وہ اسے دل آزاری سمجھتے ہوئے دل پر نہیں لیتے بلکہ خود بھی اس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ جب کہ دوسرے صاحب کا خیال تھا کہ موٹے لوگ اس لئے ایسے ہوتے ہیں کہ نہ تو وہ کسی سے لڑ سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے پیچھے بھاگ کر اس کی پٹائی کر سکتے ہیں۔ لہذا وہ اسی میں عافیت سمجھتے ہیں کہ وہیں بیٹھے بیٹھے مسکرا لیں۔

مبالغہ آمیزی ساحل سمند پر ایک موٹا آدمی استراحت فرما رہا تھا کہ لائیف گارڈ نے آکر اس سے التجا کی کہ جناب ذرا راستہ دے دیں کیونکہ سمندر کی لہر ساحل پر بڑی دیر سے پہنچنے کی کوشش کر رہی ہے مگر اسے جگہ نہیں مل رہی۔

کسی سینما ہال میں ایک موٹی عورت داخل ہوئی اور ٹکٹ چیکر کو دو ٹکٹ پکڑائے۔ ٹکٹ چیکر نے پوچھا کہ یہ دوسرا ٹکٹ کس کا ہے، وہ کون ہے اور کہاں ہے؟ موٹی عورت شرما کر بولی ''دراصل میں کچھ زیادہ ہی موٹی ہوں اور ایک سیٹ میں آسانی سے سما نہیں سکتی لہذا میں نے دو ٹکٹ لے لئے ہیں''۔ اس پر ٹکٹ چیکر پریشانی سے اپنا سر کھجاتے ہوئے بولا کہ یہ ہے تو بڑی دیانت داری کی بات ہے مگر مشکل یہ آپڑی ہے کہ آپ کے ٹکٹ نمبر ۵۶ اور ۲۶ ہیں۔

اِسی طرح کی مبالغہ آمیزی ہمیں مزاحیہ شعراء کے ہاں بھی بہت وافر مقدار میں ملتی ہے۔

بعد شادی نجانے کیا ہوگا
آج تو انگ انگ ٹوٹ گیا
خواب میں تجھ کو دیکھا تھا موٹی
اور میرا پلنگ ٹوٹ گیا

عبدالحکیم ناصف

دوستی کا بھی شوق ہے تجھ کو
ویٹ تھوڑا گھٹا نہیں سکتی
تیری تصویر اتنی موٹی ہے
فیس بک میں سما نہیں سکتی

عبدالحکیم ناصف

دل میں بساؤں تجھ کو میں بیگم بھلا کہاں
یہ بات ہی نہیں ہے مرے اختیار میں
تیری پہاڑ جیسی جسامت ہے جانِ من
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

نامعلوم

موٹاپے کی وجوہات بڑھتی ہوئی عمر ہو یا خوش خوراکی، سہل پسندی اور تن آسانی ہو یا ورزش سے دوری سب ہی موٹاپے کا باعث ہیں۔ مزاحیہ شعراء ان وجوہات کو اپنے اپنے طریقے سے بیان کرتے نظر آتے ہیں۔

بڑھاپا اور مٹاپا

جوانی دور ہم سے بے ارادہ ہوتی جاتی ہے
سبھی کے پیٹ پر چربی زیادہ ہوتی جاتی ہے

ڈاکٹر عبدالرحمان عبد

خوش خوراکی اور مٹاپا

ضرورت سے زیادہ کھانا موٹاپے کی ہمیشہ سے ایک اہم وجہ رہا ہے۔ مٹاپا زدہ عورت کو جب ایک ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ محترمہ اس لعنت سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ اب آپ صرف ایک روٹی کھایا کریں تو مریضہ جلدی سے بولی کہ ڈاکٹر صاحب یہ ایک روٹی کھانے سے پہلے کھانی ہے یا بعد میں۔

اس طرح طے کیا زیست کا راستہ
دو قدم جب چلے کرلیا ناشتہ
یہ بڑھاپا تو مجھ کو خدا نے دیا
ہے مٹاپا مگر میرا خود ساختہ

سید ضمیر جعفری

اے مریضِ خوش غذا عبث جو تو اداس ہے
حقیقتاً ترا مرض ترے کچن کے پاس ہے

سید ضمیر جعفری

ہے خدا سے گلہ یہ پیٹو کا

جتنا موٹا ہے پیٹ پیٹو کا
نہیں راہِ دہن کھلی اتنی
یعنی چھوٹا ہے گیٹ پیٹو کا

معین اختر نقوی

دو منٹ میں ہی پیٹ میں پیٹو
پورا بکرا اتار لیتا ہے
اور جو اس کی رسید مانگے تو
یہ فقط اک ڈکار لیتا ہے

معین اختر نقوی

علامہ حسین میر کاشمیری خود فربہ تھے یا نہیں البتہ ان کے اشعار میں خوارک کا تذکرہ بہت ملتا ہے۔ پیروڈی لکھنے میں ماہر تھے۔ اختر شیرانی کی مشہور نظم ''اے عشق کہیں لے چل کے نمونے پر'' ''اے پیٹ کہیں لے چل''، حفیظ جالندھری کی نظم ''یوں وقت گزرتا ہے فرصت کی تمنا میں'' پر ''یوں وقت گزرتا ہے روٹی کی کشاکش میں'' عبدالمجید سالک کی نظم ''تمہی سے اے مجاہدو جہان کا ثبات ہے'' کی پیروڈی ''تمہی سے اے شکم ورو تواہے اور پرات ہے'' پڑھنے کے قابل ہیں۔ ذیل مین ان کی دو نظمیں پیش کی جارہی ہیں جو اس قول کی صداقت پر خود ہی دلیل ہیں۔ اپنی نظم ''پیٹوؤں کا جنگی ترانہ'' میں یوں رقم طراز ہیں۔

تمہیں سے اے شکم ورو تواہے اور پرات ہے
تمہاری توند مایۂ قدور راسیات ہے
تمہاری ہی ڈکار سے خروشِ شش جہات ہے
ضیافتی مجاہدو تمہاری کیا ہی بات ہے
جو تم نہ ہو تو بے ضیا یہ ساری کائنات ہے

کرو جو بزم میں کبھی نمائش دلاوری
تو کانپ جائے میز پر رکابی اور طشتری
جو گردنِ پرند پر رواں ہو تیز تر چھری
تو جذبۂ شکم وری یہ کہہ اٹھے ہری ہری
''بٹیر کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے''

غالباً ۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ اگر ۳۷ء، یا ۳۹ء یا ۴۰ء میں بھی پیدا ہوتے تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ سنا ہے کہ بچپن میں ہر بات میں بلا کی تندی و تیزی دکھاتے تھے۔ بزرگ سر ہلا ہلا کر کہتے یہ لڑکا ضرور کچھ کرے گا۔ جوان ہو کر موٹر ڈرائیور بنے۔ ان دنوں بس ڈرائیور ہیں۔ آپ نے برسوں کے تجربے سے موٹر چلانے کے چند سنہرے اصول وضع کیے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ موٹر ہمیشہ سڑک کے بیچ میں چلاؤ کیونکہ سائیکل والے اور پیدل حضرات جان بوجھ کر سڑک کا درمیانی حصہ استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ کسی کو آگے مت نکلنے دو۔ اگر کوئی ہارن بجا بجا کر تنگ کرنے لگے تو دائیں طرف ہو کر کچے راستے کی دھول اس پر ڈالو۔ خود ہی پیچھے ہو جائے گا۔

۳۔ اگر کوئی موٹر آگے جا رہی ہو تو اسے اپنی ذاتی توہین سمجھو اور فوراً آگے نکل جاؤ خواہ راستہ ہو یا نہ ہو۔

۴۔ موڑتے وقت گاڑی کی رفتار کم از کم پچاس میل فی گھنٹہ ہونی چاہیے ورنہ موشن ٹوٹ جائے گا اور ناحق گیئر بدلنا پڑے گا۔

۵۔ گیئر بدلنے اور بریک لگانے سے ہمیشہ احتراز کرو۔ اس طرح مشینری گھسنے سے بچ جائے گی۔

۶۔ رات کو سامنے سے گاڑی آ رہی ہو تو اللہ کا نام لے کر اس پر روشنی چھوڑ دو۔ یہ دوسرے ڈرائیور کا فرض ہے کہ اپنی موٹر کس طرح بچائے۔

۷۔ یاد رکھو ہر حادثے میں بس ڈرائیور دیسی فلموں کے ہیرو کی طرح صاف بچ جاتا ہے۔ چنانچہ حادثے سے پہلے دروازے سے کود جانے کے لیے تیار رہو۔ (ہر ہفتے اس کی ریہرسل کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔)

۸۔ رات کو حادثہ کرتے ہی موٹر کی بتیاں بجھا کر پوری رفتار سے بھاگ نکلو۔ تاکہ کسی گاڑی کو نمبر معلوم نہ ہو سکے۔

''مستری رحمت بخش'' از شفیق الرحمٰن

جو کوفتوں کو چکھ چکے تو فیرنی کو چٹ کیا
جو شوربے پہ آ گرے تو خالی ایک مٹ کیا
کلوا سے لے کے تا گلو کا ورد تم نے جھٹ کیا
قضا جو لائی ہیضے کی تو ''اف'' کیا نہ ''بٹ'' کیا
قضا سے بھی جو نہ ڈرے وہ پیٹوؤں کی ذات ہے

کباب مرغ ہے اگرچہ بجی ہوئی ہے طشتری
تو اس کو کھا کے فربہی میں منتقل ہو لاغری
گھٹیں جو چند بطخیں بڑھیں جہاں میں امتی
کٹیں جو چند مرغیاں تو قوم کی ہو زندگی
لہو ہے جو خروس کا وہ قوم کی زکوات ہے

کھائیں تیغ زن وہی کریں جو ذبح مرغیاں
چھری سے کھائے خوف جو چلائے کیسے گولیاں
دفاع ملک کی وہی اٹھائے ذمہ داریاں
جو کھائے سرخ کوفتے پیئے سفید یخنیاں
غلام ہے وہ فطرتاً جو وقفِ دال بھات ہے

علامہ حسین میر کاشمیری

بحرِ قلزم جو بہے چائے کا دریا ہو کر
عکسِ خورشید نظر آئے گا کلچہ ہو کر
اترے مہتاب زمیں پر جو پراٹھا ہو کر
اخترِ چرخ بریں آئے پکوڑا ہو کر
اُڑ کے بیٹھے جو کوئی دیگ کا چمچہ ہو کر
پائے گا اپنی مرادیں ید طولیٰ ہو کر
ہو نہ مغرور سر دار پہ چڑھ کر منصور
چڑھ گئے سینکڑوں یاں سیخ پہ قیمہ ہو کر
اے طبیبو کوئی تجویز نکالو ایسی
چائے نسخوں میں لکھی جائے بنفشا ہو کر
کوفتے خواب میں بھی تو جو برہمن کھالے
توڑ دیں تپ کو ترے آلو بخارا ہو کر
عقد بریانی کا جس وقت تنجن سے ہوا
لٹ گئے مفت میں واں شیخ چھوہارا ہو کر
اپنی ہستی سے گزر جا ہے جو دنیا میں فروغ
قدر شلغم کی ہوئی دیگ میں کشتہ ہو کر
پیشتر ہستیء مطلق سے مقامات فنا
بچہء مرغ نے طے کر لئے انڈا ہو کر

علامہ حسین میر کاشمیری

توند توند مٹاپے کا ایسا شناختی نشان ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ جدید سائینس تو وزن سے زیادہ پیٹ کی پیمائش پہ زور دیتی ہے ڈاکٹر بدر منیر توند کو انسانی تجاوزات میں شامل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

میری نظر میں معرکہ ہرگز نہیں ہے یہ
شہروں میں تم نے کتنے پلازے گرا لیئے
مانوں گا جب کہ جتنی ہیں توندیں بڑھی ہوئیں
ان کو تجاوزات کے کھاتے میں ڈالئے

ڈاکٹر بدر منیر

خالقِ خلق نے پرکار کو گز بھر کھولا
دائرہ کھینچ دیا ناف کا نقطہ لے کر
گز بھی بے کار رہا بازوئے خیاط کے ساتھ
ناپے آپ ہی حضرت اسے رسا لے کر
ڈوب جانے کا نہیں خوف ہے گردابوں میں
مشک پر تیرتے ہیں نام وہ اس کا لے کر
رستہ مرگھٹ کا تو ہے اور طرف کو اے جوش
یہ کدھر جاتی ہے صحت کا جنازہ لے کر

جوش ملیسانی

ایک بے تحاشا موٹے آدمی کو دیکھ کر

مٹاپے کے لئے تھوڑی سی سرجری کم ہے
گھٹانے کے لئے اس جسم کو صدی کم ہے
جو غور کیجئے لگتا ہے اس طرح مظہر
کہ اس میں توند زیادہ ہے آدمی کم ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

توند نامہ

صورتِ فٹ بال مظہر پیٹ جب بن جائے توند
پیچھے پیچھے ہم چلیں اور آگے آگے جائے توند
ہم گلے ملنا جو چاہیں پیٹ سے مل جائے توند
ایک موٹا دوسرے کی اس طرح سہلائے توند

توند سے گو جسم سارا ہوگیا بے ڈول ہے
آ گیا ہم کو یقیں لیکن کہ دنیا گول ہے
توند موٹاپے کے رستے کا وہ سنگِ میل ہے
دور سے ہی دیکھ کر جس کی عیاں تفصیل ہے
اس سے بہتر سوجھتی ہرگز نہیں تمثیل ہے
جسمِ انسانی ہے یا اک تھلتھلاتا فیل ہے
جو سمٹ سکتی نہ ہو ، ہر سمت پھیلے توند ہے
پیٹ جو ہر ایک حد کو پار کرلے توند ہے
مت بڑھا تو پیٹ اتنا اس کے پھیلاؤ سے ڈر
توند موٹاپے کا ریڈ سگنل ہے تھم تھم کر گذر
چھوڑ دے قد ناپنا ، ''پیمائشِ توند'' آج کر
اِس کو کم کرنے کی خاطر دوڑ تُو شام و سحر
مہر و ماہ و مشتری کو آج پیچھے چھوڑ دے
توڑدے ریکارڈ سارے بھاگنے کے توڑدے
تیری بیماری کا ذمہ دار ہے تیرا کچن
یعنی بریانی ، نہاری ، قورمہ ، کٹلس ، چکن
اور اس پہ تیری ہر اک چیز کھانے کی لگن
ہے علاج فربہی تیرا کہ تو سی لے دہن
فیس لے کر یوں ہوا تھا ڈاکٹر محوِ سخن
'' تُو اگر اپنا نہیں بنتا نہ بن میرا تو بن''
توند سے گر پینٹ پھسلے ڈگمگائے کائنات
باندھ لو'' گیلس'' تو کم ہوجائیں ایسے حادثات
اب بھی مظہر ہے یقیناً قولِ فیصل کو ثبات
جتنی بڑھتی بیلٹ ہے اتنی ہی گھٹتی ہے حیات
کیا بتائیں آج کل کس چیز کا کیا بھاؤ ہے
زندگی کیا ہے ، فقط اِک توند کا پھیلاؤ ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

توندنامہ

اس میں ہے بے حد لچک خود کو بڑھا سکتی ہے توند
مال نذرانے کا ہو جتنا کھپا سکتی ہے توند
چھوٹی موٹی کار کو دھکا لگا سکتی ہے توند
جتنا بھی رش ہو یہ لوگوں کو ہٹا سکتی ہے توند
پانچ چھ بچوں کو نیچے بھی چھپا سکتی ہے توند
ان کو دھوپ آندھی سے بارش سے بچا سکتی ہے توند
ایک دو لوگوں کو اوپر بھی بٹھا سکتی ہے توند
گر کے اوپر سب کا فالودہ بنا سکتی ہے توند
روسٹ چانپیں ہوں کہ ہو مرغ مسلم فکر کیا
دو پراتیں کھیر کی بھی ساتھ کھا سکتی ہے توند
جب گلے ملتی ہے مجھ جیسے کسی باریک سے
ہڈیوں اور پسلیوں کو کڑکڑا سکتی ہے توند
گر ہو بیگم باکسر سمجھے گی اس کو ''پنچ بیگ''
''پنچ'' کھانے کے لئے بھی کام آ سکتی ہے توند
کھا رہے ہیں سحری و افطار میں جو بے حساب
روزہ داری بھی نہیں ان کی گھٹا سکتی ہے توند
آج اہلِ توند کی سروس کو ہے خطرہ بہت
ہو نہ پائی کم تو اپنے گھر کو جا سکتی ہے توند
کیل کانٹے سے مگر اس کو بچانا ہے ذرا
ہوگئی پنکچر زمیں ساری ہلا سکتی ہے توند

ادریس قریشی

موٹاپے میں زن و مرد کی کوئی تخصیص نہیں لیکن اُس کو gender bias نہ کہا جائے تو کیا کہیں کہ موٹی بیوی پر تو سب نے لکھا ہے پر موٹے شوہر کا ماسوائے موٹے مولوی کے کم ہی تذکرہ ملتا ہے۔

موٹی

حسیں درکار ہے ایسی کہ ہو جس کی کمر موٹی
بھلا اب تم سے کیا پردہ کہ ہے میری نظر موٹی
کچل کر مجھ کو رکھ دے گی جو ہوگی فتنہ گر موٹی
مرے مولا دلا موٹی کہ جو ہو بے ضرر موٹی
بڑے موٹے بھی جس موٹی کے آگے چھوٹے موٹے ہوں
محبت کے لئے مل جائے ایسی معتبر موٹی

اچانک اس نظر کو تاب نظارہ کہاں ہوگی
مناسب ہو جو دو قسطوں میں آئے بام پر موٹی
ہوئیں جب چار آنکھیں جلوہ سالم نظر آیا
بھلا کس طرح دو آنکھوں میں ہوتی جلوہ گر موٹی
جہیز ایسا ضروری تو نہیں کیا فکر ہے تجھ کو
جہاں تو بیاہ کر جائے گی بھر جائے گا گھر موٹی
اذان فجر سن کر ناشتہ کرتی ہے تھوڑا سا
اڑا جاتی ہے ککڑوں کوں کو اکڑوں بیٹھ کر موٹی
اگر باہر نکلنا ہے گلے میں باندھ لے گھنٹی
تری رہ میں نہ آجائے کوئی بندہ بشر موٹی
گلی میں بچھ گئے پتھر مگر رولر نہیں آیا
ذرا گھر سے نکل کر تو چہل قدمی تو کر موٹی

انور بریلوی

وزن بیگم کا ہماری کم سے کم ہے ایک ٹن
ناشتہ لنچ و ڈنر خوراک ان کی چار من
ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر لیٹ جانے کے سوا
کام ان کو کچھ نہیں دن رات کھانے کے سوا
بیڈ چھوٹا پڑگیا دروازے چھوٹے ہوگئے
بن گئے دو چشمی ھ کولہے جو موٹے ہوگئے
بیٹھنے کے واسطے صوفہ بھی کم پڑنے لگا
آٹھ بائی آٹھ کا کمرہ بھی کم پڑنے لگا
زلزلوں کے سارے مرکز اپنے گھر ملنے لگے
ان کے چلنے پھرنے سے دیوار و در ہلنے لگے
کچھ مٹاپا بڑھ گیا یہ ہوگیا احساس بھی
ویٹ بڑھنے میں تو ہے اب زندگی کا لاس بھی
ذائقہ کردے گا تیری زندگی بدذائقہ
اک سہیلی نے دیا ہے ڈائیٹنگ کا مشورہ
آج کل بیگم ہماری کررہی ہے ڈائیٹنگ
فیٹ کے دشمن سے ان کی چل رہی ہے فائیٹنگ
ناشتہ اب ہورہا ہے بیس انڈوں کے بنا
سج رہی ہے ڈائننگ ٹیبل پراٹھوں کے بنا
دن بہ دن کم ہورہا ہے اپنی بیگم کا گریڈ
دس پراٹھے کھانے والی کھا رہی ہے دو بریڈ
رس پیا کرتی تھی کل جو دس کلو انگور کا
پی رہی ہے کھٹا پانی آج وہ اچور کا
اک مہینہ ہوگیا ہم کو بھی کھائے قورمہ
اب مٹن آتا نہیں گھر میں برائے قورمہ
لنچ میں بھی کوفتے اسٹو چپاتی آٹھ دس
ڈیڑھ لیٹر کوک پی کر میم فرماتی تھی بس
سوپ ابلی سبزیوں کا پیتی ہے شام و سحر
جو کیا کرتی تھی ڈونگوں پر ملائی کے گذر
آٹھ دس مرغ مسلم پانچ فش کھانے کے بعد
چارج بیگم صاب ہوتیں سات ڈش کھانے کے بعد
روز کشمش کھانے والی کھا رہی ہے اب چنے
تاکہ ہو ریڈیوس ٹن ٹن سائرہ بانو بنے

احمد علوی میرٹھی

تین دبلی ہیں جو کرتی ہیں تشدد مجھ پر
کاش الزام یہ ثابت میں کبھی کر بھی سکوں
اب ارادہ ہے کہ موٹی سے کروں گا میں نکاح
تاکہ گھبراوں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں

عبدالحکیم ناصف

مری بیوی کی سن کر کام گھر کے جان جاتی ہے
وہ کہتی ہے میں اس موٹے بدن پر یہ ستم جھیلوں
میں کہتا ہوں تمہیں کاموں سے گھر کے موت پڑتی ہے
وہ کہتی ہے نہیں لیکن میں اس کا رسک کیوں لے لوں

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

اب میرا گھر بھی پہلے سا خالی نہیں رہا
مفلس کے حق میں ہوگیا سب کچھ کھرا کھرا
موٹی سے شادی کرنے کا یہ فائدہ ہوا
لگنے لگا ہے میرا بھی اب گھر بھرا بھرا

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

ایک دن اماں نے بیٹے کو نصیحت کی کہ وہ
روک دے بیوی کو ورنہ ایک دن پچھتائے گا
بیٹا بولا گھومنے دیں اس کو گلیوں میں یونہی
اتنی وزنی اہلیہ کو کون لے کر جائے گا

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

اپنی فربہ اہلیہ سے اس کے شوہر نے کہا
ساری دنیا میں نہیں تیرا کوئی نعم البدل
میری ہستی کی ہے واحد ایک تو انوسٹمنٹ
دیکھتے ہی دیکھتے جو ہوگئی ہے اب ڈبل

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

شادی کے وقت ہر ایک شخص نازک اندام کم سن کم وزن اور خوبصورت بیوی کی تلاش میں ہوتا ہے۔ بہت سے خوش نصیب اس میں کامیابی بھی حاصل کر لیتے ہیں مگر :

دبلی پتلی نرم و نازک پرکشش یہ لڑکیاں
کس قدر لگتی ہیں پیاری اپنے خدو خال میں
اس قدر ہوتی ہے ان کو اپنی شادی کی خوشی
پھولتی جاتی ہیں جب جاتی ہیں یہ سسرال میں

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

یہ تو تھا پختہ یقیں ہو کر جواں
وہ بڑی ایماں شکن ہو جائے گی
یہ مگر سوچا نہ تھا کہ جلد ہی
جان من یوں پانچ من ہو جائے گی

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

موٹی سی شاعرہ پر اک بزم میں کسی نے
فقرہ یہ کس دیا تھا اللہ میاں کی گائے
بدلے میں شاعرہ نے گھنٹوں بزور بازو
بے وزن شعر پڑھ کر سب سامعیں رلائے

ادریس قریشی

وہ کہتی ہے بڑی مقبول ہوں میں
ہزاروں لوگ ہیں میرے دوانے
مگر شادی کا جب کہدوں کسی سے
بنا لیتے ہیں سب عاشق بہانے

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

یاد ہے مجھ کو ابھی ٹوٹ گیا تھا اسٹیج
جب چڑھی اس پہ وہ نو من کا مٹاپا لے کر
کپڑے دھوتے ہوئے میں نے اسے ہتھنی جو کہا
دور تک بھاگی مرے پیچھے وہ تھاپا لے کر

سید سلمان گیلانی

مشہور ہے کہ میاں بیوی گاڑی کے دو پہیوں کی طرح ہیں کہ زندگی کی گاڑی یہ دونوں مل کر کھینچتے ہیں۔ اگر میاں بیوی دونوں ہی موٹے ہوں تو بقول شاعر

خدا کے فضل سے دونوں ہیں فربہ
مجھے تو ان پہ حیرانی بہت ہے
ذرا جانچو تو ہے امید سے کون
میاں بیوی میں یکسانی بہت ہے

مرزا عاصی اختر

مسٹر دہلوی نے موٹوں کی جنسی لحاظ سے کسی قسم کی تخصیص نہیں کی بلکہ وہ دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے دکھائی دیتے ہیں (نظیر اکبر آبادی کی زمین میں تضمین) (ہر شخص کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا ---- عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا) دیکھئے۔

موٹاپا نامہ

موٹوں کے لبوں پر ہے صدا وائے مٹاپا
اس فکر میں مرتے ہیں کہ گھٹ جائے مٹاپا
جاتا نہیں اک بار جو آجائے مٹاپا
اور جائے تو موٹے کو بھی لے جائے موٹاپا
ہر شخص کو ہوتا ہے برا ہائے مٹاپا
دشمن کو بھی اللہ نہ دکھلائے مٹاپا

سنتے ہیں مٹاپے کی دوا یہ ہے مجرب
فکر و غم و فاقے کا ہو انسان مقرب

موٹے تو مگر فکر سے ہوتے ہیں مجرب
فاقہ جو کریں جسم ہو کچھ اور مخرب
ہر شخص کو ہوتا ہے برا ہائے مٹاپا
دشمن کو بھی اللہ نہ دکھلائے مٹاپا

موٹا جو محبت کے کبھی پھیر میں آئے
جاں دے کے بھی محبوب کو اپنے نہ وہ پائے
ہر چند یقیں عشق کا وہ اس کو دلائے
محبوب مگر گوشت کی دکاں میں نہ جائے
ہر شخص کو ہوتا ہے برا ہائے مٹاپا
دشمن کو بھی اللہ نہ دکھلائے مٹاپا

محبوب تو نازک ہے یہ اللہ غنی ہے
دل دینے کو بیٹھا ہے مگر جاں پہ بنی ہے
وہ پھول ہے جوہی کا ادھر توند تنی ہے
کیا گلبدنی گلبدنی گلبدنی ہے
ہر شخص کو ہوتا ہے برا ہائے مٹاپا
دشمن کو بھی اللہ نہ دکھلائے مٹاپا

پتلون نہیں توند پہ ٹکنے ہی کو تیار
ہر گام پہ کہتی ہے کہ ہشیار خبردار
اس سمت سے ٹانگوں کی مسلسل ہے یہ تکرار
ہم مقبرہ بردوش کہاں تک رہیں سرکار
ہر شخص کو ہوتا ہے برا ہائے مٹاپا
دشمن کو بھی اللہ نہ دکھلائے مٹاپا

ہیں جلد پہ شکنیں کہ ہے تالاب میں ہلچل
ہے نرم بدن اتنا کہ جیسے کوئی دلدل
ہنستا ہے بے چارہ تو شکم کرتا ہے تھلتھل
اور آمد و شد سانس کی ہے غیر مسلسل
ہر شخص کو ہوتا ہے برا ہائے موٹاپا
دشمن کو بھی اللہ نہ دکھلائے مٹاپا

گولائی و گیرائی کا ہے ایسا نظارہ
جو ایک نظر میں نظر آتا نہیں سارا
رکشے کی سواری سے بھی قاصر ہے بچارا
دو پھیروں سے کم میں ہو کہاں اس کا گزارا
ہر شخص کو ہوتا ہے برا ہائے مٹاپا
دشمن کو بھی اللہ نہ دکھلائے مٹاپا

اس ڈیل پہ موٹے کے ذرا ناز تو دیکھو
کچھ چھوئی موئی جیسے ہیں انداز تو دیکھو
جس میں سے ڈکار آتی ہے وہ ساز تو دیکھو
"اک توپ سی دغ جائے ہے آواز تو دیکھو"
ہر شخص کو ہوتا ہے برا ہائے مٹاپا
دشمن کو بھی اللہ نہ دکھلائے مٹاپا

رنجھے ہو مٹاپے پہ جو طاقت کے ہو لو بھی
ہے کھاد پہ بنیاد گلستاں یہ سنو بھی
نازک سے چنبیلی کی طرح پھول ہیں جو بھی
وہ کھاد کی وفراط سے بن جاتے ہیں گو بھی
ہر شخص کو ہوتا ہے برا ہائے مٹاپا
دشمن کو بھی اللہ نہ دکھلائے مٹاپا

موٹوں کے جنازے میں جو شرکت کو ہیں جاتے
کاندھے کی کئی روز وہ مالش ہیں کراتے
پھر ڈرتے ہیں دبلوں کی بھی میت کو اٹھاتے
ہوتے جو نظیر آج تو مسٹر یہ سناتے
بدتر ہے بڑھاپے سے میاں ہائے موٹاپا
ہر شخص کو ہوتا ہے برا ہائے مٹاپا
دشمن کو بھی اللہ نہ دکھلائے مٹاپا

مسٹر دہلوی

علاج ڈاکٹروں کے پاس فربہی کا علاج ورزش اور کم خوراکی کے سوا کچھ نہیں جب کہ حکیموں ہومیوپیتھوں اور دیگر معالجین کے پاس چرب زبانی کے ساتھ ساتھ بہت سی ادویات بھی ہوتی ہے ڈاکٹری طریقہء علاج میں بے تحاشا موٹاپے کیلئے سرجری کا نیا میدان کھل گیا ہے ۔ جسے Bariatric surgery کہا جاتا ہے ۔یہاں آپریشن سے معدے کی

جسامت وضخامت کو کم کیا جاسکتا ہے۔ یعنی بر خلاف ڈاکٹر مظہر عباس دہن سینے کے بجائے معدہ سی دیا جاتا ہے

ڈائیٹنگ مٹاپا کم کرنے کی تگ ودو میں مصروف ایک موٹے آدمی کا کہنا ہے کہ کئی برس ڈائیٹنگ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ خوراک پر پابندیاں لگانے سے کہیں بہتر ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ موٹوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کردے۔ اس طرح وہ خود کو موٹا محسوس نہیں کرے گا۔

کھانے سے نہ رک پاؤ تو پھر اپنے بدن کی
بدشکل زمیں بوس عمارات میں رہنا
موٹو تمہیں فٹ رہنے کی خواہش ہے اگر کچھ
پھر کھانے کے اوقات ہیں اوقات میں رہنا

عبدالحکیم ناصف

ڈائٹنگ کھیل نہیں چند دنوں کا بیگم
اک صدی چاہئے کمرے کو کمر ہونے تک

سرفراز شاہد

اُس نے دیا ہوا ہے، بہت ڈائیٹنگ پہ زور
ڈر ہے کہ ہو نہ جائے مرا یار مختصر

ڈاکٹر بدر منیر

کمر کسی ہے انہوں نے بھی اب کمر کو اپنی وہ کم کریں گے
مگر سنا ہے کمر کا ان کی ہے گول گھر سے بڑا گھماؤ

شوکت جمال

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ڈائیٹنگ بیک فائیر کردے تو دوائیں مٹاپے میں مزید اضافہ کردیتی ہیں:

یقیں آتا نہیں آنکھوں پہ
اپنی
کہ وہ کیا چیز یارو بن گئی ہے
دوائیں آزما کر ڈائیٹنگ کی
سوزوکی سے پجارو بن گئی
ہے

سرفراز شاہد

جب سے بیگم نے کی ہے شروع ڈائیٹنگ
ویٹ اور بڑھ گیا دو دھڑی خوامخواہ

نشتر امروہوی

ورزش کہتے ہیں کہ موٹاپا کم کرنے کے کا سب سے ستا اور آسان نسخہ تسلسل کے ساتھ ورزش ہے۔ اس کے لئے ایک ڈاکٹر صاحب نے بہت ہی آسان ورزش بتائی کہ جس کے کرنے سے انسان تھکتا بھی نہیں اور زیادہ کھانا بھی نہیں کھاتا۔ بقول ڈاکٹر صاحب ہر موٹے آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنا سر آہستہ آہستہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھمائے اور یہ عمل بار بار دہرائے جب بھی کوئی اس کو کھانا پیش کرے۔ مگر شوکت جمال کے پاس ایک اور ورزشی نسخہ موجود ہے۔ آزمائش شرط ہے۔

میں ہوں عاجز اس مٹاپے سے
کم ہو چربی یہ میری کوشش ہے
روز ہنستا ہوں اپنی حالت پر
قہقہہ بھی تو ایک ورزش ہے

شوکت جمال

جاگنگ

توند کو اپنی وہ اندر کر رہے ہیں آج کل
حرکتیں اب مثل بندر کر رہے ہیں آج کل
پہلے معدے پہ ستم ڈھایا تھا کھا کھا کر بہت
اب جفائیں اپنے اوپر کر رہے ہیں آج کل
دوڑتے ہیں ہانپ کر تو لوگ کہتے ہیں یہی
دیکھئے مظہر بھی جاگنگ کر رہے ہیں آج کل

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی اسلام آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ طبی حوالے سے مزاحیہ شاعری انہیں کی اختراع ہے۔ ان کے طنز و مزاح پر مبنی نصف درجن سے زیادہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ طنز و مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ نہایت شستہ وشگفتہ شاعری کے مرتکب بھی ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے اولین ساتھیوں میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

شہرِ سخن میں شور مچانے سے باز آ
ظالم پُرانی غزلیں سنانے سے باز آ

کھٹی ڈکاریں ہم کو دلانے سے باز آ
ظالم پرانی غزلیں سنانے سے باز آ

زوجہ بناتی فُول ہے پہلے ہی رات دن
شادی شدہ کو فُول بنانے سے باز آ

کہنے لگا یہ بھیڑ میں خارش زدہ سے وہ
ناحق ہماری پیٹھ کھجانے سے باز آ

دو دن کو گھر بدر نہ وہ کردے کہیں تجھے
بیوی کو اپنی اتنا ستانے سے باز آ

شاپنگ کا جن ڈراتا ہے آ کے خواب میں
بیگم ہماری نیند اُڑانے سے باز آ

آدابِ گفتگو کا ذرا تو خیال رکھ
اینکر پلیز لڑنے لڑانے سے باز آ

تنقید کھل کے اُردو ادب پر ضرور کر
میری غزل کے عیب گنانے سے باز آ

اٹھارویں ڈلیوری پہ بولا یہ ڈاکٹر
کمبخت چوتھی شادی رچانے سے باز آ

کہتا تھا جمعدار کہ گلکاریاں نہ کر
نسوار کھا کے پیک اڑانے سے باز آ

پہلے ہی شہرِ جاں میں ہے آلودگی بہت
اے دل جلے تو دل کے جلانے سے باز آ

شاعر بچارہ داد کا بھوکا ازل سے ہے
مظہر نہ کہہ کہ شعر سنانے سے باز آ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

مری غزل کی کریں گے وہ اب حجامت لو
اُٹھا کے آگئے ناقد تمام کسبت لو

نہ تالیاں نہ لفافہ نہ کوئی میڈل ہے
تو شعر کہنے کی ہر جمعہ کیوں مصیبت لو

چراغِ جاں کو جلاؤ تم اپنے خوں سے فقط
امیرِ شہر سے بس تحفۂ مذمت لو

فقیر جھولیاں بھر لے کھڑا رہے مزدور
کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ بھائی اجرت لو

حجامت اپنی کبھی استرے سے ہوتی تھی
تو بعد عقد کرے استری حجامت لو

ادھورا سرقہ غزل کا کچھ اس طرح سے کرو
ردیف رکھ لو مگر اس کا قافیہ مت لو

بہت سی غزلیں تمہیں میری جان لکھ دوں گا
"بس ایک دن کے لئے کام سے اجازت لو"

کہاں ہو جی کی صدا سن کے ڈر گئے مظہر
کہ ہم تو بھاگے کہ اب اپنی آئی شامت لو

تنویر پھولؔ

دلوں میں ہے یہ وسوسہ پیارے لیڈر!
کہ تم دو گے ہم کو دغا پیارے لیڈر!

قسم اپنی کرسی کی تم کھاؤ فوراً
کرو وعدۂ بے ریا پیارے لیڈر!

نہ اُڑ جائیں دیکھو! درختوں سے کوّے
لگانا نہ تم قہقہہ پیارے لیڈر!

بہت لطف دیتی ہے تم کو یہ کرسی
تمھیں آ گیا ہے مزا پیارے لیڈر!

یہ کہتے ہو، خوش حال کر دو گے ہم کو
نہ وعدہ ہو یہ پھُسپھُسا پیارے لیڈر!

ہڑپ کر کے بیٹھے ہو تم قومی دولت
نہ آتی ہے تم کو حیا پیارے لیڈر!

جو کرسی سے اُترے، ہوئے تم ہو گنجے!
بتاؤ، ہے کیا ماجرا؟ پیارے لیڈر!

کوئی مانو منت، کرو جیب خالی
ہو باغِ تمنا ہرا پیارے لیڈر!

گریباں میں منہ ڈالو اپنے، رہو چُپ
سُنو پھولؔ کا زمزمہ پیارے لیڈر!

تنویر پھولؔ

قوالی مچھروں نے سنائی تمام رات
چھکّن چچا کو نیند نہ آئی تمام رات

گرمی تو گو شدید تھی، مچھر کے خوف سے
منہ پر چچی نے ڈالی رضائی تمام رات

مجھ کو لگاؤ سوئی نہ تم، تندرست ہوں
دیتے رہے چچا یہ دُہائی تمام رات

عیش و طرب میں مست تھے اہلِ صفائی سب
بزمِ نشاط خوب سجائی تمام رات

بھتہ ملا، مشاہرہ گھر بیٹھے مل گیا
دعوت کباب کی بھی اُڑائی تمام رات

جب کاٹنے وہ آیا تو ہُشیار کر دیا
مچھر نے اپنی شان دکھائی تمام رات

محسوس ہو رہا تھا کہ مچھر سپیرے ہیں
بین اپنی خوب ہی تھی بجائی تمام رات

مچھر یہ بولا ہم سے، میں ہرگز نہیں حقیر
ہے یہ بجا کہ ماروں بڑائی تمام رات

اے پھولؔ! میں نے کر دیا نمرود کو ہلاک
مچھر نے داستاں یہ سنائی تمام رات

ڈاکٹر منظور احمد

کوئی ثانی نہیں ترے سر کا
فرش جیسے ہو سنگِ مرمر کا

ایک ڈاکے نے خواب توڑ دیے
مال جو تھا کمایا اوپر کا

پٹ کے کتنا حسین لگتا ہے
تیرا چہرہ کسی ٹماٹر کا

آنکھ بیگم سے جونہی ٹکرائی
حال مت پوچھیے دلاور کا

چیٹ پر تھی یہاں سے سترہ کی
نوجواں تھا وہاں سے ستھ ؟ ر کا

بات پھر معرکے پہ ختم ہوئی
معاملہ تھا سڑے چقندر کا

ڈوبنا تو اسے ضروری ہے
مسئلہ دوست ہے چلو بھر کا

کیسی حالت میں ہالٹ رکھا ہے
وہ نہ اندر کا اور نہ باہر کا

کب وہ منظورؔ قرض لوٹا دے
روز دیتا ہے جو حسیں ٹرکا

ڈاکٹر منظور احمد

نوجوان نسل دکھاتی ہے نظارے کیا کیا
اشتہارات سے پھرتے ہیں بے چارے کیا کیا

ایک عاشق کو جو امید بھری لفٹ نہ ملی
بیچتا پھرتا ہے گلیوں میں چھوارے کیا کیا

وہ تو لیلیٰ ہے زباں دف کی سمجھ لیتی ہے
عاشقِ نو نے پٹے طبلے بِگھارے کیا کیا

مستقل جڑ کسی ماٗس کی کہاں ہوتی ہے
اپنے اطراف کے پرلوک سدھارے کیا کی ا

کسی صورت مجھے آرام ذرا آ جاتا
ٹیبلٹ حلق سے معدے میں اتارے کیا کیا

ایک مُجھو نے فقط گیٹ سے جھانکا ہی تو تھا
اور پھر ہم پہ ہنسے چوک چوبارے کیا کیا

اس کی تعریف نے حلقوم کا وہ حال کیا
صبح تا شام کیے ہم نے غرارے کیا کیا

وہ کسی اور کی منظورؔ نظر ہو بیٹھی
نوٹ ہم نے بھی بچھائے تھے کرارے کیا کیا

عرفان قادر

مجرموں کو کبھی ایسی بھی سزا دی جائے!
اُس کو چھے، اِس کو غزل ایک سُنا دی جائے!

''ٹائی ٹینک'' کی بکنگ آج ہوئی ہے اوپن
سب رقیبوں کی ٹکٹ، کیوں نہ کٹا دی جائے؟

میرے سُسرال کا ہمسایہ ہے ڈونلڈ ٹرمپ
رُعب لوگوں پہ ہو، بے پر کی اُڑا دی جائے!

ساس کہتی ہے کہ آئی ہے کہاں سے یہ چڑیل
آس رکھتی ہے بہو، کب یہ فسادی جائے؟

شام تک شہر کے ہر شخص کو ہو گی معلوم
بات، جاٹو کو اگر کوئی بتا دی جائے!

پھونک سے اُڑ کے، سفر قیس کیا کرتا ہے
اُف یہ لیلیٰ، کہ ٹرالر پہ ہی لادی جائے!

جب بھی آپس میں ملیں، کرتے ہیں گِٹ مِٹ دونوں
جولیٹ رومیو کو اُردو سکھا دی جائے!

بحر و بر میں ہے غزل، قافیے ٹیڑھے میڑھے
داد کیونکر تجھے، اے ماہ لقا! دی جائے؟

اک نیا ردِ "بلا" کا ہے طریقہ یہ بھی
کر مقابل میں کھڑی اور ''بلا'' دی جائے!

عرفان قادر

کوچۂ ہیر سے ہرگز نہ گزر شام کے بعد
چاروں جانب ہی اُبلتے ہیں گٹر شام کے بعد
فرماں بردار وہ بیوی کا ہے کتنا، شوہر
بیٹھ کر چھیل رہا ہے جو مٹر شام کے بعد
لوڈ شیڈنگ کے کمالات ہیں، کچھ اور نہیں
اک اندھیرا سا ہے تا حدِ نظر شام کے بعد
دن کو لیکچر وہ شرافت کے دیا کرتا ہے
جو چڑھا جاتا ہے دو چار لِٹر شام کے بعد
کھانا ہوٹل سے ہی کھانے کا بہانا ہو گا
دردِ سر ہوتا ہے بیگم کو اگر شام کے بعد
چرس کے سُوٹے لگاتے ہوئے بیٹھے ہیں ''جہاز''
روڈ کے ایک کنارے پہ، مگر شام کے بعد
پکڑے جانے کا بہت خطرہ ہے دن کو، اے دوست
آتے جاتے ہوؤں کی جیب کتر شام کے بعد
جعل سازی میں نہیں کوئی بھی ثانی اُس کا
مال کرتا ہے اِدھر سے وہ اُدھر شام کے بعد
بے تکے شعر جو دن بھر میں کہے ہوتے ہیں
اُن کو لگ جاتے ہیں سُرخاب کے پر شام کے بعد!
ایک تحقیق سے ثابت یہ محقق نے کیا
کان پر جُوں کو نہیں ہوتا اثر شام کے بعد
وقت پر گھر جو نہ آیا تو سزا ایسی ملی
رات فٹ پاتھ پہ کی پوری بسر شام کے بعد
جھاڑتا رہتا ہے دفتر میں جو ماتحتوں کو
جھاڑو جا کر وہ دیا کرتا ہے گھر شام کے بعد
صبح کو ایک اداکارہ کو چھینک آئی تھی
ہے ابھی تک یہی ٹی وی پہ خبر، شام کے بعد
سُن لے دس غزلیں مری ساتھ میں چھ نظموں کے
کچھ تو بے چارے کا احساس بھی کر شام کے بعد

نوید صدیقی

ہو گیا ہے کلام ہمن بھر کا
ایک نوزائیدہ سخن ور کا

پہلے اس کا دماغ تھا سر میں
اب وہ کھاتا ہے گوشت بھی خر کا

اس کی باتوں میں سب چھلکتا ہے
میل جتنا ہے اس کے اندر کا

پورے دوفٹ وہ مجھ سے تھا چھوٹا
میرا دشمن نہ تھا برابر کا

بے شبہ اس پہ خوب جچتا ہے
خط کے آخر میں لفظ "احقر" کا

پاس میرے بھی شکلِ زوجہ میں
ایک ماڈل ہے سن تہتر کا

درد۔نزلہ۔زکام اور کھانسی
اور تحفہ ہے کیا نومبر کا؟

مانگتا ہے بس اک ہزار کا نوٹ
حوصلہ دیکھیے گداگر کا

چبھ رہی ہے بدن میں نوکِ قلم
''مجھ کو دھوکہ ہے تارِ بستر کا''

آخرِ شب جو آئے باہر سے
اف وہ شوہر! نہ گھاٹ نا گھر کا

نوید صدیقی

بادشاہت گو باری باری ہو
کچھ تو احساسِ ذمہ داری ہو

کیوں نہ بکرا اُسے لگے پیارا
''جسے بچھڑے نے لات ماری ہو''

کچھ تو ہو امتحانِ عشق آساں
وصل یا ہجر اختیاری ہو

ہے یہ صورت بھی نسبتِ معکوس
ایٹمی ملک اور بھکاری ہو

بس وہی محترم یہاں ، جس کی
بات ہلکی ہو، جیب بھاری ہو

نیوز چینل کی ہے یہی کوشش
ہمیں حاصل نہ جانکاری ہو

کیا کھلے گا برا بھلا کہ جہاں
سب کو یکمشت داد جاری ہو

کام کے شعر ہم کہیں گے مگر
گھر کے دھندوں نے مت نہ ماری ہو

پھر وہ چلتا نہیں کبھی سیدھا
جس نے تھانے میں شب گزاری ہو

منیرانور

میرا اُس سے یہ حادثاتی عشق
اصل میں ہے جمالیاتی عشق

فیس بک تک رہے تو بہتر ہے
اپنے مابین لمحہ جاتی عشق

دیکھ کنگال کر گیا مجھ کو
تیرا میرا مواصلاتی عشق

ابر و باراں میں ٹرٹراتا ہے
میرے یاروں کا ''مینڈکاتی'' عشق

وہ یہ کہتے ہیں بچے دو اچھے
کیجیے یعنی وقفہ جاتی عشق

دیکھ کر نثری نظم سی صورت
پڑ گیا ماند ''شاعراتی'' عشق

اپنے اپنے ہیں دائرے سب کے
کون کرتا ہے کائناتی عشق

بن گیا ہے غزل منیر انور
اس سے میرا مکالماتی عشق

منیرانور

''چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ''
بزرگی آئے گی تم پر مگر آہستہ آہستہ

ابھی تم ناک پر رومال رکھو اور گذر جاؤ
کہ ہوں گے بند ابلتے یہ ''گٹر'' آہستہ آہستہ

''یونہی اک رات اپنے دل کا قصہ بھی سنا لینا''
مری کے ''مال'' پر، امکان بھر، آہستہ آہستہ

ابھی نو واردانِ جامعہ آنکھیں چراتے ہیں
حسینوں پر کھلیں گے ان کے پر آہستہ آہستہ

اسے جب سے کراٹے میں ملا تھا بیلٹ اک کالا
''ہم اس کے پاس جاتے تھے مگر آہستہ آہستہ''

ہر اک چینل پہ لیڈر تیسرے درجے کے ہیں انور
شرافت ہو رہی ہے در بہ در آہستہ آہستہ

عابد محمود عابدؔ

کرپشن ڈراما یقینی بنائیں
اقامہ پنامہ یقینی بنائیں

وہ بے لوث عُشاق خود کو مسلسل
حسینوں کا کاما یقینی بنائیں

حکومت جنھیں جاب دیتی نہیں ہے
وہ بیوی کو ماما یقینی بنائیں

ہمیشہ خدا دے ہمیں ایسے لیڈر
جو بہبودِ عامہ یقینی بنائیں

کسی دل سے نکلیں کسی دل میں گھس کر
دلوں میں اقامہ یقینی بنائیں

سیاست میں کرنی ہے پل پل ترقی
کوئی "چاچا ماما "یقینی بنائیں

رقیبوں کی محفل میں بھی پیارے یارو!
سبھی کو سلاما یقینی بنائیں

تلاوت تک ان کو نہیں آتی عابدؔ
وہی سارے گاما یقینی بنائیں

اشفاقؔ اسانغنی

تخت پر قابض ہے لوگو! آج خواروں کا ہجوم
ملک کی حالت بگاڑے گا گنواروں کا ہجوم

شیخ جی جب سے بیاہ کر لائے ہیں چوتھی دلہن
گھر کے آگے اُن کے رہتا ہے کنواروں کا ہجوم

باندھ کر سہرا مہک پھولوں کی سونگھی آخری
دور ہم سے ہو گیا پھر تو بہاروں کا ہجوم

ہائے کیا دن تھے جوانی کے ہمیں ابتک ہیں یاد
گھیر کر رکھتا تھا ہم کو ماہ پاروں کا ہجوم

نامکمل رہ گئیں بیگم کی ساری خواہشیں
پڑ گیا پیچھے مرے جب قرضداروں کا ہجوم

بیویاں مصروف ہیں بازار میں اور ساتھ میں
دھکے کھاتا پھر رہا شوہر بیچاروں کا ہجوم

شکریہ رب کا ادا کرتے سدا ہیں شیخ جی
ساتھ میں چلنے لگا ہے جو دلاروں کا ہجوم

چھیڑ کر سسرالی باتیں مت کریدو زخم کو
بیرحم ہوتا ہے یارو خارزاروں کا ہجوم

دوست ہی کام آئے ہیں اشفاقؔ آڑے وقت میں
ساتھ میرے ہے سدا اک غم گساروں کا ہجوم

شاہین فصیح ربانی

چھڑے ہیں اور چھڑا پن اس طرح مناتے ہیں
کہ جوس پیتے ہیں اور چاکلیٹ کھاتے ہیں

وہ پل گھڑی کبھی دنیا میں لوٹ آتے ہیں
پھر ایک دم سے خیالوں میں ڈوب جاتے ہیں

اسی کے رنگ میں وو شعر ہم سناتے ہیں
کہ جس کے واسطے محفل میں روز آتے ہیں

گھڑی پہ اپنی الارم نہیں لگاتے ہیں
وہ نیک لوگ ہیں مچھر جنھیں جگاتے ہیں

پرانے سارے تو دنیا سمجھنے لگ گئی ہے
سو ہم بھی ان کو اشارے نئے سکھاتے ہیں

وہ چائے پی کے بھی چپ ہے تو پھر یہی ہوا نا
کہ شعر ہم کسی دیوار کو سناتے ہیں

شنید ہے کہ بہت ڈٹ کے مار کھاتے ہیں
معاملاتِ OTHER میں جو ٹانگ اڑاتے ہیں

کبھی گزرتے ہوئے ان سے پوچھ ہی لوں گا
میں ڈاکٹر ہوں جو آنکھیں مجھے دکھاتے ہیں

اقبال شانؔہ

بجلی تو کوندتی ہے میاں آسمان میں
اور تھر تھرا رہے ہو تم اپنے مکان میں

آنکھوں سے سُن رہا ہوں میں آواز آپ کی
تصویر آپ کی نظر آتی ہے کان میں

یوں سامنا ہمارا ببر شیر سے ہوا
جب ایک تیر بھی نہ بچا تھا کمان میں

اب آپ شوق سے مجھے غزلیں سنائیے
میں نے بھی روئی ٹھونس لی ہے اپنے کان میں

پلے ہمارے کچھ بھی نہیں پڑ رہا ہے آج
وہ بات کر رہے ہیں نظر کی زبان سے

ہر سمت ہم کو آتا نظر ہے ہرا ہرا
وہ سبز کپڑے پہن کے بیٹھے ہیں لان میں

شانؔہ وہ صرف داب میں بیگم کی اپنے ہیں
ورنہ غضب کا قہر تھا چنگیز خان میں

نوید ظفر کیانی

بھرے جب سے دو تین ٹبر کھچا کھچ
ہوا ہے سیاست کا منچر کھچا کھچ

ہمارے ہی ٹیکسوں کا پیسہ اُڑا کر
بنے ہیں وہ لیڈر مخیّر کھچا کھچ

اگر تم کسی اور کی ہوگئی ہو
ہمارے بھی دل میں ہیں دلبر کھچا کھچ

بھلا ہیروئن کی سمگلنگ میں کیا ہے؟
بھرو بوریوں میں ٹماٹر کھچا کھچ

کوئی کام کا بندہ ملتا نہیں ہے
اسمبلی میں دیکھے مچھندر کھچا کھچ

اگرچہ بہت مفلسی کا ہے رونا
بہر سو ہے جنسِ دِساور کھچا کھچ

بھرو ہاسٹل بے گھروں سے دبا دب
بچھائے چلے جاؤ بستر کھچا کھچ

سمجھتے تھے ہم جس کو دیوارِ گریہ
وہاں تھاپے جاتے ہیں گوبر کھچا کھچ

کہاں نغمگی پاپولر سنگروں میں
گروپوں میں ہیں سارے جھینگر کھچا کھچ

پلاننگ اِدھر بھی کہ اب ہیں ظفرؔ جی
ہمارے وطن میں سخنور کھچا کھچ

نوید ظفر کیانی

گھورتا ہے اُس کا بھائی فیل تن علیٰحدہ
اور رقیب بھی بنا ہے ٹارزن علیٰحدہ

پولیٹکس میں نہیں تو چانس ہی گنوا دیا
جن کے بینک میں بھرا کا کالا دھن علیٰحدہ

کالی پیلی سی صحافتوں کے طور دیکھئے
سُرخیاں علیٰحدہ ہیں اور متن علیٰحدہ

بیویوں کے ہاتھ میں بھی بیلنوں کے ہیں تبر
اور دور بھی خاصا پُرفتن علیٰحدہ

اُس کی سازشوں سے ہی پٹا ہوں میں مبینہ
دے رہے تھے جو وفاؤں کے وچن علیٰحدہ

بیویوں کا شک میاؤں پر بھی پہلے کم نہیں
حشر ڈھا رہا ہے پنکی کا چلن علیٰحدہ

تین تین مرلوں کے گھروں میں ہم کرائے دار
لے کے بیٹھے ہیں وہ گلشنِ عدن علیٰحدہ

دال بھات سے میاں کے یار کی مدارتیں
کر لیا ہے اپنے واسطے چکن علیٰحدہ

لیڈروں کی پود بھی سیاستوں میں آ گھسی
تن گئی ہے قوم پر یہ اور گن علیٰحدہ

لوٹتے نہیں زنانہ وار ہی مشاعرے
بزم میں وہ کر رہے ہیں چھن چھنن علیٰحدہ

محمد خلیل الرحمٰن

عارفہ صبیح خان

اِک سہما شوہر بیوی کو چندا کہہ کے پکارے
اس کو لگا کر گرہن لیکن ہنڈیا خوب بھگارے

ایوانوں کی بدنامی پر جائیں نہیں حضور
یہ وہ جگہ ہے جہاں ملتے روز نئے چٹخارے

ہے محدود سکینڈل لیکن بہتر رہے یہ سکینڈل
شہرت کی خواہش میں کھانے پڑ نہ جائیں چھوہارے

کچھ لمحے تو دیکھتی رہ گئی ماہ جبیں کو میں بھی
کیسے اس نے زلفیں باندھیں، کیسے بال سنوارے

کیا پدی کیا پدی کا ہے شوربہ میرا دشمن!
دنگ ہوا محبوب جو دیکھے میک اپ کے لشکارے

نابالغ تھے جو وہ فلمیں دیکھ کے ہو گئے بالغ
کبھی کسی کو بوسہ دیں ، یہ کبھی کریں یہ اشارے

دیکھنے کو تو سوکھی سڑی ہے لیکن رعب تو دیکھو
چوبیس گھنٹے کام کریں بس اس کے میاں بچارے

عمر کو کم کرنے کی خاطر رکھا اُس نے سرجن
اُبٹن حُسن نکھارے تو انجکشن فگر سنوارے

زمانے سے رنج و الم دور کر دوں
دلوں کو خوشی سے میں معمور کر دوں

کہ شادی سے پہلے ہو عمرہ ضروری
مرے بس میں ہو تو یہ دستور کر دوں

وہ میک اپ کرانے مرے پاس آئے
تو کالی کلوٹی کو اک حور کر دوں

وہ چاہت کے کاسے کو بھر دے وفا سے
''محبت کی دنیا میں مشہور کر دوں''

محبت کے نغمے پڑوسن کو بھائیں
سنا کر اُسے کیوں نہ مسحور کر دوں

اگر سیکھنا چاہو روٹی پکانا
تمھارے حوالے میں تندور کر دوں

کسی بے نوا کو میں نام اپنا دے کر
خلیلؔ اس جہاں میں ہی مغرور کر دوں

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

اس پہ پیرٹ کلر لگا رکھا
ہجر کا زخم یوں ہرا رکھا

اس نے بیگم کی پہلی برسی پر
ایک نمکیں مشاعرا رکھا

پوری دنیا کو ان فرینڈ کیا
بس بشیراں سے رابطہ رکھا

دے کے دعوت ہمیں مرنڈے کی
اس کا وینو جکارتہ رکھا

مری ریٹنگ ہے قیس سے بہتر
خود کو اس شک میں مبتلا رکھا

اس کے ماں باپ کے بھی کیا کہنے
نام نکرے کا معرفہ رکھا

بل بھی دینا ہے ہوٹلنگ کا عزیزؔ
یہ خیال اس نے کونسا رکھا؟

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

ہر سیانے کو سمجھدار نہ سمجھا جائے
وہ جو ریڑھی ہے، اسے کار نہ سمجھا جائے

بھیک منگتوں کی جو اشرافیہ سوسائٹی ہے
اس کو خیرات کا حقدار نہ سمجھا جائے

اس کو پونی کی کراتا ہوں میں شاپنگ اکثر
مجھ کو اک عاشق نادار نہ سمجھا جائے

ہجر میں ٹسوے بہانا مری مجبوری ہے
سو مجھے عادی عزادار نہ سمجھا جائے

خودکشی کی مری دھمکی کا یہی مطلب ہے
خود کشی پر مجھے تیار نہ سمجھا جائے

اس کے حقے پہ کوئلے سے یہ لکھا ہوا تھا
اس کو تاثیر میں نسوار نہ سمجھا جائے

چارپائی پہ جو دن رات پڑے رہتے ہیں
اس کو اک عام سی دیوار نہ سمجھا جائے

تیسری زوجہ کی رحلت پہ کہا ملا نے
ہم ہیں اب تین، ہمیں چار نہ سمجھا جائے

یہ ہے ڈیمانڈ مرے شہر کے لوہاروں کی
پاپ سنگر کو بھی لوہار نہ سمجھا جائے

صدر تقریب کا کہنا ہے کہ دوران بزم
ہو سکے تو، اسے بیدار نہ سمجھا جائے

جس میں بیگم کو گھمانے کہیں لے جانا پڑے
ایسی تعطیل کو اتوار نہ سمجھا جائے

اس میں ٹف ٹائلیں لگ جائیں کہ ہو کارپٹڈ
کوچہ یار کو ہموار نہ سمجھا جائے

مجھ کنوارے کو مرے دوستو اک فیصد بھی
ساس بردار، سسر دار نہ سمجھا جائے

اس کی عادت ہے فقط پوچھنا ہر چیز کا نرخ
ایسے گاہک کو خریدار نہ سمجھا جائے

خادم حسین مجاہد

عشق کا دردِ لادوا نہ ملا
اور حسینوں کا آسرا نہ ملا

بھاگ جاتی وہ موقع پا کے مگر
کیا کرے ڈھنگ کا آشنا نہ ملا

ملنے سیلاب میں بھی آ جاتے
کوئی کشتی کوئی گھڑا نہ ملا

ڈش کا کیبل کا شور ہے گھر گھر
کوئی در ہم کو بے صدا نہ ملا

سب اسمبلی میں ہو گئے ہیں جمع
شہر میں اب کوئی گدھا نہ ملا

توڑتے ہم ریکارڈ مجنوں کا
ہائے صحرا کا آسرا نہ ملا

سیّد جواد حسن جوّاد

مچل کے توڑا جو تربوز ایک دن سر سے
دماغ جاگ اُٹھا ہڑبڑا کے ٹکر سے

وہ دال خور کو مدلول کہہ گئے ناقد
کبھی نہ گزرا تھا تنقید کے جو دفتر سے

چبکتی لفظوں کی چھاگل یو جھانک کر دیکھی
غزل سرا کئی مینڈک تھے اس کے اندر سے

ہم اس سے ملنے گئے اور وہ ادب پرور
مکان اوڑھ کے باہر نکل گیا گھر سے

سنائی دیتے ہیں جوتوں کے قہقہے اکثر
مزاج تھانے کا ہم پوچھتے نہیں ڈر سے

چلے تھے جگنو کی انگلی جو تھام کر شب کو
وہ کھا کے ''جگنو'' کی لاتیں ہوئے ہیں ششدر سے

سویرے اوس کے دانے جو گنج پر اُچھلے
اُٹھا تڑپ کے وہ جوّاد اپنے بستر سے

روبینہ شاہین بیناؔ

کتنی اچھی ہے اختلافی سوچ
بوجھ لگتی نہیں اضافی سوچ

کون ہے جو شریک جرم رہا
کس نے مانگی نہیں، معافی سوچ

اور کچھ میں نے سوچنا ہی نہیں
مجھ کو بس ہے تمھاری کافی سوچ

اس کے بٹوے کے منہ کھلیں کیسے
اور مل پائے تجھ کو ثانی سوچ

منہ سے نکلی ہوئی پرائی بات
بات کرنے سے پہلے کافی سوچ

یہ جو تیری ہے اختلافی سوچ
یہ شرافت کے ہے منافی سوچ

دشت چھانا ہے ارتھ گوگل پر
اس کو کہتے ہیں جیو گرافی سوچ

دل کی پاکیزگی میسر ہے
صوفیوں کی ہے کتنی صافی سوچ

کن لفافوں کی حکمرانی ہے
عام کر دی گئی لفافی سوچ

کیسے مانوں کہ ٹھیک کہتے ہو
جو اصولوں کے ہو منافی سوچ

دفعہ لگتی ہے آپ پہ لازم
آپ کی بھی ہے انحرافی سوچ

عقل گھٹنوں میں ہے اگر اس کے
کیسے لیتی ہے جانیں عافی سوچ

یہ افاعیل میں ڈھلے نہ ڈھلے
خاص بیناؔ کی ہے زرافی سوچ

روبینہ شاہین بیناؔ

مرید زن کی کوئی سلطنت نہیں ہوتی
وزیر ہوتا ہے پر مملکت نہیں ہوتی

منی ٹریل اُسی کی ٹریس ہوتی ہے
جسے بھی دھن کو چھپانے کی گت نہیں ہوتی

وہ کر رہے ہیں وکالت شریف گنجوں کی
کہ جن کی وگ پہ خجالت کی چ؟ت نہیں ہوتی

تمام عمر وہ چلتا ہے ٹیڑھے رستے پر
کمر پہ جب کسی پپو کے لت نہیں ہوتی

وہ لڑ جھگڑ کے ہی لیتا ہے جیب کا خرچہ
لڑے بغیر کبھی منفعت نہیں ہوتی

کوئی بھی کام کی فائل جو آئے دفتر میں
بغیر زر کے کبھی دست خط نہیں ہوتی

گرینڈ ساس کا عہدہ بھی باس جیسا ہے
کہ بات جو بھی کہے وہ غلط نہیں ہوتی

کہ لوٹ سیل پہ لٹ جاتی ہے مری تنخواہ
اس آمدن میں ذرا بھی بچت نہیں ہوتی

ہوا کے زور پہ چلتا ہے ہاتھ لیلیٰ کا
''ہوا کے پاس کوئی مصلحت نہیں ہوتی''

مزاح رنگ میں کہتی ہوں بات سنجیدہ
یہ شاعری مری بیناؔ جگت نہیں ہوتی

نشتر امروہی

شادی کے بعد رہتا ہے آزار کچھ نہ کچھ
بیگم سے روز ہوتی ہے تکرار کچھ نہ کچھ

کپڑے ، سلائی، بیوٹی پارلر و ہوٹلنگ
خرچوں کی روز بڑھتی ہے رفتار کچھ نہ کچھ

اک ماہ رو کے ساس گئی ہیں جمعہ کے دن
ہنگامہ پھر سے لائے گا اتوار کچھ نہ کچھ

گھر میں بھی ڈانٹ پڑتی ہے بیگم کی صبح و شام
آفس میں بھی ہے باس کی پھٹکار کچھ نہ کچھ

اب تو مشاعروں میں ترنم کا شور ہے
نقصان کر رہے ہیں گلوکار کچھ نہ کچھ

لے کر لور کو ساتھ بھٹکتے ہیں دربدر
یو پی میں پیار ہو گیا دشوار کچھ نہ کچھ

تنقید کر کے سونو نگم نے اذان پر
خالی پڑا تھا، کر لیا پرچار کچھ نہ کچھ

عتیق الرحمٰن صفی

ہنسنے سے اجتناب میں ہاسا نکل گیا
ایویں سے رعب داب میں ہاسا نکل گیا

پہلے تو اس کے جوک پہ آئی نہ کچھ ہنسی
پھر یوں ہوا کہ خواب میں ہاسا نکل گیا

اک دلربا نے ڈیٹ پہ مجھ سے یہ جب کہا
ہڈی نہیں کباب میں ہاسا نکل گیا

مجھ کو تو یاد آ گیا تھا واقعہ کوئی
تیرا ہے کس حساب میں ہاسا نکل گیا

جوں ہی نکاح خواں نے یہ پوچھا قبول ہے
فوراً مرا جواب میں ہاسا نکل گیا

اک رسمِ قل کے ختم پہ ملّاں نے جب کہا
حوریں بھی ہیں ثواب میں، ہاسا نکل گیا

گزرے ہیں زندگی میں کچھ ایسے بھی پل جنھیں
لکھتے ہوئے کتاب میں ہاسا نکل گیا

سیّد فہیم الدین

گڑ بڑ یا گھوٹالہ ہے
آخر میرا سالا ہے

جیل ہو یا کہ تھانہ ہو
اس کا دیکھا بھالا ہے

بیگم کرتی ہے ترلے
دال میں کوئی کالا ہے

گھر سے مجھ کو بیگم نے
لاکھوں بار نکالا ہے

میرے پاس منسٹر کا
خط ہے اور حوالہ ہے

شہر کا ایک اک بھتہ خور
میرا جاننے والا ہے

دھندہ پھڈے بازی کا
میں نے آن سنبھالا ہے

گھر کے پیچھے کچرا گھر
آگے گندا نالا ہے

دودھ تو کم کم آئے گا
پانی اور گوالہ ہے

ریاض احمد قادری

کباب اس نے ٹکایا ہوا ہے روٹی پر
میں دیکھوں کیا یہ لگایا ہوا ہے روٹی پر

جو دل سے یادِ خدا بھول کر ہوئے گمراہ
خدا نے ان کو لگایا ہوا ہے روٹی پر

زیادہ آگ سے یا تو یہ جل گئی ہو گی
یا نقشہ گھر کا بنایا ہوا ہے روٹی پر

بس ایک روٹی کھلا کر سنو گے قوالی
ہر ایک گیت سنایا ہوا ہے روٹی پر

سوائے روٹی کے تجھ کو ملے گا کچھ بھی نہیں
وہ تکیہ جس نے لگایا ہوا ہے روٹی پر

تمام عمر وہ سر کو اٹھا نہیں سکتے
جنہوں نے خود کو جھکایا ہوا ہے روٹی پر

اے دوست سر کو اٹھا روٹیاں ملیں گی خود
کیوں سر یہ اپنا گرایا ہوا ہے روٹی پر

تلاش کرتی ہے روٹی اسے بھی ہر لمحہ
ضمیر جس نے گنوایا ہوا ہے روٹی پر

ریاض اس کی نہیں ہے مثال کوئی بھی
جو شعر تو نے سنایا ہوا روٹی پر

ڈاکٹر عارفہ صبح خان

ویگن ڈرائیور نام ہی کافی ہے

زندگی کیا کسی ویگن کی سواری ہے یارب
جس میں ہر اسٹاپ پر دھکے لگے جاتے ہیں

دنیا بھر کی خطرناک سواریوں میں رکشہ اور ویگن سرِفہرست ہیں۔ دنیا کی ساٹھ فیصد آبادی رکشوں اور ویگنوں کی سواری ہے۔ یہ سواریوں کی مجبوری ہے کہ وہ رکشہ یا ویگن میں بیٹھ کر اپنی زندگی کے لمحے گننا شروع کر دیں۔ پاکستان میں رکشہ اور ویگن عوامی سواریاں ہیں۔ امریکہ کے سابق صدر ریگن نے پاکستان کے سابق صدر ضیاء الحق سے ایک بڑی رقم لینے کے باوجود ایف سولہ طیارے محض اس لئے نہیں دئے کہ ایک دفعہ صدر ریگن نے پاکستان کی ویگنوں کا نظارہ کر لیا تھا۔ مرحوم ضیاء الحق نے صدر ریگن کو بڑا سمجھایا کہ جناب ہمارے ہاں یہ ایک گھٹیا اور غلیظ سواری ہے آپ ویگن سے خواہ مخواہ ڈر گئے ہیں، لیکن صدر ریگن کانوں کو ہاتھ چھو کے کہتے رہے "یسوع مسیح خیر"۔ جب صدر ریگن نے ویگن چلتے دیکھی تو بولے کہ میں ایف سولہ طیارے نہیں دوں گا۔ بلاوجہ میرے ایف سولہ طیارے کی توہین ہوگی۔ میرے ایف سولہ طیارے احساس کمتری کا شکار ہو جائیں گے۔ اِتنے تیز تو ہمارے میزائل نہیں چلتے بلکہ پینٹاگون میں بھی ایسا تیز ہتھیار نہیں بنا جو آپ کے رکشہ اور ویگن کا مقابلہ کر سکے۔ صدر ریگن نے بہت سارے دیگر الزامات کے علاوہ یہ عندیہ بھی ظاہر کیا کہ پاکستان میں جو ہیروئن فرخت ہوتی ہے اس کا توڑ تو ہمارے پورے ہالی وڈ کی ہیروئنوں کے پاس بھی نہیں ہے۔۔۔ اسی طرح جو ویگنیں اور رکشے آپ کے ہاں تیار ہوتے ہیں ان ساخت کے ماڈل تو شاید تیار کئے جا سکیں مگر آپ جیسے ویگن ڈرائیور تیار کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ آپ کے ویگن ڈرائیوروں کے آگے ہمارے سیاستدان بے بس ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے ویگن ڈرائیوروں کی وجہ سے میری قوم بھی کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو۔ یہ انسان ہیں یا بھوت۔۔۔ میرا مطلب ہے انسان ہیں یا بجلیاں۔ یہ کہہ کر صدر ریگن نے راستے سے ہی اپنے ایف سولہ طیارے واپس منگا لیے۔

پاکستان میں ویگن ایک کارآمد مگر خطرناک ترین سواری ہے۔ اگر حادثات کے اسباب معلوم کرنا ہوں تو معلوم ہوگا کہ حادثات کی تمام تر وجوہات میں ویگن ڈرائیوروں کا ہاتھ ہے خواہ حادثہ یہ خود کریں یا کوئی دوسرا۔ وجہ یہ خود بنتے ہیں دیگر سواریاں محض اپنے بچاؤ کے لئے دائیں بائیں یا آگے پیچھے ہوتی ہیں اور حادثہ رونما ہوتا ہے۔ ویگن ڈرائیور سر پہ کفن باندھ کر ڈرائیونگ کرتے ہیں اور شاید یہ سوچ کر بھی کہ یہ ان کا آخری سفر ہے لیکن یہ

ان کا معمول کا سفر ہوتا ہے البتہ ان کی ویگن کی زد میں آنے والے کا ہمیشہ آخری سفر ثابت ہوتا ہے۔ویگن ڈرائیور اپنی زندگی میں کئی بندے اور بندیاں مارتے ہیں لیکن کبھی پکڑے نہیں جاتے اور پکڑے نہیں جاتے تو تختہ دار پر بھی نہیں جاتے۔غالب قبل از وقت ویگن ڈرائیوروں پر یہ شعر لکھ گئے تھے۔

تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

ویگن ڈرائیور چاہے چار فٹ کی گلی سے گزریں مگر اپنی چھ فٹ چوڑی ویگن اس تنگ گلی سے نکال کر لے جائیں گے۔سڑک سے سائیکل گزرنے کی جگہ نہیں ہوتی لیکن ویگن ڈرائیور کمال ہوشیاری سے ویگن آگے نکال کے لے جائیں گے۔اشارہ توڑنا اور اشارے کرنا دونوں ہی ان کے محبوب مشاغل ہیں اور وہ صبح پانچ بجے سے رات بارہ بجے تک یہی شغل کرتا ہے۔کسی نے عمر شریف سے پوچھا'' کہ بھائی آپ کس سے متاثر ہیں۔'' عمر شریف نے جواب دیا کہ'' وہ ویگن ڈرائیور سے متاثر ہیں بلکہ متاثر زدہ ہیں ''۔جب عمر شریف سے متاثر ہونے کی وجہ معلوم کی گئی تو عمر شریف نے کہا کہ میں ویگن کی زد میں آتے آتے ہمیشہ رہ گیا۔اس لئے ویگن ڈرائیور سے متاثر ہوں مجھے شوگر کی بیماری میٹھی چیز کھانے سے نہیں بلکہ ویگن کے نیچے آنے کے خوف سے ہوئی ہے لوگ کسی چیز یا انسان سے سحر زدہ ہوتے ہیں مگر میں متاثر زدہ ہوں ویگن سے۔کیونکہ چند بار ویگن کی ضد سے متاثر بھی ہوا ہوں جس سے مجھے چند بیرونی اور زیادہ تر باطنی چوٹیں آئی ہیں۔متاثر اس لئے ہوں کہ ویگن موت کی سواری ہے۔اندھے کنویں پر کرتب دکھانے والے انتہائی ماہر موٹر سائیکلسٹ اکثر گر جاتے ہیں لیکن ویگن ڈرائیور موت کے کنویں سے بھی صاف بچ جاتے ہیں۔ویگن ڈرائیور موت کے منہ میں جا کے زندگی سے کھیلتے ہیں اور ان کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا البتہ کئی لوگ زندگی سے روٹھ جاتے ہیں۔لوگ زندگی سے روٹھ سکتے ہیں لیکن ویگن ڈرائیور سے نہیں روٹھ سکتے۔ایک تو اس لئے کہ وہ آپ کو سٹاپ پر چھوڑ کر چلا جائے گا دوسرے اس لئے کہ ویگن ڈرائیور کی نظر سامنے، ہاتھ سٹیرنگ پر اور پاؤں کلچ پر، کان گانوں پر، دل دغا بازی میں اور خیال اوورٹیک پر ہوتا ہے لہٰذا دنیا کا کوئی آدمی ویگن ڈرائیور سے نہیں روٹھ سکتا۔

ہر ویگن ڈرائیور زندگی میں کئی بندے مارتا ہے اور بے شمار کو ملک الموت سے ڈراتا ہے جبکہ ان گنت ویگن ڈرائیور کے ہاتھوں زخمی ہو کر ویگن کی سواری کے لائق نہیں رہتے ان تمام حادثات و خرافات کے باوجود کوئی ویگن ڈرائیور کے منہ نہیں لگتا کوئی شکایت نہیں کرتا، کوئی تھانے نہیں جاتا کوئی عدالت نہیں جاتا۔۔۔کیونکہ وہاں جانے کے لئے ویگن درکار ہوتی ہے، کوئی اپنے پاؤں پر کہاں تک انحصار کرے۔دو تین کلومیٹر کی بات ہو تو بندہ پیدل بھی چل لے لیکن لاہور کا جغرافیہ جہاں طولاً عرضاً پھیلا ہوا اور کہیں بھی جانے کے لئے پندرہ بیس کلومیٹر کا فاصلہ عام سی بات ہو تو اسکے لئے ویگن ڈرائیور سے پنگا لینا اپنی شامت اعمال کو دعوت دینا ہوتا ہے۔

ویگن ڈرائیور گھر سے نہ جانے کیا کھا کر نکلتے ہیں کہ انہیں سارا وقت پیاس ستاتی رہتی ہے، اگرچہ وہ گاہے بگاہے پانی کے گلاس بھی چڑھاتے رہتے ہیں تاہم ان کی آنکھیں بھی یہی فریضہ سرانجام دیتی رہتی ہیں۔پوری ویگن میں خواتین کے لئے صرف دو سیٹیں مختص ہوتی ہیں اور وہ بھی ویگن کے ڈرائیور کے پہلو میں۔۔۔بسا اوقات ویگن ڈرائیور کے اعصاب پر حیرت ہوتی ہے، ویگن ڈرائیور حیرت انگیز طور پر قوی اعصاب کا مالک ہوتا ہے جہاں وہ ہزاروں گاڑیوں، بسوں، ٹرکوں، تانگوں، ریڑھوں، موٹر سائیکلوں اور ٹرالوں کے بیچ سے ویگن گزار کر لے جاتا ہے جو بذات خود ایک فن ہے، وہاں ویگن ڈرائیور اپنے ہم پیشہ بھائیوں کے ساتھ مسلسل اوورٹیکنگ میں مصروف ہوتا ہے جو ویگن ایک گھنٹہ میں سٹیشن سے میکے والے موڑ تک پہنچتی تھی وہی ویگن صرف پندرہ منٹ میں مطلوبہ جگہ پہنچ جاتی ہے ویگن ڈرائیور اس دوران یا پچھلی سواری کو ایک ہاتھ سے سو روپے کی ریزگاری بھی نکال دیتا ہے، منہ میں پان کا بیڑہ بھی رکھتا ہے۔پانی شربت بوتل چائے بھی پیتا ہے، کنڈیکٹر اور گزرنے والے ڈرائیوروں کے ساتھ مذاق اور گالی گلوچ بھی کرتا جاتا ہے، ساتھ ساتھ مسلسل چھپائے ہوئے

عشقیہ گانے بھی بدلتا رہتا ہے۔قریب بیٹھی ہوئی خوبصورت سواریوں سے آنکھ مچولی بھی جاری رکھتا ہے۔کبھی کیسٹ بدلنے کے بہانے ساتھ والی سواری کے اتنے نزدیک چلا جاتا ہے کہ بیچاری لڑکی کا سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے اور کبھی گیئر بدلنے کے چکر میں ہاتھوں سے کارروائیاں جاری رکھتا ہے۔اے کے ساتھ ساتھ وہ سواریوں کے تاثرات بھی نوٹ کرتا ہے ریمارکس بھی دیتا ہے،گانے بھی سنتا جاتا ہے اور پان کی پچکاریاں پھینکنے کے ساتھ ساتھ گانے بھی گاتا ہے،وہ اپنے کام کے اعتبار سے ہر فن مولا کہلاتا ہے۔

اگر کوئی لڑکا کسی لڑکی سے بات کرنے کی گستاخی کرے تو لڑکی اس کی ایسی کی تیسی پھیر دیتی ہے لیکن ویگن ڈرائیور کئی گستاخیوں کا مرتکب ہوتا ہے اور روز ہوتا ہے مگر کوئی لڑکی چوں نہیں کرتی۔۔۔بس دل میں دعا کرتی ہے کہ اس کی منزل جلد آجائے یا زیادہ سے زیادہ سمٹ کر بیٹھ جاتی ہے اگرچہ یہ بھی ایک ناکام کوشش ہوتی ہے یہ حقیقت ہے کہ ویگن ڈرائیور کبھی تھکتے نہیں ہیں آپ انہیں ہشاش بشاش اور چاق وچوبند ہی پائیں گے۔جھوم جھوم کر ڈرائیونگ کرتے اور لہراتے ہوئے گانا گاتے یا غصے میں پولیس والوں کو بے لباس گالیاں دیتے یا اپنے ہمجولیوں سے چھٹے درجے کا چھٹا ہوا مذاق کرتے۔۔۔۔۔۔اور زیادہ سے زیادہ چکر لگانے کے باوجود نہ تو کبھی چکراتے ہیں اور نہ ہی تھکتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی معشوقیوں کا طویل دورانیے کا کھیل سارا دن چلتا رہتا ہے۔اگرچہ انھیں محبت کے جواب میں حقارت اور نفرت ملتی ہے اور ہر محبت کی کوشش میں بار بار مایوسی اٹھانا پڑتی ہے لیکن ان کا جذبہ سرد نہیں ہوتا۔ان کی مثال اس چیونٹی سے بڑھ کر ہے جو بار بار دیوار سے گر جاتی ہے اور پھر اٹھ کر دیوار پر چڑھنے لگتی ہے۔یہ اپنے کام میں جتے رہتے ہیں اور مگن اور مسرور رہتے ہیں۔دنیا کی طویل ترین ٹوپی دینے کے بعد یہ جب گھر جاتے ہیں تو ان کی بشاشت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔اگرچہ یہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بہت کم وقت گزارتے ہیں لیکن ان کی بیویاں ان سے ہمیشہ خوش رہتی ہیں۔ویگن ڈرائیور کی بیوی کی چہرے کی رونق اور گھر کی خوشحالی وآبادی اس بات کی ضامن ہے کہ ویگن ڈرائیور کتنا مستعد اور محبت سے لبریز ہستی ہے۔وہ وٹامن اے بی اور سی سے بھرپور ہوتا ہے خیال رہے کہ ویگن ڈرائیوروں کو خدا نے کیلشیم کاربونیٹ سمیت تمام معدنیات سے نوازا ہوتا ہے شاید اسی لئے آپ نے کبھی کسی ویگن ڈرائیور کو عینک لگی ہوئی نہیں دیکھی ہوگی اور نہ ہی سر درد کی شکایت سنی ہوگی۔۔۔۔نہ گولیاں کھاتے نہ بیماریوں کا تذکرہ کرتے سنا ہوگا۔وہ پکے پکے راگ سنتے ہیں،اونچی آواز میں بے ہنگم قوالیاں سنتے

ہیں۔فاسٹ میوزک،فاسٹ فوڈ اور فاسٹ ڈرائیونگ سے انہیں عشق ہے۔ٹریفک کا شور اور سارا دن کی بک بک جھک جھک کے باوجود نہ وہ اونچا سنتے اور نہ ہی بہرے ہوتے۔اسی طرح آنکھوں کے مسلسل استعمال کے باوجود نہ ان کی قریب کی نظر خراب ہوتی ہے نہ دور کی۔۔۔۔۔وہ اگلی دونوں سیٹوں پر ہمیشہ طالبات اور لڑکیوں کو بٹھانا پسند کرتے ہیں۔اگلی سیٹوں پر کوئی بوڑھی اماں یا ادھیڑ عمر عورت نہیں بیٹھ سکتی۔کئی خواتین اس قسم کی بدذوقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اگلی سیٹوں پر بیٹھنے کی جسارت کرتی ہیں تو ڈرائیور نہایت رکھائی اور رعونت سے انہیں اپنے ساتھ بٹھانے سے انکار کردیتا ہے۔رہی سہی کسر کنڈیکٹر نکال دیتا ہے جب وہ کسی ادھیڑ عمر یا بدشکل عورت کو آگے سے اٹھا کر پیچھے بٹھا دیتا ہے،تب عورتوں کے کمینٹس سننے کے لائق ہوتے ہیں بشرطیکہ ہمت ہو۔اگر امریکی صدر کو علم ہوتا کہ پاکستان کے ویگن ڈرائیور طاقت کا سرچشمہ ہیں تو آج امریکی فوج میں سارے فوجی پاکستانی ویگن ڈرائیور ہوتے۔اصولاً تو ویگن ڈرائیوروں کی اصل جگہ بارڈر لائن ہے لیکن بیچارے غلط جگہ پر اپنی توانائیاں استعمال کررہے ہیں۔تاہم وہ اپنی دانست میں بہت مسرور ہیں اور اسے اپنی نیکی کا اجر سمجھتے ہیں۔ان کا یہاں تک کہنا ہے کہ اگر اگلا جنم نصیب ہوا تو وہ اس میں بھی ویگن ڈرائیور ہی بنیں گے ویگن ڈرائیور اپنی جاب سے اس قدر مطمئن ہیں کہ دوسروں کی جاب کو خاطر میں نہیں لاتے انکے خیال میں ایک اچھی اور متحرک زندگی گزارنے کے لئے ویگن ڈرائیور ہونا شرط ہے ممکن ہے بلکہ یقین ہے کہ ہر تعلیم یافتہ آدمی اس کام کو ناپسندیدہ اور گرا ہوا سمجھے گا کیونکہ وہ ویگن ڈرائیور نہیں بنا،لیکن ایک ویگن ڈرائیور امریکی صدر بننے پر بھی اس کام کو ترجیح دے گا کیونکہ اس کے لئے اس میں ایک ایسا چارم ہے جس تک نہ امریکی صدر پہنچ سکتا ہے نہ برطانوی وزیر اعظم!!

ویگن ڈرائیوروں کی سب سے غور طلب چیز ان کی ڈرائیونگ ہے ویگن ڈرائیور جس طرح ڈرائیونگ کرتے ہیں اس کا تصور کوئی پاگل دیوانہ بھی نہیں کرسکتا۔گاڑی گیئر میں ڈالنے کے بعد وہ اسے اللہ کے حوالے کردیتے ہیں۔ویگن کی سواری کے دوران جس قدر انسان کو اللہ یاد آتا ہے اتنا پوری زندگی میں بھی نہیں آتا۔ہر بریک اور ہر موڑ پر لگتا ہے کہ ایکسڈینٹ ہوا۔۔۔لیکن ایکسیڈنٹ نہیں ہوتا۔۔۔اور اگر ہو بھی جاتا ہے تو ویگن ڈرائیور ویگن بھگا کر لے جاتا ہے۔اگر ویگن کا بھی ایکسڈنٹ ہوگیا تو ڈرائیور کپڑے جھاڑ کر دوسری ویگن میں جا بیٹھتا ہے۔اگر ویگن کسی پُل،درخت،پہاڑ یا ٹرک سے ٹکرا جائے تو پوری ویگن کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔تمام سواریاں اپنی اصلی منزل تک پہنچ جاتی ہیں لیکن ویگن ڈرائیور ایک ہی جست میں زقند لگا کر نکل آتا ہے۔

ایک ہی جست میں ہوگیا قصہ تمام
نہ ویگن رہی نہ سواری نہ کوئی کام

بہرحال یہ طے ہے کہ حالات خواہ کیسے ہی پیش آئیں ویگن ڈرائیور اپنی تیز رفتاری سے باز نہیں آتے۔اکثر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ بیچارے لاوارث ہیں ان کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے لیکن ہر ویگن ڈرائیور ایک بڑے کنبے کا مالک ہوتا ہے۔اس کے گھر میں کم ازکم آٹھ دس بچے،ایک بیوی،دو ماں باپ،چار پانچ بہن بھائی،غرضیکہ اٹھارہ بیس افراد پر مشتمل کنبہ ہوتا ہے جس کا واحد کفیل ویگن ڈرائیور ہوتا ہے۔وہ اپنی تمام ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہے۔وہ سب کو خوش کرنے اور سب سے خوش رہنے کی مقدور بھر کوشش کرتا ہے۔اس کے نزدیک فاسٹ ڈرائیونگ انجوائے منٹ کا نام ہے۔اس سے زندگی میں تھرل پیدا ہوتا ہے۔ان کے خیال میں محتاط ڈرائیونگ یا تو بوڑھے کرتے ہیں یا بزدل۔

ویگن ڈرائیور مشاق،مشتاق اور عشاق ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی رومانٹک اور نفاست پسند بھی ہوتے ہیں۔اکثر ویگن ڈرائیوروں نے سر بھی نہایت خوبصورتی سے تیل چپڑا ہوتا ہے،مونچھوں پر کسی ولایتی کریم کی مالش کی ہوتی ہے۔سوٹ عطر بیز ہوتا ہے،کبھی کبھی ویگن میں بیٹھ کر لگتا ہے کہ آپ کسی جیتے جاگتے مُردے کے ساتھ بیٹھے ہیں جس سے مہکی مہکی بھینی بھینی ناریل یا چنبیلی کے تیل،یا عطر یا موتیے یا گلاب کے بھبکے اٹھ رہے

ہوتے ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ کچھ خوشبویں تو موصوف میں سے اٹھ رہی ہیں اور کچھ کا اہتمام ونڈو سکرین کے ساتھ کیا ہوا ہے مثلاً موتیے اور گلاب کے گجرے ونڈو مرر سے جھول رہے ہیں۔قریب ہی ایئر فریشنر پڑا ہے اور سامنے دیسی پرفیوم کا سپرے پڑا ہے۔اکثر ویگن ڈرائیوروں نے خوبصورت اور رنگین پراندے لٹکا رکھے ہوتے ہیں جو گاہے بگاہے دھکا لگنے سے آپ کے چہرے کو چھو جاتے ہیں بعض نے موتیوں اور نگوں کے ہار لٹکائے ہوتے ہیں۔شیشے پر دل بنے ہوتے ہیں۔کئی جگہ دل فگار ہوتا ہے اور کیوپڈ نے تیر چلائے ہوتے ہیں۔ویگن کی آرائش وزیبائش ویگن ڈرائیور کے جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔مختلف اشعار جن سے محبت ابلی پڑی ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔سواریوں کو مجبور کرتے ہیں کہ انہیں بار بار پڑھا جائے اور ویگن ڈرائیور کو حسبِ توفیق داد دی جائے ۔

آئے ہو ابھی بیٹھو تو سہی

جانے کی باتیں جانے دو

ڈرائیوران اشعار سے ریسپانس کے طلبگار ہوتے ہیں۔اکثر ریسپانس انھیں روہانسا کر دیتا ہے لیکن وہ ہمت نہیں ہارتے

چہرہ تیرا حسین ہے آنچل تیرا رنگین ہے

تو چھو کے دیکھ ذرا بندہ بڑا ذہین ہے

یہ اشعار محبتوں کا نچوڑ اور عشق کی تپش سموئے ہوتے ہیں ۔ان اشعار کے ذریعے ویگن ڈرائیور اپنا حالِ دل سناتے ہیں۔یہ اشعار ڈائریوں،نوٹ بک یا دل پر نہیں لکھے جاسکتے۔یہ صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ آپ پڑھیں اور پڑھ کے بھلا دیں ۔یہی آپ کے اور خود ویگن ڈرائیور کے حق میں اچھا ہوتا ہے۔

یہ حسین آخر کیوں اس قدر نمکین ہوتے ہیں

کہ جب بھی بات کرتے ہیں دل غمگین ہوتے ہیں

ویگن ڈرائیور تقریباً سبھی ایک سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں ۔سب کی لینگویج بھی ایک جیسی ہوتی ہے۔رومانٹک ہونے سے گالی دینے میں وہ ایک ثانیے کا بھی وقفہ نہیں لیتے اور جو سواری بھی ایک روپیہ کم دے۔۔۔۔۔اس سے لحاظ برتنا ڈرائیورنگ کے اصولوں کے خلاف سمجھتے ہیں۔ویگن ڈرائیور کسی سے نہیں ڈرتے سوائے اس کھڑے سوکھے سنتری سے جو انہیں سٹاپ سے دو قدم آگے ویگن لانے پر جھڑکیاں دیتا اور چالان کرتا ہے۔ویگن ڈرائیور سوائے سنتری بادشاہ کے کسی کے آگے نہیں جھکتے ،لڑنے مرنے میں اتنے ہوشیار ہوتے ہیں کہ لڑائی دوسری ویگن میں ہو رہی ہو تو یہ اس میں چھلانگ لگا دیتے ہیں۔سٹاپ کے علاوہ ہر جگہ ویگن روک دیتے ہیں ۔سواری اُترنے یا چڑھانے میں دیر لگا دیتے ہیں ،سواری اترنے یا چڑھنے میں دیر کرے تو لحاظ نہیں کرتے۔جہاں پر کنڈیکٹر کا یہ کمال ہے کہ وہ بیس سیٹوں پر پینتالیس سواریاں بٹھالیتا ہے وہاں ویگن ڈرائیور کا یہ کمال ہے کہ وہ ویگن کو جہاز کی رفتار سے دوڑا کر لے جاتا ہے ویگن ڈرائیوروں نے زمین پر ویگن کو جہاز بلکہ میزائل بنا دیا ہے۔اس لئے دنیا کی عجیب وغریب مخلوق سے متاثر ہونا تو بنتا ہے ناں!

کیونکہ کوئی بھی ،کہیں بھی ،کسی بھی وقت اس کی زد میں آسکتا ہے اور واضح رہے کہ ویگن ڈرائیور کی زد میں آنے والا کوئی کلیم نہیں کرسکتا۔۔۔احتیاط کریں۔ویگن میں چڑھتے ہوئے ،ویگن میں بیٹھے ہوئے اور ویگن سے اترتے ہوئے اور ویگن کو سامنے سے گزرتے ہوئے خاص طور پر۔۔۔ بالخصوص ویگن پر کندہ اشعار پڑھتے ہوئے ۔

ماں کی دُعا ویگن چلا

ماں کی بددعا ریڑھا چلا

لاہور سے تعلق رکھنے والی ڈاکٹر صبیح خان ہمہ جہت شخصیت کی مالکہ ہیں۔یہ صحافی ،استاد ،ادیبہ ،شاعرہ نقاد محقق ،دانشور ،اینکر ،ڈرامہ رائٹر ،مزاح نگار ،کالم نویس ،تجزیہ کار اور بہت کچھ ہیں۔بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں بیشتر طنز ومزاح پر مبنی ہیں جبکہ بے شمار ڈرامے بھی لکھ چکی ہیں۔پی ایچ ڈی کے لئے اُن کا مقالہ ''اُردو تنقید کا اصلی چہرہ'' علم وعرفان پبلشرز سے شائع ہو کر اسی معیار کے طلباء وطالبات کے لئے حوالے کا ذریعہ بن چکا ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ ہمارے اور آپ کے مجلّے ''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے بھی مستقل لکھ رہی ہیں۔

حالات کے بے رحم تھپیڑوں پر جیتے، خود سے ناراض اور اپنے آپ سے لڑتے، ایک شخص کی کہانی، جس نے زندگی سے انتقام لینے کی ٹھانی ہوئی تھی، چاہے اِس کوشش میں چاہت اور چہیتے ہی کیوں نہ بھسم ہو جائیں، کیوں کہ 'ساس بھی کبھی بہو تھی' اور 'کہانی گھر گھر کی'، ایکتا کپوری ٹرینڈ! چار شرعی بیویوں کا دھماکہ خیز اتحاد، جس نے راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کا تورا بورا کرنے کی ٹھانی ہوئی تھی۔ رومانویت اور مزاح کا حسین امتزاج، جس میں چار بیویاں اپنے اکلوتے شوہر پر دعویدار ہیں۔

برسوں پہلے جگت خالو سے ہماری پہلی ملاقات فخریہ، دوسری اتفاقیہ، اور تیسری رسمیہ تھی۔ اُس کے بعد کی باقی ملاقاتیں بس ملاقاتیں ہی تھیں، جن کو ہم کوئی نام دینے سے قاصر تھے۔ مگر اُن کے لیے ہمارے دل میں بہت احترام اور کہیں کہیں رشک اور ستائش کے جذبات بھی تھے۔ اس کی وجہ جاننے کے لیے آپ کو ماضی کے جھروکوں میں جھانکنا پڑے گا۔ ہمیں پتا چلا کہ ہمارے محلے دار خالو کی دوسری شادی، پہلی خالہ نے اور تیسری شادی، پہلی اور دوسری خالاؤں نے مل کر کروائی تھی۔ لیکن جب ہماری پہلی، دوسری اور تیسری خالائیں مل کر خالو حضور کی چوتھی شادی کے چکر میں پڑیں تو ہمیں بڑی کھد بد ہوئی۔ ہم خالہ کو سلام کرنے کے بہانے ملنے پہنچے اور بہت ڈرتے ہوئے پہلی خالہ صاحبہ سے سوتن در سوتن کے عذاب سہنے کی وجہ دریافت کرنی چاہی تو وہ نہایت اطمینان سے سروطے کے درمیان چھالیہ پھنسانے کے عمل کو روک کر بولیں "اے بیٹا! تم کو معلوم ہے کہ یومِ مئی کیوں منایا جاتا ہے"؟ ہم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ایک ہلکا سا ہنکارا بھر کے بولیں "اس ملک میں عورتوں کے حقوق نسواں دراصل مرد کے حقِ نفسانی کا متبادل نام ہے۔ بے چاری بیوی کو تمہارے خالو جیسے مردوے انسان نہیں، بلکہ ہیومن ریسورس سمجھتے ہیں، جس سے ذاتی مقاصد ایفیشنسی اور خانگی ذمہ داریاں ایفیکٹیولی پورے کیے جا سکیں۔ شادی کے پہلے ہی سال خالو کی حسنِ کارکردگی دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اگر کمک، یا مزید رسد بہم نہ پہنچی تو اِس ملک میں عورتوں کی اوسط عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی اوپر پہنچ جاؤں گی۔ تب ہی میں نے طے کر لیا کہ مجھے زندہ رہنے کے لیے سوتن برداشت کرنا پڑے گی، کیونکہ اکلوتی بیوی ہونے کا فخر انجوائے کرنے کے لیے کم از کم زندہ رہنا ضروری ہے مگر تمہارے خالو کی شوہرانہ محبت دیکھ کر مجھے یہ یقین بھی تھا کہ میں بھی جلد تمہارے خالو کے لیے کراچی کی کالعدم ٹرام سروس ثابت ہوں

گی، جو کہ اب صرف ندیم اور محمد علی کی پرانی فلموں میں ہی نظر آتی ہے۔ کسی تصویر کی مانند خوب صورت فریم میں پھولوں کا ہار پہن کر ٹنگنے سے کہیں بہتر ہے کہ سائیڈ لائن پر بیٹھ کر خالو کو کسی نئے کھلاڑی سے بھڑا کر ریٹائرمنٹ کا انتظار کیا جائے''۔

خالو کی بے اعتدالیوں اور بگڑے شوق دیکھ کر خالہ کو اُن کے قبل از وقت ریٹائر ہونے میں کوئی شک نہیں تھا اور خالہ کے علم میں یہ بھی تھا کہ گریجویٹی تو ملتی ہی بعد از ریٹائرمنٹ ہے۔ ہم خالہ اوّل کی اسٹریٹیجک پلاننگ اور وژن سے ہم آہنگ مشن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور دل ہی دل میں ہی عش عش کرتے اُن سے اجازت چاہنے کے لیے اُن کی طرف دیکھا تو وہ ماحول سے لاتعلق سی لگ رہی تھیں اور سروطے کی کٹ کٹ بھی میکانکی عمل کی مانند جاری تھی۔ ہم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہنکارہ بھر کر اُن کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تو وہ چونک کر ہمیں دیکھنے لگیں۔ اُنھوں نے ہم سے پوچھا ''مجھے پتا ہے کہ تم کو شاعری سے شغف ہے، منیر نیازی کو پڑھا ہے''۔ ہمارے جواب سے پہلے ہی اُنھوں نے یہ نظم پڑھنی شروع کر دی:

ستارے جو چمکتے ہیں کسی کی چشمِ حیراں میں
ملاقاتیں جو ہوتی ہیں جمالِ ابروباراں میں
یہ نا آباد وقتوں میں دلِ ناشاد میں ہوگی
محبت اب نہیں ہوگی
یہ کچھ دن بعد میں ہوگی
گزر جائیں گے جب یہ دن
یہ ان کی یاد میں ہوگی

ہم کچھ نہ سمجھتے ہوئے سلام کر کے اُٹھ گئے، مگر ہماری طبیعت کو چین نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں استعجاب بڑھتا جا رہا تھا کہ معاملہ اتنا سادہ نہیں، جتنا کہ بیان کردہ تھا، کچھ اَن کہی بھی ہے، ہم نے مزید سُن گُن لینے کی ٹھان لی۔

خالہ نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی تھی، جو کہ اُن کی گریجویشن سیریمنی بھی ثابت ہوئی۔ اپنی زندگی میں کبھی اسکول کی بھی شکل نہ دیکھنے والی خالہ اوّلین کی دور اندیشی اور دور بینی نہایت متاثر کن تھی۔ یوں سمجھئے جیسے کہ آج کی امریکی وزیر خارجہ ''اَنا کونڈا لیزرڈ'' کہ وہ بھی صدام حسین کے بغیر عراق کے لیے خالہ اوّلین ثابت ہوئی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خالہ اوّلین عقل کا اور یہ استحصال کا استعمال کر رہی تھی۔ دوسرا فرق مونچھوں کا بھی تھا، جو کہ اَنا کونڈا لیزرڈ کی خالہ اوّل کے مقابلے میں بہت زیادہ نمایاں اور گھنی تھیں۔ پیارے میاں آج بھی اِس بات پر حیران ہوتے ہیں کہ شان و شوکت والے ایک امپورٹڈ بینکار نے اِس چوہیا نما نا گن میں کیا دیکھا تھا کہ جان سے بھی عزیز رکھا۔ انہیں یہ سمجھنے میں بہت وقت پیش آئی تھی کہ دل تو دل ہے، کلوپٹرا کی سواری پر بھی آ سکتا ہے اور کرشن چندر کی روپ وتی کا بے چارے دھنّو کمہار کے بولتے گدھے پر بھی۔ کم بخت دل! اس کا اعتبار کیا کیجیے۔

اب تمام صورتِ حال ہماری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ بزنس اور مینجمنٹ کی تعلیم سے نابلد خالہ اوّلین نے اُس مشہور مینجمنٹ تھیوری کا سہارا لیا تھا، جس کے مطابق کسی بھی مسئلے کے حل کے لیے اُس مسئلہ کو اُس کے جز یاتی ٹکڑوں میں توڑ لیا جائے اور پھر ایک ایک کر کے حل کر لیا جائے۔ خالہ مفاہمتی پالیسی کی کسی ایسی گیدڑ سنگھی کی قائل نہ تھیں، جو قوم کی بولتی بند کر کے رکھ دے، ساتھ میں ہوا، پانی، بجلی، روٹی اور زبان کی بندش اضافی بونس، جیسے اللسان العربی میں دبئی کی سپر مارکیٹوں کے باہر بڑے بڑے پوسٹرز میں ''خصمِ خاص''، یعنی انگریزی کا ''اسپیشل آفر'' اور اُردو میں ''این آر او'' لکھا اور کہا جاتا ہے۔ وقت گزرتا گیا، دن ماہ و سال میں بدلنے لگے اور ہم بھی اپنے سوالات کا جواب گزرتے وقت کی دھول میں کھوجتے کھوجتے اُس کے ساتھ ساتھ بہتے رہے۔

شفیق زادہ کراچی کے ایک علم دوست گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ طنز و مزاح و فکشنل تھرلر کے دشت کے سیاح ہیں۔ قلم کو آنکس کی طرح استعمال کر کے ہنسانے اور رلانے کا فن جانتے ہیں۔ ان کی پہلوٹھی کی کتاب ''ہم تماشا'' فکاہیہ ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ ''پیارے میاں'' کے کردار کے خالق شفیق زادہ روٹی، روزگار اور روزی یعنی بھابھی کے لیے پردیس میں بسے ہوئے ہیں۔ یقیناً وہ ''ارمغان ابتسام'' کے لئے ایک شاندار اضافہ ہیں۔

حافظ مظفر محسن

پانچ کروڑ لے لو

چوتھی قسط

مجھے وہ پرانا واقعہ یاد آ گیا جب ایک صبح فیمی کا فون آیا تھا۔

"کچھ بینک کے کام ہیں اگر آپ آ جائیں تو مجھے سہولت ہو گی میرا خوف جاتا رہے گا ویسے بھی آج میرا دل چاہتا ہے کہ میں گاڑی اُس انداز میں چلاؤں جو آپ کو پسند ہے آپ کو یقیناً یاد ہو گا جب ایک دفعہ میں نے شیخ زاید ہسپتال کے پاس نہایت تیز رفتاری سے چلتی گاڑی اچانک موڑ دی تھی اور آگے پیچھے آتے ڈرائیوروں کی چیخیں نکل گئی ہوں گی ایک خوف سا طاری ہو گیا ہو گا اُس وقت آپ نے ہنستے ہوئے کہا تھا"

"تم پہلے دوبئی میں ٹرک تو نہیں چلاتی رہی؟؟؟؟؟"

"ہاں ہاں"؟.......

"تمہاری ڈرائیونگ سے ایسا لگتا ہے کہ تم واقعی یا تو دوبئی میں بڑے ٹرالر ریگستانوں میں چلاتی رہی ہو یا پھر اپنے لاہور شہر میں پٹھانوں کا رکشہ تمہاری ہاتھ چڑھا رہا ہو گا؟"

"اصل میں فیمی۔۔۔ آپ کے انداز سے دو باتیں دکھائی دیتی ہیں ایک تو آپ نے بہت کم عمری میں گاڑی چلانا سیکھ لی ہو گی اور اُسی زمانے میں بدتمیزی کرنا بھی۔۔۔ اسی لیے شاید بلا کا اعتماد ہے آپ کی ڈرائیونگ میں، آپ کے انداز میں اس کے علاوہ یہ بات حیران کن ہے کہ آپ کو گاڑی چلاتے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے آپ نے کبھی بریک پہ پاؤں نہیں رکھا اور کبھی بھی گاڑی چلاتے ہوئے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں کیا ہو گا۔"

وہ اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگاتی ہوئی پھر سے کہیں کھو سی گئی اور حسب معمول سلام دعا کیے بغیر اچانک اُس نے فون بند کر دیا۔

میں چونکہ ٹھوکر سے مال روڈ نہر کنارے جا رہا تھا میں نے گاڑی کا رُخ اُس کے گھر کی طرف موڑ دیا تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں ایک کھٹیچر جیپ میں بیٹھے ہوئے تھے اس دوران میں نے اپنی گاڑی گلی میں پارک کر دی اور حسب معمول اِدھر اُدھر تالے لگا دیئے۔ میری اس بات پر وہ خوب ہنسی وہی پرانے دور کے قہقہے لگاتی جو عام طور پر نازک اندام لڑکیوں کو نہیں جچتے لیکن اُس کا یہ

انداز بڑا ہی دلکش تھا۔

''بدر یہ اتنے تالے نہ لگایا کرو اتنی رکاوٹیں اچھی نہیں ہوتیں جس نے اس چار پہیوں والی کو منا لیا یہ اُسی کے ساتھ ہو جائے گی ۔۔۔ یہ چیزیں اُسی کی ہوتی ہیں جو انہیں لے جانے میں کامیاب ہو جائے۔''

فہمی نے یہ بات کہتے ہوئے اپنے سراپا پر رعونت کے ساتھ نظر ڈالی، مغرور، خوبرو حسینہ کی طرح ۔۔۔ مجھے کبھی بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ اُس نے میک اپ کیا ہو یا کسی بیوٹی پارلر کا رُخ کیا ہو یا وہ اپنے آپ پر توجہ دیتی ہو لیکن اچانک دیکھا ایک دم سے میں اُس کے ہاں پہنچایا ۔۔۔ سرِراہ کبھی اچانک آمنا سامنا ہوا تو بھی وہ حسین و جمیل عورت کی طرح تر و تازہ نظر آئی ۔۔۔ دکھ اور غم میں بھی اُس کی خوبصورتی مثالی ہوتی ہے اُس کے پاس کوئی بھی چیز ''لوکل'' نہ تھی، سوائے ایک دو مردوں کے ۔۔۔ ایک دن میں نے یہ بات مذاق مذاق میں کہہ ہی ڈالی تو مخصوص قہقہہ لگایا پھر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے اور پھر نہایت جرأت مندانہ انداز میں بولے ''نہ تو تم مشرقی ہو نہ ہی تم مغربی ہو، تم تو ان دونوں میں سے کوئی اعلیٰ سی ''چیز'' ہو جیسے سنبھال کے رکھنا، جیسے تھامے رکھنا آسان کام نہیں۔''

''ویسے بھی ایسی چیزیں کم ہی کسی کے قابو میں رہتی ہیں لیکن ایک عورت کی حیثیت سے یہ تو بہرحال میرا فرض ہے نہ کہ میں اپنی اس ''چیز'' کو سنبھال کے رکھوں ۔۔۔ اِدھر اُدھر نہ ہونے دوں'' اُس نے معنی خیز نظروں سے مغرورانہ انداز میں دیکھتے ہوئے نہایت محبت سے کہا۔

''یہ کیا'' اچانک میرا پاؤں جیپ کے اندر پڑے ایک بڑے سے کپڑے کے ساتھ لگا اور اُس میں سے بہت سے نوٹ اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ اُس نے پھر قہقہہ لگایا یہ وہ پیسے تھے جو میں نے انعامی بانڈ کے ڈیلر سے کل شام AG آفس چوک سے لیے تھے۔

''دیکھو نہ تم ہی تو کہا کرتے تھے کہ تمہارے ہاتھ میں دولت کی لائن بڑی مضبوط ہے اور چھتیس سال کی عمر سے تمہارا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا جس میں دولت کی ریل پیل ہو گی تمہارے پاس اس قدر دولت ہو گی جو سنبھالی نہ جا سکے گی۔'' اس دوران اُس کے چہرے پر مکمل سنجیدگی طاری ہو گئی اور اُس نے کہا ''بدر جب چند سال پہلے میں اپنے گھر سے نکلی تو میں نے اپنے باپ کو ایک زناٹے دار تھپڑ کے جواب میں کہا تھا کہ میں اب اُس وقت قصور واپس آؤں گی جب میرے پاس لاکھوں نہیں کروڑوں روپے ہوں گے اور میرے والد نے آہستہ سے کہا تھا'' اور بے شمار لعنتیں بھی اُس وقت تک تم سمیٹ چکی ہو گی'' اس دوران اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اُس نے گاڑی ایک طرف لگائی اُتر کر میری طرف آئی میں سمجھ گیا میں نے خود ہی اپنی سیٹ سے چھلانگ لگائی اور تیزی سے دوسری طرف جا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

امریکہ میں شکاگو ائیر پورٹ پر فلائیٹ کے انتظار میں جمیل الدین عالیؔ امجد اسلام امجد اور منیر نیازی خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سکوت توڑنے کے لیے منیر نیازی سے کہا۔ ''منیر صاحب! انسانی جسم میں دو چیزیں ایسی ہیں جنھیں کاٹا جائے تو خون نہیں نکلتا۔''

منیر نے پوچھا ''کون سی؟''

میں نے کہا۔ ''بال اور ناخن''

منیر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد یوں گویا ہوا۔

''انور! توں ساڈے پنڈ دا نائی نہیں ویکھیا۔'' (یعنی تم نے ہمارے گاؤں کا نائی نہیں دیکھا)

بات سے بات از انور مسعود

کافی دیر تک ہم دونوں گاڑی میں خاموش بیٹھے رہے پھر میں نے خود ہی گاڑی سٹارٹ کی اور چل پڑا۔ اس دوران اُس نے پھر خاموشی توڑی اور اپنے باپ کا کہا ہوا وہی اذیت ناک فقرہ دہرایا ''اور بے شمار لعنتیں بھی اُس وقت تک تم سمیٹ چکی ہو گی۔''

''گاڑی ذرا تیز چلائیں کہیں بینک بند نہ ہو جائے۔'' میری ہنسی نکل گئی......

''محترمہ بہتر ہے آپ قصور سے لاہور واپس آ جائیں، آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا کیونکہ پرانے فیصلوں پر شرمندہ یا پریشان نہیں ہوا کرتے ورنہ چلتی گاڑی کو بریکیں لگ جاتی ہیں یا پھر اُڑتا ہوا جہاز کسی بڑے طوفان میں گم ہو جاتا ہے اور آپ کے بقول۔۔۔ ایک بار اُٹھایا قدم واپس نہیں مڑنا چاہیے ورنہ انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ ویسے محترمہ اگر آپ پسند کریں تو مجھے بتائیں کہ کل جب شام کے وقت آپ AG آفس چوک میں یہ ایک کروڑ روپیہ اکیلے کیش کی صورت میں آپ لینے گئیں تو آپ کو اُس وقت کوئی خوف کیوں محسوس نہیں ہوا آپ پریشان کیوں نہیں ہوئیں کیونکہ آج کے دور میں ایک کروڑ روپیہ بہت بڑی رقم ہے اور صرف چھتیس لاکھ کے لیے چند دن پہلے ڈاکوؤں نے شادمان چوک میں دو سکیورٹی گارڈ قتل کر ڈالے تھے اور سائیڈ پر چلتی ہوئی ایک لڑکی ڈاکوؤں کی گولیوں کا نشانہ بن گئی جو بعد میں ہسپتال جا کر دم توڑ گئی۔''

''بدر۔۔۔ یہ ایک کروڑ روپیہ میرے لیے کوئی اتنی بڑی رقم نہیں اسی کھٹیچر جیپ میں میں نے کروڑوں روپے اِدھر اُدھر شفٹ کیے اس کے علاوہ کروڑوں روپے کی دوسری ''چیزیں'' بھی لانے لے جانے کے لیے میں عام طور پر یہ کھٹیچر جیپ ہی استعمال کیا کرتی ہوں۔ اور تم نے خود ہی مجھے اپنے علاقے کے اُس گاڑیوں کے ''ڈینٹر'' کے بارے میں بتایا تھا جس کے بارے میں ایک اخبار کے سنڈے میگزین میں اُس کا دو پورے صفحات کا فیچر چھپا تھا جس میں اُس ''ڈینٹر'' نے دعویٰ کیا تھا کہ ہالینڈ سے ایک عورت پاکستان آئی تھی اور اُس نے ''جھورے ڈینٹر'' کو تلاش کر کے کسی کا حوالہ دیا اور اُس سے ایک گاڑی تیار کروائی جس میں کئی کلو ''ہیروئن'' پیک کی گئی تھی...... وہ عورت چار ہفتے لاہور کی گلیوں میں اُس گاڑی کو دوڑاتی رہی کہ یہ راز کہیں رستے میں فاش نہ ہو جائے اور پھر وہ بڑی بے باکی سے وہ گاڑی ''ہیروئن'' سمیت ہالینڈ لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔''

میری ہنسی نکل گئی ''آجکل وہ ''جھورا ڈینٹر'' ہر اسلامی مہینے کی گیارہ تاریخ کو اپنے گھر میں ایک محفل برپا کرتا ہے جہاں آنے والوں کو ختم درود کے بعد مٹن قورمہ وافر مقدار میں کھلایا جاتا ہے۔''

وہ زور زور سے ہنسنے لگی اور پھر قہقہے لگاتے ہوئے بولی ''بدر۔۔۔ سچ سچ بتاؤ تم ہر مہینے کی گیارہ تاریخ کو وہ مٹن قورمہ ''وافر مقدار'' میں کھانے جاتے ہو نہ؟''

اس دوران جب ہم ایبٹ روڈ سے ''منو ہاؤس'' کی طرف مڑے تو دو لڑکوں نے موٹر سائیکل میرے ساتھ کی اور پیچھے بیٹھے لڑکے نے پستول دکھا کر مجھے غصے سے کہا ''پرس نکال دو'' میں نے حسبِ معمول کالے شیشوں والی عینک اُتار کر جب اُن دونوں کو نہایت غور سے دیکھا تو دونوں قہقہے لگاتے بغیر پرس چھینے واپس مڑ گئے......

وہ بائیں سیٹ پر بیٹھی زور زور سے ہنسنے لگی، کافی دیر بعد اُس کی ہنسی رُکی تو اُس نے پھر قہقہہ لگایا۔

''لگتا ہے یہ دونوں کسی دور میں تمہارے شاگرد رہے ہوں گے۔۔۔ استاد کو دیکھ کر دونوں ہی پرس چھینے بغیر واپس مڑ گئے حالانکہ اُنھیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ اُن کے ''استاد'' کے پہلو میں بیٹھی خوبصورت لڑکی کے پاس پرس کے علاوہ ایک کروڑ کیش بھی ہے۔''

حافظ مظفر محسن صاحب کا تعلق لاہور سے ہے۔ موصوف بچپن سے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ بچوں کے ادب میں اِن کا حصہ قابلِ ستائش ہے۔ بہت اچھے شاعر اور کالم نگار ہیں۔ ان کے کالم ایک مؤقر اخبار میں ''طنز و مزاح'' کے عنوان سے مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ اِن کے اندازِ تحریر میں شگفتہ بیانی، بیساختگی اور ڈرامائی عناصر بکثرت پائے جاتے ہیں۔

چڑیا

پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی

اللہ جانے اہالیانِ کراچی کی زبان میں ''چڑیا'' کسے اور کیوں کہا جاتا ہے؟

آج تک اِس گتھی کو سلجھا نہیں پایا۔

تین برس پہلے کی بات ہے، میں، اسٹاف روم میں بیٹھا، سکون سے چائے پی رہا تھا اور کیوبا کی اُن خوش کُن سگاروں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو وہاں کی حسینائیں اپنی مر... رانوں پر مَل کر رول کیا کرتیں اور ہم جیسی سفلی محروم مجبور نسل تک پہنچوانے کی افواہیں پھیلایا کرتی تھیں۔ پروفیسر ندیم احمد، میرے بائیں اور پروفیسر ہارون رشید صاحب سامنے کی نشستوں پر تشریف فرما تھے، میرے خیال میں اپریل ۲۰۱۳ء کا ماہ وسال تھا، گرمی کی وجہ سے اُس وقت کے پرنسپل صاحب نیا اسٹاف روم کے پردے گروادئے تھے اور کھڑکیاں برابر کروادی تھیں۔

یک لخت اسٹاف روم کا دروازہ کھلا اور ایک صاحب پسینے میں بھیگے، پھولتی سانسوں کو ہموار کرتے، باقاعدہ دروازے کو لات مارتے اور دبیز پردے سے اُلجھتے ہوئے اندر ایک نشست

پر آ کر گرے۔

''الٰہی خیر!'' پروفیسر ندیم احمد صاحب کے منھ سے نکلا، لیکن شاید دیر ہو چکی تھی، مشیتِ ایزدی ہمارے کالج کی تقدیر کا دیرینہ فیصلہ کر چکی تھی۔

''یہ کون ہیں؟''

یکا یک گرنے والے صاحب نے لُڑھک جانے والی کُرسی کو سیدھا کر کے بیٹھتے ہوئے میری جانب اشارہ

کیا۔

''اُردو کے پروفیسر ہیں!'' بتایا گیا۔

''اچھا۔۔۔اچھا۔۔۔کب سے یہاں ہیں؟'' دوسرا سوال آیا، لہجہ میں تعزیت بھری پڑی تھی۔

میں اور ندیم صاحب کے ساتھ ساتھ ہارون صاحب بھی ہکا بکا آنے والے، بلکہ گرنے والے صاحب کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے، یک لخت پردہ پھر اُٹھا اور پرنسپل صاحب اور ایک اور مہمان پروفیسر صاحب تشریف لائے۔

پرنسپل صاحب نے تعارف کرایا ''آپ پروفیسر فزکس' صاحب ہیں، فزکس کے پروفیسر ہیں اور اورنگی ٹاؤن کالج سے یہاں تشریف لائے ہیں!''

سب کی سانس میں سانس آئی کیونکہ اُن دنوں محکمہ تعلیم ''محکومہ تعلیم'' بنا ہوا تھا اور ہر نئے آنے والے سے ڈر اور خوف محسوس ہوتا تھا۔

پرنسپل صاحب نے مجھے اشارے سے پرنسپل آفس میں بلایا اور ایک کاغذ دیتے ہوئے کہا ''ڈاکٹر صاحب! یہ لیٹر پروفیسر ہارون صاحب کو دے دیجیے گا کہ اپنی پرسنل فائل منگوالیں، پروفیسر تصویر صاحب بھی منگوالیں اور ساتھ وہ دو حضرات طفیل ہاشمی صاحب اور عمر فاروق صاحب بھی فائلیں منگوالیں، یہ میں نے لکھ بھی دیا ہے، میں نے دیکھا کہ پرنسپل صاحب نے اپنے سُرخ قلم سے کچھ اُس لیٹر پر لکھا تھا۔

میں لیٹر لیکر کالج آفس میں آ گیا اور صفدر صاحب کو دیا کہ آپ، اپنی ریٹائرمنٹ سے قبل یہ کام کروا دیجیے، ڈاکٹر صاحب نے ۷ اراپریل ۲۰۱۳ء کی تاریخ لیٹر پر لکھی ہے، اس میں یہ اضافہ کر دیں پلیز، کہ:

The above-mentioned officer bring transfered from your college. His personal file may please be sent to this college at the earliest.

اتنا کہہ کر میں اگلے روز سینئر پروفیسر شاہد اقبال صاحب کی آمد کا شدت سے انتظار کرنے لگا کہ شاہد صاحب ایک روز کسی کام سے کالج نہ آتے تو کالج پر سوگِ مرگ کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی اور پورا کالج ایک اُجاڑ سنسان بیابان کا منظر پیش کرتا۔

اسٹاف روم میں آ کر میں گرنے والے صاحب کے سامنے والی کُرسی پر آ کر بیٹھ گیا، یکا یک اُنھوں نے اپنا سیاہ یا اللہ جانے گہرا نیلا بیگ کھولا اور ایک کتاب میری جانب بڑھائی۔

''شکریہ سر!!'' میں نہال ہو گیا۔

وہ نعتوں کا ایک مختصر مجموعہ تھا، میں پڑھتا گیا اور ماشاء اللہ سبحان اللہ کہتا رہا۔

اچانک میں نے بغور اُن صاحب کے یعنی پروفیسر فزکس صاحب کے ساتھ آنے والے صاحب کو دیکھا تو میں پروفیسر ندیم بیگ صاحب کو پہچان کر نہال ہو گیا کہ برسوں ہم دونوں نے ایک ساتھ جامعہ کراچی میں امتحانات کرائے تھے، بعد میں فرحان متھانی صاحب آئے تو اُن کو بھی میں نے جامعہ کراچی میں بی کام کے امتحانات کرانے کی لت لگا دی تھی۔

''ندیم'' نام کے حضرات میرے بڑے اچھے ہم راز اور ہم زاد بھی ثابت ہوا کرتے ہیں، اب ذرا بے تکلفانہ ماحول شروع ہوا۔

پروفیسر ہارون صاحب جا چکے تھے۔ پروفیسر فزکس صاحب بھی کالج آفس میں چلے گئے اور میری اور پروفیسر ندیم بیگ کی ہنسی ٹھٹھول شروع ہوئی۔

''کون ہیں یہ صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر ندیم بیگ ہنستے ہوئے بولے ''ارے یار کھٹ مٹھے مزاج کے آدمی ہیں، تم کراچی کی زبان میں انھیں چریا کہہ لو ہاہاہا۔''

ہائیں، میں حیران رہ گیا، اور کہا ''یار فزکس کے پروفیسر ہیں مگر!''

بولے ''بالکل بالکل!! مگر ایک واقعے سے اندازہ لگائیے حمیدی صاحب کہ برسوں پہلے یہ ایک کرائے کے مکان میں تھے تو موسم گرما میں انھوں نے اپنے بیڈ روم میں ایک کھڑکی، گرمی سے گھبرا کر نکال لی جو مالک مکان کے صحن میں کھلتی تھی، اُس نے ان

سے کئی مرتبہ شکایت کہ کہ دیکھئے سر، نئی کھڑکی سے مستورات کی بے پردگی ہوتی ہے۔ لیکن اُنہوں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ مالک مکان نے ایک دن دھمکی دی کہ اگر ایک ماہ میں آپ نے کھڑکی نہ چنوائی تو میں کچہری میں نالش کردوں گا، ان پر کوئی اثر نہ ہوا، اُلٹا مکان مالک کو بے پردگی کے فائدے گنوائے، وہ اُبلتا ہوا چلا گیا ا ور ساتھ ساتھ بڑبڑاتا رہا کہ ''ابے یہ پروفیسر ہے، ابے یہ پروفیسر ہے؟؟'' خیر۔۔۔ دو تین دن کے بعد انھیں قانونی نوٹس مل گیا کہ اگر ایک ماہ میں کھڑکی نہ چنوائی تو آپ کیخلاف، مہینے کی یکم مئی کو مقدمہ دائر کردیا جائیگا۔ اِنھوں نے نوٹس پھاڑ کر پھینک دیا۔ اُس نوٹس کی معیاد ۲۹/ اپریل کو ختم ہوتی تھی، ایک دو دن بعد، یہ فجر سے پہلے مالک مکان کے دروازے پر گئے اور اس زور سے اُس غریب کا دروازہ بجایا کہ وہ آنکھیں ملتا ننگے پیر باہر آیا تو یہ کہنے لگے ''معاف کیجئے گا، میں نے تجھے کچی نیند سے اُٹھادیا، میں صرف یہ یاددہانی کرانے آیا ہوں کہ آج آپ کو میرے خلاف مقدمہ دائر کروانا تھا، یکم مئی ہے، آداب!!'' ندیم بیگ تو خاموش ہوگئے، اب میرا ہنسنا شروع۔

میں نے کہا ''یار کراچی والے چریا کسی کو بھی کہتے ہوں، لیکن یہ واقعہ تو چیخ رہا ہے کہ حضرت اصلاح اور برداشت کی حد سے گزر چکے ہیں۔''

بولے ''ہاں ہاں، آٹھویں سے بی اے تک، کورس کی کتابیں جو اُنہوں نے پڑھی تھیں، بلکہ جو نہیں پڑھی تھیں، وہ ایک المماری میں سجا رکھی تھیں۔ ایم ایس سی تک کے تمام امتحانی پرچوں کی الگ فائل تھی، ان کی رسمِ بسم اللہ پر جس چاندی کی پیالی میں زعفران گھولا گیا اور رسم کے موقع پر زردوزی کے کام کی جو ٹوپی اُنہیں پہنائی گئی تھی اور اسی قسم کے اور بہت سے تبرکات دوسری المماری میں محفوظ تھے۔ وہ تو خدا کا شکر ادا کرو یار کہ پیدائش کے وقت اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے سے بوجوہ معذور تھے، ورنہ اپنا نال بھی منجملہ دیگر یادگار اشیاء کے ''سنگوا'' کر رکھوا لیتے۔

میرا ہنستے ہنستے بُرا حال۔۔۔

بیگ صاحب بولے ''یہ سمجھیں کہ عام طور پر مورخ یا ریسرچ کو بڑے آدمیوں کی زندگی کے بارے میں باریک سے باریک تفصیلات کھود کھود کر نکالنے میں جو اذیت اور مشقت اٹھانا پڑتی ہے، وہ اُنہوں نے اپنا تمام خام مواد، خود اُس کی ہتھیلی پر رکھ کر غریب کی مشکل آسان کردی تھی۔ واللہ میں نے ایسا آدمی نہیں دیکھا جو اپنی کوئی چیز ڈسکارڈ نہ کرے، بجز اپنے عقائد کے۔ یہ تو اپنے کوڑے کو بھی ''اینٹیک'' بنانے کا گُر جانتے ہیں، پروفیسر کیا ہیں؟ یادوں کا ملغوبہ ہیں، ایک ملبہ ہے جسے بیلچوں سے کھودو تو آخری تہہ میں سے گالیاں دیتا نمودار ہوگا کہ کیا بات ہے؟ سکون نہیں ہے کیا تجھے؟؟

اب تو میں اور پروفیسر ندیم احمد، ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر خوب ہنسے کہ کل شاہد اقبال صاحب آجائیں تو غائبانہ تعارف مع سوانحی خاکہ پیش کردیں گے۔

میں نے ندیم صاحب سے کہا :

بے ہوش ہی اچھا تھا حق مجھے ہوش آیا

اگلے روز شاہد آئے تو میں نے بتایا، گیارہ بجے پروفیسر فزکس بھی تشریف لے آئے، شاہد صاحب نے کچھ دیر اُنہیں سُن کر میرے کان میں کہا ''مجیب، اِسے تو پاکستان کے نقشے ہی سے اختلاف ہے! باتوں میں فزکس تو کجا، پُرکھوں کے ہاڑ ہڑواڑ ہیں، پیچھے سے ''وہیں'' سے تعلق لگ رہا ہے، آگے اللہ مالک ہے۔''

حضرت نے سرکاری ملازمت ملتے ہی انگریزی اخبارات خریدنا بند کردئے تھے کیونکہ اب وہ ''واٹنڈ'' (ضرورت ہے) کے اشتہارات کی قید سے آزاد ہوچکے تھے، صرف اُردو اخبارات میں یک ہی پھول کے مضمون کو سورنگ سے باندھنے پر مدیر کو کھلم کھلا لتاڑتے اور کسی انٹرنیٹ انجن پر قائم ''شکایت مرکز'' میں اس کے اخبار کی شکایت درج کرانیکا تذکرہ فرمانے لگتے۔

یہ للک اس حد تک بڑھ گئی کہ کچھ عرصے بعد اُنہوں نے کرختداری انداز میں کچھ لیکچرروں، بالخصوص ''جونئر موسٹ اُردو لیکچرر'' پر ہاتھ صاف کیا اور کالج میں ''سائبر کرائمز'' سیل کا ڈول ڈالا۔ اُس ''سیل'' کی تشہیر، حتی المقدور انھوں نے خود ہی کی (یعنی بغیر حکومتی امداد یا تحسین، بلکہ اجازت کے) ''سوشل

میڈیا'' پر بھی کی اور کئی خفیہ جرائم جو اُس وقت پاکستان میں رائج بھی نہیں ہو پائے تھے، اُن جرائم کو آشکارا کرتے ہوئے، اُن کے حل کے طور پر جرائم میں خود کو رول ماڈل (یعنی مرکزی کردار) کے طور پر پیش کرتے ہوئے فیس بک پر ڈالا کہ دیکھو دیرینہ مُجرم یُوں، لمحوں میں پکڑا جاتا ہے، ساتھ ساتھ واٹس ایپ نامی گروپ میں اُنھوں نے ایک اُردو لیکچرر کی حاضریوں کی مووِیز بنائیں اور وہ فلمیں اپنی رواں کنٹری کیساتھ محلے کے بھنگی کے لونڈے تک کے اسمارٹ فُون پر شیئر کریں کہ ''لے بے! تُو بھی مزے لُوٹ ''سائبر کرائمز'' کے۔''

ساتھ، آئے روز وہ ''اسٹاف رُوم'' میں، اساتذہ کرام پر بھانت بھانت کے جرائم تھوپتے رہتے اور اُس غریب کو اپنے ''جبالۂ سائبر کرائم'' میں لینے کی آرزو کا بھرپور اظہار فرماتے۔

میں نے ظفر محمود صاحب سے پوچھا ''بھائی یہ کیا ہے!''

بولے ''تمہارے لئے خصوصی طور پر قدرت نے مہیا کیا ہے، اس کے سابقہ کالج والے تو بِن پانی مانگے ''تیاؤں'' کر گئے، اب یہاں کی بے قصور جانوں کا نذرانہ بھی شاہد اقبال اپنے دور میں پیش کرتے، کرواتے رہیں گے۔''

''سائبر کرام سیل'' کیا نچارج اور ''تنہاوارث'' ہونے کی خوشی میں، اُنہوں نے کئی مرتبہ اسٹاف ممبرز کو مٹھائی کھلائی اور اُن غریبوں کو دن دیہاڑے اپنے ''سیل'' میں شمولیت کی بھرپور دعوت دی، بقول پروفیسر ہارون الرشید ''بھائی! یہ صاحب، خود تو ہمسایہ ممالک کی کئی ایجنسیز کے ہتھے چڑھیں گے ہی، یار، ہماری بھی نوکری تیل کروائے گا، اِس سرپھرے کو اپائنٹ کس نے کرا آخر؟؟''

ہارون صاحب خاموش الطبع پروفیسر ہیں، اُن کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ ہمارے کالج میں آنے کے بعد کئی دن، گُم سُم اسٹاف رُوم میں بیٹھے ''حالاتِ حاجرہ'' پر سر کھپاتے رہتے، اچانک اُٹھتے، اپنی خوبصورت ترین آٹو کار کی چابیاں سنبھالتے اور چلے جاتے۔

پروفیسر شاہد اقبال کو محکمہ کی جانب سے شاید سُن گُن مل چکی تھی کہ اب اُنہیں ''عذابِ پرنسپل'' جھیلنا اور جید راہ نماؤں، سیاستدانوں، سائنس دانوں، اسکالروں، عالموں، دانش وروں، مفکروں کی سالانہ رپورٹس برائے کارکردگی ACRs بھی لکھنا ہیں تو وہ ڈرے سہمے اسٹاف رُوم کیا یک کونے میں دُبکے ہم سے اپنا دل ہلکا کر لیا کرتے۔

ایک دن مُجھ سے کہا ''ہارون صاحب کی طبیعت ٹھیک تو رہتی ہے؟ اسٹاف رُوم میں پُورا دن بیٹھے ایک ہی جانب، اُس رستے کو کیوں تکتے رہتے ہیں جہاں سے آپ لوگ کمرۂ جماعتوں میں جاتے ہیں، مجیب، ان سے کہو کہ کلاسیں تو پڑھائیں اپنی، کل بھی اِن کے شاگرد پرنسپل سے شکایت کر رہے تھے کہ سر کلاس نہیں لیتے!''

میں گھبرا کر بولا ''مُجھ سے سینئر ہیں، پوچھ لوں گا، ویسے لونڈوں کی عادت ہے ہر پروفیسر کی شکایت لگانا، اِن گھامڑ لونڈوں کی بے سروپا باتوں پر توجہ نہ دیا کریں!''

اگلے روز اسٹاف رُوم میں شاہد صاحب، ڈاکٹر مقبول صاحب، پروفیسر عبدالحئی مہر صاحب، ڈاکٹر واجد الدین صاحب، پروفیسر فرحان متھانی صاحب، پروفیسر فزکس صاحب و دیگر حضرات تشریف فرما تھے کہ شاہد صاحب نے مجھے اشارہ کیا، میں بھرا تو بیٹھا تھا، عجلت میں آواز کیا بلند ہوئی، میرے حلقوم سے گویا چیخ خارج ہوئی، کیونکہ میں تنہا چار کلاسیں روزانہ پڑھاتے پڑھاتے شدید تھک چکا تھا:

''سر اُدھر کیا دیکھتے رہتے ہیں آپ؟''

پروفیسر ہارون الرشید بڑے پیارے انداز میں مُسکرائے اور بولے ''بھئی آپ نے تو میرے دل کی بات پوچھ لی، میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہاں سے آپ سارے، اللہ جانے، باری باری کہاں جاتے ہیں؟ اور چالیس پچاس منٹ بعد واپس آجاتے ہیں، کوئی کینٹین وغیرہ ہے تو بتادیں پلیز۔''

میں اور دیگر لوگ تو حالتِ رکوع میں چلے گئے لیکن شاہد اقبال صاحب نے ہمت نہ ہاری، اُنہوں نے کسی بھی دور میں ''ہمت نہ ہاری''، ہر ہر پرنسپل کو اُس کے ''بشرِ سہوی'' ہونے کا بھرپور احساس

دلایا، بولے ''حضرت! وہاں یہ سارے جتنے کمپیوٹر کا کاروبار کرنے جاتے ہیں، کئی دُکانیں ہیں، آپ بھی جایا کریں نا!''

دل سے خوش ہوئے، بولے ''واہ واہ!!''۔

شاہد صاحب کے تو پیر سے لگی اور سر پر بجھی، گرج کر پوچھا ''کلاسیں کیوں نہیں لیتے آپ؟؟''

نہایت اطمینان سے جواب دیا ''لیکن بھائی میرے، کلاسیں ہیں کہاں؟ کوئی بتادے تو پڑھادیں گے!''

اس پر تو اسٹاف رُوم میں وہ گھمسان کا رن پڑا کہ قہقہے کو قہقہہ نہ پہچانتا تھا۔

پروفیسر فزکس گرجے ''یہ سارے کلاسیں لینے تو جاتے ہیں!''

اس کے ساتھ ہی ایک بڑی ہی خطرناک بات ہوئی، وہ یہ کہ پروفیسر فزکس کو احساس ہوگیا کہ اُن سے ''جونیئر'' کلاسیں لینے میں تساہل، تغافل، تکافل فرمارہے ہیں، تو، اُنہوں نے، یکا یک کلاسوں سے منہ موڑ لیا۔ لاکھ گزارش کی ''سر اتنا اچھا پڑھاتے ہیں آپ، کلاسیں لے لیں پلیز!''

صاف انکار کردیا ''جب یہ جاہل دن دن بھر صوفے بدل بدل کر اینٹھتا رہتا ہے تو مجھے سگِ مجنوں نے کاٹا ہے جو گرمی میں خوار ہوتا پھروں؟''

اس کے بعد تاریخ گواہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے ''سائبر کرائم سیل'' پر مزید ''خصوصی توجہ'' دینا شروع کردی، یعنی جہاں پہلے ایک بے کس و بے بس پر ایک الزام لگا کر اُسے سوشل میڈیا کی تاریکیوں کی روشنی میں حل فرمایا کرتے تھے اور ساتھ ساتھ سینکڑوں افراد کی ناقص معلومات میں اضافہ کرتے جاتے تھے، اب اپنے اُسی ''دیرینہ شکار'' بلکہ ''واحد شکار'' پر بیک وقت کئی الزامات لگا کر جرائم ثابت کیا کرتے، اِن مقاصد کے حصول کیلئے خود کئی مرتبہ مقامی تھانے گئے، رینجرز کی کھڑی گاڑیوں کے پاس جا کر فریاد کی، فوج سے رابطہ کیا کہ ''بھئی! کئی وارداتوں میں ملوث دیرینہ بلکہ پیدائشی مجرم گرفتاری کو تیار بیٹھا ہے، آپ بسم اللہ کریں!''

پولیس، رینجرز، فوج اُنہیں آنکھیں پھاڑے دیکھا کرتی، کیونکہ اُن کے باقاعدہ اور باضابطہ مجرمانہ ریکارڈ میں اس نام کو کوئی مجرم تو کجا، ختنہ مرکز میں داخل ہونے والا نومولود تک نہ نکلتا۔ نتیجتاً یہ واجد صاحب کی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر واپس کالج آتے اور اپنے ''معتوب'' کو للکارتے ''چل بے کل کالج آ، پھر بات ہوگی، آج تو قسمت اچھی تھی تیری سالے، پھر بچ گیا!''

دراصل وہ مقامی ایجنسیز کی کارکردگی سے مایوس ہو چلے تھے۔ تنگ آکر ہمسایہ ممالک اور یورپ و امریکا کی انتہائی نامی گرامی ایجنسیز سے رابطہ کیا کہ فی الحال ایک اُردو کا عادی مجرم اور بعد ازاں باری باری مختلف مضامین کو بدترین کیفرِ کردار پہنچانا اور عبرت کا نمونہ بنوانا ہے۔

غیر ملکی ایجنسیز نے اِن سے ''کیسز'' منگوالئے۔

اِنھوں نے جھٹ ای میل کردئے۔

پندرہ بیس دن اور بعض خطرناک ترین ایجنسیز نے ماہ، دو ماہ بعد اُنہیں اِن کے گھر کے پتے پر اور کچھ بے تکلفوں نے کالج کے پتے پر یورپ و امریکا کے بہترین شفاخانوں کے دعوت نامے ارسال کئے کہ سر آپ کچھ ماہ یہاں استراحت فرمایئے اور ہمارے پُر رونق ماحول کا جائزہ لیجئے۔'' گوگل کمپنی کی ٹیم نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ ''جنابِ عالی، اب تو ہمارے ریکارڈ میں کوئی سائبر کرائم ہی نہیں بچا، سارے کے سارے آپ نے تشت ازبام کردئے، کئی مسائل سُلجھا دئے، ہمارا مالک پاگل ہوگیا کہ یار پاکستان میں کس قدر ٹیلنٹ ہے کہ ایک تنہا فرد کئی اداروں کی تنخواہ بچارہا ہے اور ہماری دُکان بند کررہا ہے، ساتھ ہی آپ کو پتا ہوگا سر، کہ تنخواہ نہ لینا یا دینا خود کتنا بڑا اور بھیانک جُرم ہے۔''

اس سے آگے کمپنی نے کئی مُسکراتے ہوئے نشانات بنائے تھے۔

اب تو اِن کی سٹّی گُم ہوگئی۔

شاہد صاحب آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے بولے ''شکر ہے کچھ دن تو سکون سے گزریں گے!''

میں نے کہا ''آپ کوئی ایکشن کیوں نہیں لیتے، کُھلے پھر رہے ہیں چہار سُو، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے، پھر

یہیں اس بدنصیب کالج میں نکلے!''

آہستہ سے بولے ''اصل میں آپ کی بھابھی صاحبہ کے ہم جماعت رہے، کچھ کلاسوں میں، تو ہوم منسٹری مسلسل، رحم کی اپیلیں داخل کر رہی ہے، ورنہ تو ایک ہی ہلّے میں میدان صاف کر دیتا۔''

مجھے اور شاہد کو باتیں، بلکہ سرگوشیاں کرتے دیکھ کر کان کھڑے کئے اور اگلے ہی روز کالج میں ایک ہی نعرہ گونج رہا تھا: "آنے والا نیا پرنسپل (یعنی پروفیسر شاہد اقبال) اور اُردو کا ماسٹر (یعنی یہ خاکسار) برسوں سے ملک کے وقار اور استحکام کے درپے ہیں، لہٰذا ''سائبر کرائم سیل'' ان کے خلاف پُورا پُورا دن کانا پھوسی کرنے کے جرم میں ابھی اور اسی وقت سے اپنی بہترین صلاحیتوں کا آغاز کر رہا ہے۔

میں نے زور سے اسٹاف روم میں کہا ''اِس اللہ مارے، ناس پیٹے سائبر کرائم سیل کا کوئی اینٹی سائبر کرائم سیل نہیں ہے، اس منحوس کالج میں جس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں؟''

اچانک بولے ''بالکل ہے، آپ اپنے خلاف لگائے گئے تمام الزامات کے ثبوت فراہم کر دیجیے!''

اس پر اگلے روز ڈاکٹر واجد الدین اپنے سگریٹ، ناشتے کا باقی ماندہ پراٹھا محلّے کے قصائی کے اُدھار کی فہرست، دھوبی کے پھاڑے ہوئے کپڑے (کہ یہ دامنِ یوسف کسی عفیفہ نے دورانِ دست درازی نہیں بلکہ اُس بھڑوے دھوبی نے پھاڑا ہے، جسے میری امی ہر ہفتے گھر کے کپڑے، اُس کے بچوں کے کھیلنے کو دے نے کے لئے دے دیتی ہیں)، ڈاکٹر واجد الدین احتیاطاً اپنے بنیان، موزے، انڈروئر تک لے آئے تھے کہ ہر طرح کے ''سائبر جرائم'' سے یک جنبشِ بٹنِ کی بورڈ، ''آزاد'' ہو جائیں۔

ہم، پروفیسر ندیم صاحب، شاہد صاحب، ڈاکٹر مقبول صاحب اور دیگر اساتذہ پورا پورا دن سر پکڑے بیٹھے رہتے۔

اچانک سابق پرنسپل BPS-20 کے ساتھ اگلے کالج سِدھارے اور پھر پورے کالج میں شور سا مچ گیا، کیونکہ ایک سرکاری میٹنگ میں، پروفیسر شاہد اقبال صاحب نے پرنسپل شپ کا ''جرم'' قبول کر لیا اور اب تو یہ عالم تھا کہ پروفیسر فزکس نے ''بہنوئی'' کے آفس میں بے تکلفانہ آنا جانا شروع کر دیا، گھنٹوں پرنسپل کے کمپیوٹر پر اُسی کے سامنے اساتذہ کی ''سائبر دُھلائی'' کی مساعی فرماتے رہتے، اس دوران اُنہوں نے کئی خُونی، جنسی، بادی، متعصب، آختہ و ساختہ مجرموں کو پکڑا بھی اور ''ایجنسیز'' کی ''نااہلی'' کی وجہ سے خود ہی اُسے بدترین کیفرِ کردار تک پہنچا کر آئے، یعنی فیس بک پر اُس کا فوٹو لگا کر عوام الفیس بُک کو ہوشیار کیا کہ ماضی میں اس حرامی سے کسی بڑے حرامی کے لین دین کے وہ ہرگز ذمہ دار نہیں ہوں گے، تاہم مستقبل کی پیش بندی پیش ہے۔ اُنہوں نے اسٹاف حاضری رجسٹر پر نیلے، سُرخ اور سیاہ قلم سے وضاحتیں پیش کرنا شروع کر دیں، تیر بنا بنا کر ٹیچروں کی سنیارٹی اور جنیارٹی کے تقدس کی خاندانی منصوبہ بندی فرماتے ساتھ احتیاطاً اُس کی دھجیاں بھی اُڑا دیا کرتے تاکہ پرنسپل مزید ایک مشقت سے محفوظ رہ سکے۔ یُوں اُنہوں نے کئی ''سینئرز'' کو اُن کا حق ''جونئرز'' کے جبڑوں سے چھین کر دلوایا۔ تدریسی اسٹاف میں بیس اساتذہ کرام تھے، چنانچہ اُن کا قصرِ آرزو پُورے ۲۰ ستونوں پر کھڑا تھا۔

لیکن وہ ''کالج آفس'' کے افراد کو ملا کر پُورے ۳۲ ستون قائم کرنا چاہتے تھے، دراصل وہ سراج الدولہا کالج کے پُر سکون ماحول پر مرمٹے تھے، خود کہتے، میں پُرانے کالج میں ایک ایک حرامی کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر آیا ہوں، وہ کالج تھا جناب کہ جہاں بیرونی چہار دیواری تک نہ تھی، پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ یہ مجرمانہ عمارت کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم؟؟ کئی مرتبہ خود میں کالج سے ملحق گھروں میں داخل ہو گیا، کیونکہ دیوار تو تھی نہیں!''

اس سے آگے کی داستاں وہ از خود اپنے ''سائبر انجن'' سے ''ڈیلیٹ'' فرما دیا کرتے کہ غیر گھر میں گھسنے کے بعد ''صاحبِ گھر و اہالیانِ خانہ'' اُن کے ساتھ کس نوع کی دعوت کا اہتمام کیا کرتے تھے۔

چیخ چیخ کر فرماتے ''یہ ملک اس قابل نہیں کہ یہاں سائبر کرائمز کی بیخ کنی کی جائے اور جب تک یہ اُردو والا پنپ رہا ہے، اُس وقت تک پاکستان کو بچانے والی صرف اللہ کی ذات

ہے!'' (اشارہ ہماری جانب ہوتا)، غالباً موصوف ''دُنیا کے انصاف'' سے مایوس ہوچلے تھے اور اب اپنے ''کیس'' ''خالقِ افلاک کو' ہینڈ اوور'' کردئے تھے۔ دن دن بھروہ پرنسپل کے اُصولوں کی ایسی کی تیسی کیا کرتے، وہ بھی بیچ چوک میں کھڑے ہوکر بیواؤں کی طرح نالہ وفریاد کرتا کہ بھائی ہمارا ''اسٹاف'' تو اللہ کی جانب سے سنگین ترین سزا ہے، دیکھئے کب بیڑی کٹتی ہے اور ''یہ'' یعنی پروفیسر فزکس کہیں اور جاتے ہیں، میری تو ''سالے'' نے بولتی بند کردی ہے، کچھ کہتا ہوں تو فیملی میں گھپلے اور ''بہن'' کی ناراضی کا اندیشہ ہے۔

ہم نے شاہد صاحب کو سمجھایا، دیکھئے، پروفیسر سابر کرائم صاحب (اُن کا نام اب آس پاس کی کالونیوں تک میں یہی مشہور ہو چلا تھا اور رواں اور سہل املاء لئے ہوئے بھی تھا) برسوں، جس کالونی میں رہائش پذیر رہے، وہ اِس قدر چھوٹی تھی کہ ہر شخص ایک دوسرے کے آباؤ اجداد کے کرتوتوں تک سے واقف تھا، لوگ ایک دوسرے کی زندگی میں اس بری طرح دخیل تھے کہ آپ کوئی کام چُھپ کر نہیں کرسکتے تھے، عیب کرنے کے لئے بھی ساری بستی کا ہنر اور تعاون درکار تھا۔

عرصے سے اُن کی تمنا یہ بھی تھی کہ کسی جدید ترین جامعہ سے پی ایچ ڈی کرکے جامعہ کے پروفیسر بنیں، کیونکہ کالج پروفیسر کی کوئی لائف نہیں۔ اسی سعی میں کئی مرتبہ وہ مقامی جامعات میں تشریف لے گئے اور ''ڈیمو'' دیکر آئے، پھر ''اے سی کلاس رومز'' کی للک میں بار بار گئے۔ نتیجہ ایک ماہ بعد ہی سامنے آ گیا جب جامعات نے اُن کو ''لیکچر اعزازیہ چیک'' بذریعہ ڈاک کالج پتے پر بھیجنا شروع کردیا۔ پرنسپل تو بیہوش ہوتے ہوتے بچے ''یہ ڈیول ایمپلائمنٹ کالج اوقات میں کون کررہا ہے؟''

ہم چِک کر بولے ''ہم اور کون، یاد کیجئے آپ نے ۲۰۰۰ء میں مقامی عالیشان نجی کالج میں پڑھانے پر ہمارا کیا حال کیا تھا، ہمیں کر سکتے ہیں ڈہری ملازمت!''

سُلگ کر رہ گئے۔ بُلا کر پوچھا، بلکہ خود اُن کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا کہ معاملہ کیا ہے، بولے ''آج ہی اپنے مختلف کلاس رومز کی ڈیمو فوٹوز آپ کو ای میل یا واٹس ایپ کردوں گا، دیکھئے گا، طلبہ نے ہماری کیسی پذیرائی کی ہے، ہوسکے تو شیئر بھی فرما دیجئے گا اپنے لنکس پر!''

شاہد صاحب آہستہ سے غُرائے ''جو پذیرائی آپ سمیٹ کر لائے ہیں، اس دوران آپ کی اپنی سرکاری کلاسیں ویران بیابان پڑی رہیں، لیب اسسٹنٹ آپ کی غیر موجودگی کو نعمتِ خداوندی جان کر دونوں کولیاں بھرتا رہا، اُس پذیرائی کے یہ کچھ اعزازیے ٹی سی ایس سے آئے ہیں، قبول فرمایئے اور اپنے تنخواہ کے اکاؤنٹ میں جمع مت کیجئے گا!''

ہرگز نہ گھبرائے، ہنس کر بولے ''بہت اعلیٰ، اگر مجھے پتا ہوتا کہ زمانہ اس قدر ترقی کرچکا ہے کہ ''ڈیمو'' کا معاوضہ دیا جانے لگا ہے، وہ بھی اس قدر شان دار تو قریبی جامعات ونجی کالجز کے پرنسپلز کئی بار میری خوشامد کرچکے تھے کہ بھائی ہمارے بچوں کیلئے Physics کی ''پی'' ہی لکھ جاؤ آن کر، دیکھئے ذرا سا لاکھوں

احمد فراز صاحب نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ ہر بندہ جو شاعری کرتا ہے' وہ شاعر نہیں ہوتا۔ ہم تو آج تک احمد فراز صاحب کو اس لئے شاعر سمجھتے رہے کہ وہ شاعری کرتے ہیں۔ ویسے تو آج کل شاعر ہونے کے لئے شاعری کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ یہاں تو ادب کا پرائڈ آف پرفارمنس لینے کے لئے ادب لکھنا ضروری نہیں۔ البتہ ہم نے احمد فراز صاحب کو بڑا شاعر ان کے انٹرویوز پڑھ پڑھ کر مانا۔ منیر نیازی اور احمد فراز کے انٹرویوز میں ہی کڑواہٹ ہوتی ہے جو ان دو حضرات کے ہاں کے پانی میں پائی جاتی ہے۔ یہ تو خوشی کے موقع پر بھی یہ نہیں کہتے کہ منہ میٹھا کروائیں' کہتے ہیں ''کڑوا کروائیں''۔ البتہ یہ مشکل ہے کہ بندے کی عمر ذرا پختہ ہوجائے تو فراز صاحب کی شاعری سمجھ نہیں آتی' اگر عمر کچی ہو تو ان کے انٹرویوز سمجھ نہیں آتے۔

خندہ زن از یونس بٹ

روپے کا نسخان ہو گیا!''

''نسخان'' کا سنتے ہی شاہد اقبال صاحب اُچھلے اور یکا یک اُن کا شدید غصہ، شدید قہقہوں میں ڈھلتا گیا، پروفیسر غلام محمد (المعروف جی ایم) کی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے ہم سے بولے ''مجیب! لو یہ بھی تمہارے گرائیں نکلے!!''

واضح رہے کہ سابق پرنسپل صاحب (اُردو) گیارہ برس ، ''آڑی، تاڑی، سارے بتنے، قماش، پَٹ دینے، جھٹ دینے، لٹال لیا، بٹھال لیا، چانول، کرانچی، مجاز شریف ہٹھلو ، ڈیچکی ، ٹُشاب، جھانپ لیا، وغیرہ تلفظات فرماتے رہے۔ وہ ''ہے ہی'' کو ''ہئی ہے'' کہا کرتے۔

میں نے پروفیسر فزکس کو سمجھایا کہ سر، کلاس روم بھی کسی سلطنت سے کم نہیں ہوتا، استاد ہونا بھی ایک طرح کی فرماں روائی ہے۔ جبھی تو اورنگ زیب نے شاہ جہاں کو ایامِ اسیری میں بچوں کو پڑھانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ لیکن پروفیسر فزکس خود کو شاہ جہاں سے زیادہ خوش نصیب سمجھتے تھے۔

کہتے ''نہیں جامعہ میں پروفیسری کی حکمت آپ نہیں سمجھے!''

ہم سمجھ گئے کہ وہ اس لئے کہ انہیں یونیورسٹی کی ملازمت میں ماہانہ اعزازیہ کیساتھ ساتھ مکان، کنوینس، یوٹیلیٹیز وغیرہ بھی ملنے والے تھے۔ ساتھ وہ کسی ایسے ''الاونس'' کی للک میں بھی تھے جو حکومت، بطورِ خاص ماہرینِ طبعیات کو پیش کرنے والی تھی، ساتھ ایک رقعہ بھی کہ ''کاش آپ سب کا جدامجد، ایک معمولی سیب اُٹھا کر کھا لینے کے بجائے، جیب میں ڈال کر گھر نہ لے جاتا!''

صاحبو! ''سیب'' نے ہمیشہ ہی فساد پھیلایا۔

خیر، اپنی تمام مساعی کے ساتھ وہ شاعری بھی فرماتے رہے اور سناتے بھی رہے۔ شروع شروع میں ہمیں اُن کے تخلص کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ غیب سے جو مضامین اُن کے خیال میں آتے تھے وہ ان کے الہامی وفور اور طوفانی خروش کے کوزے میں بند ہونے کے ہرگز ہرگز قائل نہ تھے، چنانچہ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ چکی تھی، یہ ''خدایانہ'' لکھتے قلم بے غیرت ''یگایانہ'' لکھتا۔

نہ کوئی اُستاد تھا نہ کوئی شاعرانہ جانشیں۔۔۔ کتاب میں بھی پہلی سطر میں اُن ہی نام جلی حروف میں اور کتاب کا آخری سطر میں معمولی فونٹ میں لکھا تھا۔

شاہد صاحب ہمارے کان میں کہتے ''اکثر بے استادے اور بے تالے شاعروں کے کلام میں ''الف'' یا ''ی'' گر جاتا ہے، مگر اس کے مصرعوں میں تو تمام حروف تہجی ایک دوسرے کی کمروں پر سجدے کر رہے ہیں!''

لیکن، ہم جیسے اناڑی قاری کو یہ دورے پڑا کرتے کہ الٰہی ان کی کتاب پر کون سا ''ادبی الزام'' لگا کر تبصرہ لکھیں؟؟ کیونکہ کتاب بخش ''ہی'' دینے کے بعد وہ اس پر تبصرے کی خواہش کا اظہار فرماتے۔

اکثر اپنے شائع شُدہ اشعار پر ٹِک کا نشان لگاتے، جن اشعار پر خود ہی بار بار لوٹ پوٹ ہو جاتے، اُن پر تین تین ٹِک مارک لگاتے کہ ''ہیں یہ دیکھنے کی چیز انھیں بار بار دیکھ!''۔۔

سابق پرنسپل کو پیار سے، اُسی کے منہ پر ''بلدیہ ٹون'' کا علامہ کہا کرتے۔ کیونکہ وہ غریب ''ٹاؤن'' کو سہل اُردو میں ''ٹون'' (''کون'' کے وزن پر) ہی ادا کیا کرتا۔

سابق پرنسپل کے آفس سے واپسی پر فرماتے ''یہ آدمی قوم کا درد رکھتا ہے، حکام رس ہے، پر ہے کم ظرف، اس سے بچ کر رہنا!''

ہم نے بتایا، صاحب یہ کالج تو یتیم خانہ بنا دیا گیا ہے۔ سوائے، بھانت بھانت کی کمیٹیوں کیلئے چندہ اکٹھا کرنے کے پروفیسروں سے کوئی کام نہیں لیا جا رہا ہے۔

بولے ''کبھی اپنے سے بڑے بدمعاش یا باس کی اصلاح کرنے کی کوشش نہ کرنا، اُنھیں غلط راہوں پر دیکھو تو اندھے بہرے اور گونگے بن جاؤ اور اُن کی ہاں میں ہاں ملاؤ، ٹھاٹ کرو گے۔'' خود اُنہوں نے برسوں ٹھاٹ سے گزاری۔

افسوس ہم جذبات میں پروفیسر فزکس کی، اس نصیحت کو بھی فراموش کر بیٹھے۔ اکثر کہتے ''یہ پرنسپل پچیس روپے کی رسید کٹوا کر پندرہ روپے ہاتھ میں پکڑاتا ہے، اس نے دستخط کرنا ہی اُس وقت سیکھے ہیں جب، اسے چندے کی جعلی رسیدیں کاٹنی پڑیں ، ایک ڈی ڈی او بھی اس کے ساتھ ملوث ہے!'' ساتھ ساتھ

پروفیسر فزکس نے اس خواہش کا اظہار بھی فرمایا کہ وہ بڑے ہو کر ڈی ڈی او بھی بنیں گے تا کہ پاکستان کے تمام کالجز ''سائبر اکاؤنٹ کرپشن'' سے پاک و صاف ہو سکیں۔ وہ اپنے خونِ جگر سے اپنے ''سائبر چمن'' کی آبیاری فرما رہے تھے، سینچر کی رات پانی دیا کرتے اور پورا اتوار اپنے ''گلستان'' کو مہکاتے اور چہکاتے یعنی ایک ہی نشست میں دو تین درجن ''سائبر کرائمز'' سلجھا کر اُٹھتے۔ ساتھ ساتھ از خود کچھ ''منسٹریز'' کی جانب سے مختلف پروفیسروں کے جرائم پکڑ لئے جانے پر اُنہیں منسٹری کی جانب سے مبارک باد کا خط لکھتے اور خبردار کرتے ''کل کالج آ، پھر بات ہوگی!''

کئی مرتبہ ملزم حاضر اور خود وہ آنا بھول جاتے، کسی اور درس گاہ میں اُن بے بسوں کے دیرینہ ''سائبر کرائمز'' کے حل کے لئے کمر بستہ چل دیا کرتے۔ ایک مرتبہ ڈائرکٹر فزیکل ایجوکیشن کے نام کا ''اسکاؤٹ سیمینار'' شرکت کا سرکاری حکم نامہ آیا۔ موصوف کو یاد آیا کہ برسوں ہوئے، اِن کی اسکاؤٹ یونیفارم یوں ہی دھری ہے، کسی مصرف کی نہیں، چنانچہ ظفر کے ہاتھ سے لیٹر جھپٹا اور گھر لیجا کر اپنے ''سیل'' کے حوالے کیا، لمحہ بھر میں ظفر محمود کی جگہ اُن کا نام نامی موجود تھا، وہ کوئٹہ چلے گئے۔ ظفر محمود نے اپنی جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ اِدھر پرنسپل روتے گاتے رہے کہ کہاں چلا گیا؟ انٹر بورڈ کے سالانہ عملی امتحانات ہو رہے ہیں اور فزکس کا پروفیسر اسکاؤٹوں کو ٹریننگ دے رہا ہے، بلاؤ اُن کو۔

لیکن وہ خیر سے مہینہ گزار کر تشریف لائے، مزے کی بات تو یہ کہ آتے ساتھ ہی اُنہوں نے نو آموز پرنسپل صاحب کو اپنے کوئٹہ جانے کے سلسلے اور وہاں رہائش کے مزے لوٹنے کا ''ٹی اے ڈی اے'' بھی پیش کیا کہ صاحب، یہ ۲۲ ہزار روپے کالج فنڈ سے درکار ہیں۔ جو اُنہیں ملے بھی!!

وہ، موجودہ پرنسپل پر بھی اظہارِ خیال اس لئے فرمایا کرتے کہ وہ اِن سے اِن کی ذاتی فائل اُس کالج سے منگوانے کی طفلانہ فرمائش، بصورتِ دیگر فہمائش کیا کرتا جو یہ لا کر نہ دیتے تھے، اللہ جانے اُس فائل میں کون سا بھید تھا؟؟

کبھی کبھی ہمارا دل للچاتا کہ بچّوں کا کوئی جاسوسی ناول لکھیں ''فائل کا راز'' اور اُس میں ایک اشتہار دیں کہ ایک پروفیسر صاحب کی فائل کھو گئی ہے اور اُن کی ملازمت تو خیر کیا؟؟ دوسروں کی ملازمتیں خطرے میں ہیں، خدارا اُن کی فائل بھجوا دی جائے۔ کسی بھی خفیہ ذریعہ سے ہی سہی، وہ روپوش فائل تو برآمد ہو جائے کسی طرح، ہمارا بڑا دل چاہتا کہ الٰہی اُن کا فائل کسی طرح ہمارے ہاتھ لگ جائے، دیکھیں تو سہی، جو مشہور ہے کہ اُن کے فائل کو ماضی کے پرنسپل نے ''مولانا اسمٰعیل میرٹھی'' کی ''رہائمز'' کا مجموعہ بنا دیا ہے، اُس میں ہے کیا؟ میں نے کئی مرتبہ اپنے خدشے کا اظہار کیا تو سابق پرنسپل خوب ہنسا کرتے کہ جانے کی آلسی میں فائل نہیں لاتے۔ اب کوئی دوسرا تو ان کا یہ کام کرنے سے رہا، دیکھئے شاید موسمِ سرما میں ان کی ہمت پڑ جائے۔

وہ، پرنسپل آفس میں ''سُن'' کر آتے اور اسٹاف رُوم میں، سبھوں کو خُوب سُناتے، پرنسپل کے حق میں اظہار رائے فرمایا کرتے ''ارے صاحب، مضمون اُردو ہے، سرسید بنا پھرتا ہے، ٹھوٹھ جاہل ہے، میں نے خود اس کی شادی کی مووی میں اسے نکاح نامے پر انگوٹھا لگاتے دیکھا ہے، اُسی وقت اپنے موبائل فُون سے مووی بنائی اور اُسی رات ۳ بجے سوشل میڈیا پر ڈال دی، احتیاطاً ایک کاپی ''سائبر کرائمز سیل'' کے ہیڈ کو بھی بھجوا دی کہ لے بے تو بھی دیکھ لے کیسے کیسے پرنسپل بھرتی ہوئے جا رہے ہیں۔'' (یعنی از خود، دو مرتبہ مووی کے مزے لُوٹے، ہیڈ خود ہی تھے)۔

ایک دن بولے ''یہ اُردو والا پرنسپل کڑھا اور گُتھا ہوا ہے، گھسا ہوا بھی ہے اور منجھا ہوا بھی، صوبے کی زبان بڑی مہارت اور روانی سے بولتا ہے اور اُسی روانی سے زبان کی فاش غلطیوں پر اہلِ زبانِ صوبہ سے گالیاں بھی کھاتا ہے۔ ایسا ویسا چپڑ قنات نہیں، لقّہ ہے لقّہ اور لُچّا بھی ہے۔''

اُنہوں نے ایک ہی سانس میں دُکھیا کے پاجی پن کے تمام باریک شیڈز گنوا دئے اور ہم نے حنیف صاحب سے لُغت منگوا کر، ہر گالی کے بعد، لغت جھانکا، ہم نے عرصہ دراز زبان دانوں کی صحبت کے نخرے اُٹھائے تھے لیکن ہماری نالائقی کہ اب تک زبان

رُکنِ اسٹاف (یعنی پروفیسر صاحب) بولے ''یہ تو ذات کے کُنجڑے قسائی یا دلّی والے بھی بولتے ہیں، ہم ہم !!''

لیجئے ایک گھمسان کا رَن پڑا۔

اُس وقت تک شاہد اقبال صاحب نے ''پرنسپلانہ''، اپنے ناکردہ جرائم کا اعتراف نہیں کیا تھا، بولے ''بھئی کیا مصیبت نازل ہوگئی ہے، ایک منٹ کا سکون نہیں ہے!''

اس پر میں نے سمجھایا کہ دیکھئے پروفیسر فزکس صاحب، یہ والے پروفیسر صاحب تو ماہ دو ماہ میں کبھی کبھار تبرکاً تشریف لاکر اہالیان و متاثرینِ درس گاہ، بلکہ ''درگاہ'' کی عزت افزائی فرمایا کرتے ہیں، آپ اِن سے تو نہ اُلجھیں، سینئر ترین پروفیسر ہیں۔''

''ارے چھوڑیں اِن کو، اِن سے میں عید پر ملنے گیا تو جُہلا کی طرح تین تین دفعہ عید ملے، اودھ میں اشراف صرف ایک بار عید ملا کرتے تھے۔''

خدا معلوم، اِن کا اپنا وطن مالوف کون سا، اُن کے بزرگان بتایا کرتے ہوں گے، بقول پروفیسر ندیم احمد صاحب ''ان کا زر خرید خاندانی راوی تو صرف اِن ہی تمام رازوں کو سربریدہ کرنے کے بعد محض چیں چیں لکھ لکھ کر کبھی کا مرکھپ گیا، اب تو ان کے جرائم کی فائل بھی کہیں فرار ہو چکی ہے ہاہاہا۔۔۔''

واضح رہے، پروفیسر فزکس ابھی تک مختلف پرنسپلوں کو سبکدوش کروا چکے تھے، وہ غریب ان کی فائل دیکھنے کی ''چاہ'' میں گھروں کو سدھارے۔

اب توپوں کا رُخ ندیم کی جانب ہو جایا کرتا۔

ایک دن ہمیں سابق پرنسپل صاحب نے اپنے آفس میں بلایا اور سخت لہجے میں کہا ''حمیدی صاحب، آج کل اسٹاف رُوم میں شور کیسا رہتا ہے؟ میں نے آپ کو ایک لیٹر دیا تھا کہ چار پانچ صاحبان، جو آئے ہیں، اُن کی ذاتی فائلیں منگوانے کا لیٹر تھا وہ، نومبر شروع ہے، مجھے ACRs لکھ کر چارج شاہد صاحب کو ہینڈ اوور کرنا ہے، کب آئیں گی وہ فائلیں سر؟؟'' وہ برہم تھا۔

میں نے پرنسپل صاحب کو مطمئن کیا کہ سر سچی بات تو یہ ہے کہ میری اِن صاحب سے کہنے کی ہمت نہیں پڑتی اور نہ ہی دوسروں کی، حالانکہ اسٹاف میں مجھ سے سینئرز بھی موجود ہیں لیکن سبھی خاموش رہتے ہیں۔۔۔البتہ پروفیسر ہارون صاحب کے لیٹر پر میں نے شبیر صاحب سے 034/2013 کا نمبر لگوا دیا تھا، ساتھ آپ نے نوٹ کہا تھا، وہ لکھ دیا تھا، علاوہ گورنمنٹ ڈگری گرلز کالج سے پروفیسر تصور حسین صاحب، گورنمنٹ ڈگری بوائز کالج

ایک شاعر فارسی کا شعر سنا رہا تھا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ یہ شعر کس کا ہے۔ اس نے بڑے دھڑلے سے جواب دیا کہ ''یہ شعر میرا ہے۔''

سوال کرنے والے نے بھی پورے اعتماد سے کہا کہ شعر آپ کا نہیں ہے۔

شاعر نے بڑے وثوق سے اپنے اصرار کو دہرایا۔ ''جناب عالی! یہ شعر میرا ہے۔''

حزب اختلاف نے شاعر کی اطلاع کے لیے عرض کیا۔ ''جناب عالی یہ شعر تو خواجہ حافظ شیرازی کا ہے اور آپ نے حافظ کا شعر چرا لیا ہے۔''

شاعر نے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہے' حقیقت یہ ہے کہ حافظ نے میرا شعر چرا لیا ہے۔

معترض نے جواباً عرض کیا کہ آپ تو حافظ کے زمانے میں تھے ہی نہیں۔

شاعر نے زوردار لہجے میں ارشاد کیا کہ حضورؐ اسی لیے تو حافظ نے چرا لیا تھا۔ آپ خود ہی سوچئے' میں اس وقت موجود ہوتا تو حافظ کو چرانے دیتا۔

سدھارے۔

اب تو یوں کا رُخ ندیم کی جانب ہوجایا کرتا۔

ایک دن ہمیں سابق پرنسپل صاحب نے اپنے آفس میں بلایا اور سخت لہجے میں کہا ''حمیدی صاحب، آج کل اسٹاف رُوم میں شور کیسا رہتا ہے؟ میں نے آپ کو ایک لیٹر دیا تھا کہ چار پانچ صاحبان، جو آئے ہیں، اُن کی ذاتی فائلیں منگوانے کا لیٹر تھا وہ، نومبر شروع ہے، مجھے ACRs لکھ کر چارج شاہد صاحب کو ہینڈ اوور کرنا ہے، کب آئیں گی وہ فائلیں سر؟؟'' وہ برہم تھا۔

میں نے پرنسپل صاحب کو مطمئن کیا کہ سر سچّی بات تو یہ ہے کہ میری اِن صاحب سے کہنے کی ہمت نہیں پڑتی اور نہ ہی دوسروں کی، حالانکہ اسٹاف میں مجھ سے سینئرز بھی موجود ہیں لیکن سبھی خاموش رہتے ہیں۔۔۔البتہ پروفیسر ہارون صاحب کے لیٹر پر میں نے شبیر صاحب سے 034/2013 کا نمبر لگوا دیا تھا، ساتھ آپ نے نوٹ کہا تھا، وہ لکھ دیا تھا، علاوہ گورنمنٹ ڈگری گرلز کالج سے پروفیسر تصویر حسین صاحب، گورنمنٹ ڈگری بوائز کالج بفرزون سے سیّد طفیل ہاشمی صاحب، عمر فاروق صاحب اور غزالی حفیظ صاحب کی فائلیں بھی شاہد صاحب کے دور میں آجائیں گی، فی الحال آپ پروفیسر معین الدین صاحب کو جوائن کروا جایئے کیونکہ میں سمجھتا ہوں، شاید پروفیسر شاہد صاحب کو اس سلسلے میں کچھ مشکل درپیش آئے۔

پرنسپل صاحب نے غور سے میرا چہرہ دیکھا اور بولے ''ٹھیک ہے آپ پُرانے کالجوں سے ایڈمن معاملات نمٹا کر آئے ہیں، ٹھیک ہے، پھر شاہد صاحب ہی ان تمام حضرات کو جوائن کروا دیں گے، میں ہارون صاحب، سے پہلے غلام محمد صاحب اور پھر تصویر صاحب کی جوائننگ لے چکا ہوں، تینوں پروفیسر حضرات اچھے اور قابل پروفیسر حضرات ہیں۔اپ سے ایک گزارش کہ آپ کچھ کم اظہار رائے فرمایا کریں اسٹاف روم میں، کیونکہ اب شاہد صاحب صاحب پرنسپل ہونے والے ہیں اور آپ اور ندیم صاحب اُن کے دیرینہ رفقائے کار ہیں، آپ دیکھئے کہ پروفیسر ندیم صاحب بھی خاموش رہتے ہیں، شاہد صاحب آپ کے دوست بھی ہیں۔'' افسوس میں نے ڈاکٹر صاحب کی بات پر کان نہ دھرا، اور ''سال بھر'' اس جرم کا ایک عذاب سہا، جس کا متحمل میرا قلم نہیں ہوسکتا۔ میری آنے والوں سے ایک گزارش ہے کہ ''باس'' لاکھ دوست سہی، سگا بھائی سہی، لیکن آفس میں ''آفیشل پروٹوکول'' کو مجروح نہ کریں، نہ مضروب، نہ ہی فراموش۔اسی عرصہ میں میری پروفیسر غلام محمد صاحب سے بڑی گاڑھی چھننے لگی، شاید، شاہد صاحب سے ''پرہیز'' نے مجھے ''جی ایم'' کی صورت میں ایک بہترین دوست اور ساتھی دے دیا۔

کچھ عرصہ پہلے ہمارے ''بابا پروفیسر'' (جن کے نام کا مضمون ''تہجد بابا'' تکمیل کے مراحل میں ہے)، پروفیسر اقبال احمد انصاری کچھ عرصہ پہلے قریبی کالج کے پرنسپل ہو کر گئے تھے تو شاہد صاحب اور میں اُس نئے کالج میں اکثر اُن سے ملنے جایا کرتے، اُسی کالج سے ایک پروفیسر صاحب ترقی پا کر ہمارے کالج میں تشریف لائے۔بعد کے معاملات بڑی تیزی سے وقوع پذیر ہوئے، جب پروفیسر اقبال احمد انصاری صاحب کا سوئم ہو چلا تو مجھے کچھ ہوش آیا۔۔۔مجھے اندازہ ہوا کہ ''سینئرز'' آپ کی زندگی میں کس قدر چھتنار سایہ ہوا کرتے ہیں کہ وہ اپنے بہترین تجربات کی روشنی میں نہ صرف نوآموزوں کو اپنے پَروں میں سمیٹ رکھنے کی اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل ہوا کرتے ہیں بلکہ اُنہیں باقاعدہ محکمے کے تیور اور ''دھار'' ''وار'' سے بھی آگاہ کرتے رہتے ہیں، سرکاری نوکری ہر چند کسی ''نخرے'' کی متحمل نہیں ہوا کرتی۔چنانچہ شروع کے دو ایک سال، سینئرز، از خود، آنے والے اُستاد کی مختصر جملوں، کنایوں میں اصلاح کرنیکی کوشش کیا کرتے ہیں لیکن اگر آنیوالا ہی خود کو ''صالح'' سمجھ لے تو پھر بھائی بندی کا یہ عمل جمود و تعطل کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر زمانہ سمجھاتا ہے جو بڑا ہی کربناک عمل ہوتا ہے۔

خیر۔۔۔دن گزرتے رہے، ایک روز پروفیسر فزکس نے ہم سے فرمایا ''آپ بڑی محنت اور لگن سے اُردو پڑھاتے ہیں لڑکوں کو، الحمدللہ مسلمان کے فرزند ہیں، جلد از جلد نمازِ جنازہ اور نیاز دینا سیکھ لیجیے۔۔۔''

''جی!!!''

ہماری ''جی'' بلند ترین ہوتی گئی ، بولے ''اوہو ایسی کون سی بات ہے ہمارے تو سلیبس میں بھی نماز جنازہ بلکہ ہمارے اسکول میں تو ''غسل میت'' بھی کمپل سری تھا!''

اس پر اسٹاف رُوم میں مختلف دبے دبے قہقہے، مزید دب گئے، ایک کاری آواز ضرور کانوں میں پڑی کہ ''اجی ، پھر تو آپ اماوس کی راتوں میں چار پائیاں اُلٹ دیا کرتے ہوں گے!''

اُسی زمانے میں ہم نے کھلم کھلا درس گاہ کا ترانہ لکھنا شروع کر دیا تھا کہ:

خدا کیلئے کچھ کرم کیجئے
یتیموں کی فریاد سُن لیجئے

جبکہ پروفیسر فزکس اپنے ''سائبر کرائمز'' کواپ لوڈ کرتے اور مسلسل اُنہیں تھپکیاں دیتے رہتے کہ:

چپٹے رہو سینے سے ابھی رات پڑی ہے

وہ غریب ''سائبر جرم'' بیدم ہوکر ''ست'' چھوڑ دیا کرتا، لیکن یہ اُس کی جان نہ چھوڑتے۔

ہم واجد الدین صاحب سے کہتے ''ارے، اس کا، یہ کم بخت موبائل فُون تو غیر اسمارٹ کرو کسی طرح۔۔۔ سب کی جان مصیبت میں آ گئی ہے، دن و رات سائبر کرائمز ہیں اور ہم ہیں دوستو!''

واجد کہتے ''سر! جس کو ہو جان و دل عزیز، وہ اِن کے موبائل فون میں جائے کیوں، ویسے سائبر کرائمز یہ اپنے لیپ ٹاپ پر حل کرتے اور کرواتے ہیں!''

اچھا، مجھے کبھی حیرت بھی ہوتی کہ ان کا تقرر تو فزکس کے اُستاد کی حیثیت سے ہوا تھا لیکن ہر مضمون بالخصوص اُردو پر خاص طور پر ہاتھ صاف کرتے۔ یعنی اُنہیں تقریباً تمام ہی مضامین پڑھانے آتے تھے، سوائے اپنے مضمون کے۔ اُسی زمانے میں اسلامیات کی کلاس میں فتویٰ دے دیا کہ جس گھر میں کُتا ہو، وہاں اہلِ خانہ پر ہر دو گھنٹے بعد غسل واجب ہو جاتا ہے، اب تو لڑکوں نے ہر دو گھنٹے بعد کالج کے باتھ روم میں نہانا شروع کر دیا، بڑی مشکل سے پرنسپل صاحب نے چیخ چیخ کر اس فتوے کی تحلیل کروائی ورنہ وہ تو اپنے فتوے کی تحلیل بلکہ تذلیل کے لئے اورنگ زیب عالم گیر کو بلوانیوالے تھے، مع ''فتاویٰ عالمگیری (جلد سوم)''، ذاتی خرچے پر۔

ہم سے کہتے ''دیکھئے برصغیر میں گائیکی کی بنیاد طبلے پر ہے، گفتگو کی گالی پر اور زَبان کی تدریس کی گرامر پر!'' اتنا کہہ کر انگریزی کی کلاس میں جا گھسے۔۔۔

انگریزی کے پروفیسر اُن دنوں اپنے بدترین صحی مسائل سے گزر رہے تھے بیچارے۔ کبھی کبھار آتے، ورنہ کوآپریٹو (مددگار) استاد سے کام چلایا جاتا۔

سابق پرنسپل صاحب روزانہ مسائل کے حل کے لئے ایک ''کمیٹی'' بناتے اور ہر کمیٹی کے اراکین کا انتخاب وہ خود کیا کرتے، جن میں اکثریت اُن نوآموز حضرات کی ہوتی جو ابھی، سرکاری ملازمت کی نزاکتوں کی باریکیوں سے واقف نہ تھے، وہ خوشی خوشی عہدہ براہ ہونے کی للک میں مختلف کمیٹیوں میں کام کرنیکی ہامی بھرلیا کرتے جبکہ سینئر پروفیسر شاہد اقبال صاحب چاہتے کہ جو بھی وقت ہے وہ ہنس کھیل کر گزر جائے نہ کہ دقیق پند و نصائح میں۔ اکثر میں، اُن کیساتھ کراچی کے قلبی علاقوں میں اِدھر اُدھر بھی گھومتا رہتا اور اُن کے تجربات کو اپنے لئے کشید کرتا رہتا۔ اُس زمانے میں ہم پروفیسر اقبال احمد انصاری، پروفیسر اظہر احمد، پروفیسر غلام صابر، پروفیسر کرامت راج، پروفیسر طلعت قریشی، پروفیسر رخسانہ و دیگر اثاثوں کے حامل ہوا کرتے تھے، لہٰذا کالج میں اِک عجب روشنی رہا کرتی، ہوتے ہوتے سب کچھ تیزی سے تبدیل ہوتا گیا اور تیرہ پندرہ برسوں میں حالات نے خود کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیا۔ میں بھی اب بڑھاپے کی سرحدوں کو چُھونے لگا تھا، چنانچہ خوشی کو ''تلاشتا'' اور کچھ نہ کچھ لکھنے پڑھنے کی دیرینہ عادت سے کام چلا لیا کرتا۔

سوشل میڈیا کا استعمال بھی گزارے لائق آتا تھا، اس ''فن'' کو مزید سیکھا۔ میں، اپنی کلاس ہمیشہ خود لیا کرتا، کیونکہ مجھے ''بادشاہی'' کا نشہ لگا ہوا ہے۔ جو نشہ ''معلّمی'' میں ہے، وہ بھلا کسی

اور نشے میں کہاں؟؟

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ ایک روز، پروفیسر فزکس انگریزی کی کلاس میں چلے گئے۔

کہتے ہیں کہ "بھیج دئے گئے!" کہا کریں۔

ہم لکھتے ہیں، اُن کا انگریزی کی کلاس میں جانے کو دل چاہا۔

کچھ بھی سمجھ لیجئے۔۔۔

بہت ہی منجھے اور گھسے ہوئے اُستاد، سخت سے سخت مقام سے باآسانی گزر جانے والے۔ وہ بتاتے کہ میں نے انگریزی گرامر اُردو زبان میں پڑھی ہے، چنانچہ کلاس روم میں گئے اور تختۂ سیاہ پر اُنہوں نے پارسنگ (Parsing) لکھا۔

اُس کے نیچے GoTo لکھ دیا۔

پھر پوچھا اس کا کیا مطلب ہے؟؟

ایک لڑکا ہاتھ اُٹھا کر بولا Simple infinitive

اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے "بالکل ٹھیک، لیکن دیکھتے کہ دوسرا ہاتھ ابھی تک اُٹھا ہوا ہے، گرا نہیں ، اُس سے پوچھتے "آپ کو کیا تکلیف ہے؟"

وہ کہتا "نہیں سر، یہ infinitive noun ہے۔"

فرماتے "اچھا آپ اُس لحاظ سے کہہ رہے ہیں۔۔۔"

اب کیا دیکھتے ہیں کہ کلاس کا سب سے زیادہ ذہین لڑکا ابھی تک ہاتھ اُٹھائے ہوئے ہے۔ اُس سے کہتے "آپ کا سگنل ابھی تک ڈاؤن نہیں ہوا، کہیے، کہیے!"

وہ کہتا: "یہ Gerundial infinitive ہے جو Reflexvie Verb سے مختلف ہوتا ہے اور Nesfield گریمر میں بھی یہی لکھا ہے سر!"

اس مرحلے پر اُن پر انکشاف ہوتا کہ:

گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

لیکن بہت سبھاؤ اور نکتہ فہم انداز میں فرماتے، "اچھا تو گویا آپ اُس لحاظ سے کہہ رہے ہیں!"

اتنے میں نظر اُس لڑکے کے اُٹھے ہوئے ہاتھ پر پڑی جو ایک "او لیول" سے آیا تھا اور فر فر انگریزی بولتا تھا، پروفیسر ندیم اُن لڑکوں پر بڑی محنت کر رہے تھے کہ یکلخت سخت علیل ہوئے۔

اُس سے پوچھا Well? Well Well! مسٹر!!

اُس نے جواب دیا Sir, I am afraid, this is an intransitive verb!

فرمایا "اچھا تو گویا آپ اُس لحاظ سے کہہ رہے ہیں، پھر آئی ایم آفریڈ کے محاورے سے ناواقفیت کے سبب بڑے مشفقانہ انداز میں پوچھا "عزیزمن اِس میں ڈرنے کی بھلا کیا بات ہے؟؟؟"

موصوف اکثر فرماتے "انسان کو علمی تحقیق اور تجسس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھنا چاہئیے،" ہمیں لگتا خود انہوں نے ساری زندگی "بارہ دری" میں گزاری۔ دراصل وہ کتاب نہیں، زندگی پڑھاتے تھے۔

اسی کے ساتھ ہم پر ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا، ہم پر "چریا" کا مفہوم نازل ہو چکا تھا، یعنی "چریا" بے انتہا خطرناک اور "آقائے سائبر کرائمز" کے علاوہ دنیا کے ہر آدمی کو "چریا" کہا جاتا ہے۔ سلام!

(نوٹ: پروفیسر معین الدین پیرزادہ صاحب کا خاکہ لکھنے میں مجھے شدید ذہنی اذیت اور اپنے پاؤں میں فریکچر کا بھی سامنا رہا، تحریر سے کہیں کہیں اندازہ ہو رہا ہوگا۔ کیونکہ معین کی اُکھڑ اور اُکھڑ طبیعت سے ناواقفیت تو نہیں لیکن، خیر، اگلی مرتبہ اِن شاءاللہ پروفیسر عبدالحئی مہر صاحب سے ملواتے ہیں یا پروفیسر شاہد اقبال صاحب سے:) ان شاءاللہ!!!

کراچی سے تعلق رکھنے والے پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی اُردو کے ایک بہت بڑے ادیب جناب انوار (عیگ) کے بہت بڑے صاحبزادے ہیں۔ یہ بچوں کے معروف ادیب ہیں۔ اب تک اِنہوں نے بچوں کے لئے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کہانیاں لکھ لی ہیں اور مسلسل لکھ رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے اندازِ بیان کا طرۂ امتیاز شگفتگی اور بیساختگی ہے۔ خصوصاً قلمی خاکے لکھنے میں تو اِن کا جواب ہی نہیں۔ حالات و واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تصویر سی بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" کو فخر حاصل ہے کہ یہ اس کے لئے تسلسل سے لکھ رہے ہیں۔

نذیر احمد شیخ

(قصہ برادران صید خان اور صیاد خان)

مشکل ہوئی پہچان کہ ہے کون یہاں کون
سب لوگ پریشان کہ ہے کون یہاں کون
ہر وقت یہ خلجان کہ ہے کون یہاں کون
شیطان بھی حیران کہ ہے کون یہاں کون
ایسی ہے مساوات ِ خداداد کی صورت
جو صید کی صورت وہی صیاد کی صورت

کردار کا گفتار کا ڈھب دیکھیے یکساں
رفتار تو رفتار ہے چھب دیکھیے یکساں
قد دیکھیے رخ دیکھیے لب دیکھیے یکساں
اب دیکھیے تب دیکھیے جب دیکھیے یکساں
اتنی بھی نہ ہمرنگ ہو ہمزاد کی صورت
جو صید کی صورت وہی صیاد کی صورت

دنیا ہے کہ ہر وقت ستاتی ہے کسی کو
ہوتا ہے کوئی اور بلاتی ہے کسی کو
کیا ظلم ہے جب نیند بھی آتی ہے کسی کو
سُونا ہو کسی کو تو، سلاتی ہے کسی کو
ماں باپ بھی سمجھے نہیں اولاد کی صورت
جو صید کی صورت وہی صیاد کی صورت

درجہ تھا کوئی اور نہ اسکول کوئی اور
استاد سے بڑھ کر نہ بنا فول کوئی اور
جب وقتِ سوالات ہوئی بھول کوئی اور
معقول کوئی اور تھا مجہول کوئی اور
یہ بیٹھ کے تکتے رہے اُستاد کی صورت
جو صید کی صورت وہی صیاد کی صورت

آیا تھا نظر ایک فسادات کے اندر
ملکہ ہے پولس کی تو کمالات کے اندر
کچھ فرق نہ پایا جو جمالات کے اندر
دونوں کو کیا لا کے حوالات کے اندر
اب داد کی صورت ہے نہ فریاد کی صورت
جو صید کی صورت وہی صیاد کی صورت

جب حسن کی نظروں سے گزارے گئے دونوں
میدانِ محبت میں پُکارے گئے دونوں
مرنا تھا فقط ایک کو مارے گئے دونوں
یہ سوچ کہ دنیا سے کنوارے گئے دونوں
پیدا نہ ہو گھر میں کوئی افتاد کی صورت
جو صید کی صورت وہی صیاد کی صورت

روٹھی بیوی سے خطاب

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

جو دیکھے تھے سپنے سہانے ترے
کہیں ہو گئے گم فسانے ترے
نہ پہلی سی اب وہ محبت رہی
نہ پہلے سے ہیں دوستانے ترے
"لڑائی کے منظر نگاہوں میں ہیں"
وہ کانوں میں گونجیں ہیں طعنے ترے
گئی مجھ سے لڑ کر مری جان کیوں
بتا حکم میں نے نہ مانے ترے؟
اگر کام سے تھک گئی ہے بتا
دبانے کو آجاؤں شانے ترے
"بس اک داغ چھٹا مری کائنات"
جبیں پر رقم ہیں فسانے ترے
ہرے زخم کرنے مرے پاس آ
کہ تازہ ہوں پھر تازیانے ترے
مرا گھر چلے گا یہ کیسے بتا ؟
جو میکے میں ہوں گے ٹھکانے ترے
ترے بعد ہنگامہ کرتے ہیں سب
یہ چھوٹے ، بڑے ، درمیانے ، ترے
عجب مارا ماری ہے گھر میں بپا
ہے رضیہ کو مارا رضا نے ترے
تبسم کی چٹنی کہیں کھو گئی
وہ اب گا رہی ہے ترانے ترے
اُدھیڑا ہے تکیہ لڑائی میں یوں
لگے روئی بچے اُڑانے ترے
تہی چادروں سے ہیں بستر تمام
زمیں پر پڑے ہیں سرہانے ترے
ہے مشکل کہ مل جائیں برتن وہی
جو سیٹ توڑ ڈالے رِدا نے ترے
بتا اب کہاں سے یہ سب آئے گا
نہ میرے ، نہ ہیں کارخانے ترے
ہے چھوٹا بہت چیختا پیٹتا
بڑا مجھ کو دیتا ہے طعنے ترے
ہیں سب بچے تیری طرح بے سُرے
وہ روئیں تو یاد آئیں گانے ترے
کوئی حکم اب مانتا ہی نہیں
نہ میری کچہری ، نہ تھانے ترے
خدارا مجھے بخش دے کچھ سکوں
تجھے ہوں مبارک خزانے ترے
میں کل بھی تجھے لینے آیا تھا گھر
نہ گھسنے دیا تھا چچا نے ترے
مری جان اب رُوٹھنا چھوڑ دے
مجھے آگئے ناز اُٹھانے ترے
کروں گا نہ کوئی ستم جانِ جاں
میں گاتا رہوں گا ترانے ترے

یوم اقبال پہ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

جب اقبال ڈے کی قومی تعطیل عدالت
کے فیصلے کے باوجود بحال نہیں کی گئی۔

اقبال کے اشعار کو سمجھیں کیسے
آواز بہت رکھتا ہے قوال بلند

خود ہی کو نمایاں کیا اور چھوڑی خودی
اب ذات کے ہیں چاروں طرف وال بلند

تہذیب و شرافت تو کہیں بیچ آئے
بس چھین جھپٹ سے رکھیں مورال بلند

کیا حال بنایا ہے نہیں اس سے غرض
ماضی ہے چلو اپنا بہرحال بلند

رکھے گی نہ یہ قوم گر اقبالؔ کو یاد
ہوگا نہ کبھی اس کا بھی اقبال بلند

دہلی شہر میں آڈ ایون فارمولہ فیل ہو چکا ہے۔ آلودگی خطرناک لیبل پار کر چکی ہے، یہ نظم اِسی پسِ منظر میں قلم بند کی گئی ہے۔

بڑھ رہی ہے دن بدن ہر شہر میں آلودگی
شہریوں کی کم نہیں ہوتی مگر بے ہودگی
دو دو گھنٹے جام شہروں کا مقدر ہو گیا
شہر کاروں اور ٹرکوں کا سمندر ہوگیا
ہورہی ہیں گاؤں میں شہروں میں لاکھوں شادیاں
بڑھ رہی ہیں شادیوں سے شہر کی آبادیاں
عورتوں مردوں کے ملنے پر لگیں پابندیاں
دور ہیٹر سے رضائی سے کریں یہ سردیاں
مرد نکلیں ایک دن سڑکوں پہ عورت ایک دن
اس طرح قابو میں آ سکتا ہے آبادی کا جن
بڑھتی آبادی پہ ہم نے گر لگائی نہ لگام
شہر میں کرنے پڑیں گے اس طرح کے انتظام
پیر کو نکلیں گے وہ بس جن کے پے سے نام ہیں
اور منگل کو وہی جو میم سے بد نام ہیں
بدھ کے دن بے نام والے گھر سے نکلیں گے فقط
جیم والے روڈ پر دو دن کریں گے دستخط
وہ سنیچر کو چلیں گے سین سے جن کے ہیں نام
گھر کے اور دفتر کے نمٹائیں گے اپنے سارے کام
لاگو کرنا ہی پڑے گا ضابطہ سرکار کو
گھر سے نکلیں گے الف والے فقط اتوار کو
طوئے ظوئے لام یے ہے اور بچے جو شین قاف
ان خطاوارں کی ہوگی ہر خطا یارو معاف
اب کوئی ہمدرد ہوگا اور نہ کوئی درد مند
تا قیامت گھر کے اندر ہی یہ ہو جائیں گے بند

احمد علوی

غلامی کی علامتیں

(آج کل بھارت میں مغلوں کی تعمیر کردہ عمارات پر قضیہ چل رہا ہے۔ فرقہ پرست سنگھی ذہنیت کے نشانے پر مسلمانوں کی ہر شے ہے اس وہ مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اسی پس منظر میں یہ نظم ہے۔)

احمد علوی

مٹا ڈالو ہر اک شے جو غلامی کی نشانی ہے
نئی تاریخ ہندوستان کی ہم نے لکھانی ہے
محل ممتاز کا بھارت کی پیشانی پہ دھبہ ہے
قطب مینار آنکھوں میں بہت میری کھٹکتا ہے
رخ دہلی پہ بھی اک داغ جیسا لال قلعہ ہے
ہمایوں ٹوم بھی مغلوں کا ہی افسانہ کہتا ہے
ہمارا ملک ہے لیکن ہمارا کچھ نہیں بھائی
یہ جی ٹی روڈ بھی تو شیر شاہ سوری نے بنوائی
سنا ہے ممبئی میں گیٹ وے برٹش نے بنوایا
مرے سی پی کے ہر چوراہے پر لٹین کا ہے سایا
بچھایا جال ریلوں کا یہاں برٹش حکومت نے
ہزاروں پل بنائے یہ بھی کی سازش حکومت نے
میاں اک اینٹ ساؤتھ زون میں اپنی نہیں نکلی
گئے ہم نارتھ میں بھی پر یہاں ہندی نہیں نکلی
کہو سنسد بھون کس زعفرانی مٹھ نے بنوایا
پریزیڈنٹ ہاؤس پر بھی انگریزوں کی ہے چھایا
چلو ان چمچاتی دوڑتی کاروں کو دفنا دیں
نئی دہلی کی سڑکیں بیل گاڑی سے نہ پٹوا دیں
غلامی کی نشانی ہیں، ہوائی یاترائیں بھی
تیا گو فون، انٹرنیٹ، مصنوعی ہوائیں بھی
یہ میزائل بھی انگریز کی ایجاد ہے شاید
ختنگوں کا مگر موجد کوئی پرساد ہے شاید
لڑی ہے جنگ آزادی بہایا خوں شہیدوں نے
کٹا کے سر ہمیں بخشی ہیں خوشیاں سر بریدوں نے
لہو سے اپنے ہم نے کی ادا قیمت غلامی کی
ملی کب مفت میں عزت ہمیں یارو سلامی کی
غلامی کے نشاں چسپاں ہیں یارو چپے چپے پر
انہیں سے دھوم ہندستاں کی ہے دنیا کے نقشے پر
چلا کرتی ہیں ساری گاڑیاں آگے کی جانب کو
ہمیشہ دیکھتے ہو تم مگر پیچھے کی جانب کو
کسی دن خود مروگے اور تم اوروں کو مارو گے
اگر آگے کی جانب زندگی میں تم نہ دیکھو گے
اگر ان کو مٹا دوگے بچے گا کیا یہاں یارو
کسی بیوہ کی صورت ہوگا یہ ہندوستاں یارو

دریوزۂ جمہوریت

(روحِ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

کہیں میرا ووٹر نہ ہاتھوں سے جائے
نہ ہاری مرا اب کرے بے وفائی

مری اُس کے جغرافیے پر نظر ہے
کہ تاریخ سے اُس کی، ہے آشنائی

خریدا ہے پیسوں سے اُس کو ہمیشہ
وگرنہ کرے یہ ہمیشہ گدائی

پہنچنے سے جمہوریت کے، یہاں پر
سدا ہی رہے گی مری پادشاہی

محمد خلیل الرحمٰن

اُستاد

شریر بچوں کو جماعت سے رخصت کرتے ہوئے

محمد خلیل الرحمن
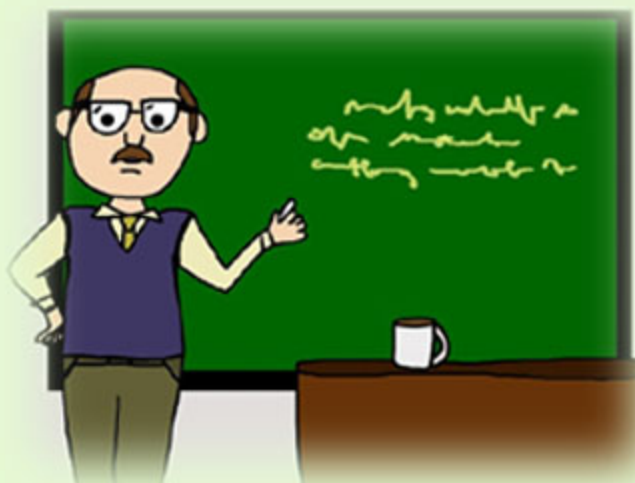
عطا ہوئی مجھے جس روز تیری استادی
سمجھ چکا تھا کسی دن ہے میری بربادی

سنا تھا خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں تھے خودسری و آزادی

شرارتیں یہ تری خواب میں بھی گر دیکھوں
خیال وخواب ہو میری خوشی ، مری شادی

جتن کیے میں نے کتنے کہ باز تو آئے
شرارتوں کا ہمیشہ سے تو رہا عادی

خلوصِ دل سے دُعا بس یہی میں کرتا ہوں
بچا رہے ترے شر سے ہر ایک فریادی

ہزار جان سے خوش ہوں کہ جا رہا ہے تو
جو غیر ملک کو اپنا بنا رہا ہے تو

قول و عزم

نوید ظفر کیانی

(مکالمہ اور اس کے جواب میں ایک دل ہی دل میں جوابی مکالمہ)

اِس نے کہا وعدہ کرو ''دلداری کروں گی''
اُس نے کہا یہ کاوشِ بیکاری کروں گی

اِس نے کہا سردار قبیلے کا ہے فدوی
اُس نے کہا گھر پر تو میں سرداری کروں گی

اِس نے کہا گھرداری ہے ہر گھر کی ضرورت
اُس نے کہا سکھلانے کی تیاری کروں گی

اِس نے کہا ماں اپنی سمجھنا میری ماں کو
اُس نے کہا میں اس کی اداکاری کروں گی

اِس نے کہا دل پھینک کہا جاتا ہے مجھ کو
اُس نے کہا پھر خود کو میں تاتاری کروں گی

اِس نے کہا بہنیں ہیں مجھے جان سے پیاری
اُس نے کہا اللہ کو بھی میں پیاری کروں گی

اِس نے کہا یاروں پہ فدا رہتا ہے یہ دِل
اُس نے کہا میں دور یہ بیماری کروں گی

اِس نے کہا اِک پیار کی دنیا ہے مرا گھر
اُس نے کہا بس بس یہیں بمباری کروں گی

اِس نے کہا کہ شوقِ سخن گوئی ہے مجھ کو
اُس نے کہا پھر میں بھی گلوکاری کروں گی

ڈاکٹر شہلا نواب

مشاعرہ فکسنگ

بلاشبہ کہا جاتا ہے مشاعرے ہماری اُردو تہذیب کی شان ہیں اور آج کل اُردو دشمنی کے اس دور میں مشاعرے ہماری اردو زبان کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ وہیں یہ بھی دیکھنے میں آرہا ہے جس طرح سے میچ فکسنگ ہوتی ہے اسی طرح سے مشاعروں میں بھی فکسنگ کا رواج بڑھتا جارہا ہے۔ یقیناً ہمارے قارئین کے ذہن میں یہی سوال ہوگا کہ مشاعروں میں فکسنگ اس بات کا کیا مطلب ہے؟ اس بات سے تو سب ہی واقف ہیں کہ مشاعروں کے اسٹیج پر ادھار کا کلام پڑھنے والوں کی کمی نہیں ہے یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ پڑھنے والیوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ اب بنی بنائی غزل کے ساتھ سجا سجایا اسٹیج بھی مل گیا اور وہ بھی استاد کی سفارش سے، سجے دھجے میک اپ سے لیس چہرے، خوبصورت آواز کا ترنم سب ہی کچھ ہے مگر اب مسئلہ ہے داد کا۔ اس کے لئے صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے کچھ چنندہ لوگوں کا مجموعہ ہوتا ہے گروہ بندی میں اس فرقے کو ادب میں کیا نام دیا جائے مجھے اس کے لئے کوئی مناسب نام نہیں مل رہا چمچہ ہم استاد بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ عام طور سے ایک ہی استاد کے شاگرد ہوتے ہیں جو ادھار کی غزلوں کو راشن کے طرح چلاتے ہیں مگر یہ راشن کبھی پرانا نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں کوئی خرابی آتی ہے۔ ہر محفل میں تازہ کہہ کر سنائی جاتی ہے۔ خیر ایک ہی استاد کے تمام شاگرد ہیں وہ اس کو ہی داد دیں گے جنکو ان کے استاد نے غزل لکھ کر دی ہو۔ اس کے علاوہ کوئی کتنا ہی اچھا شعر کیوں نہ سنادے مجال ہے ان استادی گروہ سے کوئی کسی دوسرے گروہ کو داد دے دے۔ ایسا لگتا ہے ان کے حواس بند ہوجاتے ہیں۔ ایسا ماحول کم وبیش تمام مشاعروں میں ہی دیکھنے کو مل رہا ہے۔ غزل چاہے کتنی ہی پرانی کیوں نہ ہو اس کو دل کھول کر داد دی جاتی ہے اور کچھ غزلیں تو دو بار سویٹ سکسٹین کی عمر پار کرچکی ہیں مگر مشاعروں کے اسٹیج پر ابھی بھی تازہ اور نئی بنی ہوئی ہیں۔ ہمیں اگر اردو زبان کو زندہ رکھنا ہے تو اس قسم کی بناوٹی داد کو کسی مشاعرے کی کامیابی ضمانت تسلیم کرنے سے انکار کرنا ہوگا اور اس قسم کی بیہودہ حرکتوں سے اپنے مشاعروں کے اسٹیج کو پاک کرنا ہوگا۔ یہ مشاعروں کے لئے ہی نہیں ادب کے لئے بھی مضر ہے۔

پچھلے کئی سالوں سے مشاعروں اور ادب کی دنیا سے غیر حاضر رہنے کے بعد جب اس دنیا میں پھر قدم رکھا تو اس نئے قسم کی فکسنگ سے واقفیت ہوئی اور حیرانی بھی ہوئی یہ ادب میں جانبداری کا رویہ زبان کی ترقی کی کونسی علامت ہے۔ ہم اپنے مشاعروں کو کس جانب لے جارہے ہیں کہ ہم جس کو چاہیں وہ ہی

تمہارے سارے کوائف جھوٹے ثابت ہوئے ہیں، مبارک ہو! تمھیں سیلز ڈیپارٹمنٹ کے لئے منتخب کرلیا گیا ہے۔

کامیاب ہوگا۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہم اس بات کو جانتے ہیں مگر پھر بھی غلط روایت کو جنم دے رہے ہیں۔ پہلے تو مشاعروں میں شاعر خود کہہ کر داد طلب کیا کرتا تھا اب واہ واہ نے تالیوں کی شکل اختیار کرلی ہے۔ یہ بھی ایک الگ ہی نظارہ ہے۔ مگر یہ تو جانبداری کا رویہ ہے یہ بہت خطرناک صورت اختیار کرتا جارہا ہے اور یہ لوگ کسی دوسرے کو مشاعرے میں کامیاب ہونا تو بہت دور اس کو پڑھنے ہی نہیں دیتے ہیں۔ کیونکہ اس کا استادی خیمہ الگ ہے اور ہمارہ استادی خیمہ الگ۔ اس لئے ہمارے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو داد مل جائے۔ کیا ہم ایسی ہی بیہودہ روایت کے سہارے ادب کی کشتی کو کھینے کی بات کرتے ہیں اور اس کشتی میں خود ہی سوراخ کردیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم بھی اس کشتی میں سوار ہیں۔ یہ ایک بہت ہی اہم مسئلہ ہے۔ جس کا ہم سب کو بیٹھ کر سوچنے اور حل کرنے کی ضرورت ہے۔ میں جانتی ہوں کہ ادب ہی کیا ہر جگہ گروپ بازی ہے مگر ہمارے مشاعروں کے اسٹیج کسی بھی قسم کے تعصب اور تنگ نظری سے الگ ہٹ کر شاعر اور متشاعر (مرد و خواتین) دونوں کو ہی اپنے دامن میں جگہ دیئے ہوئے ہیں پھر یہ فکسنگ جیسی تنگ نظری کیا معنی رکھتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ چلن بھی ہوتا جارہا ہے کہ جو ہم پڑھ رہے ہیں وہ غزل ہے اور دوسرے نے جو پڑھی وہ اس کے استاد کی مہربانی ہے اور بہت آسانی کے ساتھ ہم اس الزام کو کسی کے بھی سر لگانے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اب تو غزل نے باقاعدہ گانے کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اشعار کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں اگر ترنم نہیں تو غزل نہیں لگتی ہے۔ کیونکہ ہم نے سامعین کو بھی ایسی ہی عادت ڈال دی ہے اور اب ان کی نظر میں شاعر غزل یا شعر سناتا نہیں ہے گاتا ہے۔ میں ترنم کے خلاف نہیں ہوں مگر اس روایت کے چلن میں ہمارے مشاعروں کی حالت بھی ہندوستان کیطرح ہوجائے گی جہاں کیش لیس ہونے کی بات نے سب کو پریشان کر رکھا ہے وہیں مشاعروں کی اسٹیج پر بھی تحت لیس کی تختی آویزاں دکھائی دے گی اور ہم سب ترنم کو ہی غزل مانیں گے۔

ڈاکٹر شہلا نواب کا تعلق دہلی سے ہے۔ موصوفہ ایم اے (اردو، جرنلزم اور سیاسیات)، ایم ایڈ، پی ایچ ڈی اور ایل ایل بی ہیں۔ درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ بہت اچھی شاعرہ ہیں۔ اُنھوں نے اپنے قلم کو حقیقت میں تلوار بنا رکھا ہے۔ اُردو سے محبت کرتی ہیں اور ادب کی ناہمواریوں پر بڑے بے باکانہ انداز میں مضامین لکھتی ہیں۔ ان کے اندازِ بیان کی بے باکی اور جدت مسحور کن ہے۔ کم کم لکھتی ہیں لیکن جو بھی لکھتی ہیں، خوب لکھتی ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' پر گزشتہ برس سے نظرِ عنایت ہے، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

ادارہ

قہقہہ نواز

خادم حسین مجاہد سے چند سوالات

اپنے نام اور تخلص کے بارے میں کچھ بتائیں۔

میرا نام خادم حسین اور تخلص مجاہد ہے کیونکہ میں ۱۹۹۸ء تا ۲۰۰۹ء تک سنجیدہ اور طنز و مزاح پر مبنی شاعری کرتا رہا ہوں لیکن میری شاعری کی مقدار کم ہے کیونکہ میرا رجحان زیادہ تر نثر کی طرف رہا ہے۔ والدہ نے میرا نام محمد عنایت رکھا تھا جبکہ دادی نے خادم حسین۔ چونکہ حکومت دادی جان کی تھی اس لئے ان کا دیا گیا نام ہی کاغذات میں لکھا گیا۔ درمیان میں میرا نام کچھ عرصہ امجد حسین بھی رہا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ بچپن میں شدید بیمار ہونے کے باعث علاج وغیرہ کے ساتھ ساتھ ایک عامل سے رابطہ کیا گیا جس نے پیسے کھرے کرنے کے لئے ''سایہ'' تشخیص کیا اور تعویزات کے ساتھ نام بدلنے کا حکم دیا تاکہ ہوائی اثرات زائل ہوسکیں جو کہ دراصل تھے ہی نہیں۔ مسئلہ طبی تھا جو سپیشلسٹ کے پاس جانے سے حل ہوگیا۔ پچھلے آٹھ سال سے شاعری چھوڑ رکھی ہے لیکن اب مجاہد میرے نام کا لازمی حصہ ہے۔ میں اپنے اصل نام کے علاوہ ''کے ایم ایچ مجاہد''، ''مجاہد ادیب شیخ'' اور ''میاں امجد عنایت'' کے قلمی ناموں سے بھی لکھتا ہوں۔

آپ نے شاعری کیوں چھوڑی حالانکہ یہ اظہار کا بہترین وسیلہ ہے؟

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ طبعاً میرا رجحان شاعری کی طرف کم تھا۔ جوانی میں جب ہر کوئی شاعر بن جاتا ہے تو میں بھی ہوگیا لیکن جب دورِ جنوں گزرا تو محسوس ہوا کہ شاعری میری طبیعت سے زیادہ لگا نہیں کھاتی۔ بیس برسوں میں بمشکل میری چالیس پچاس غزلیں نظمیں ہوں گی جبکہ اس دوران میں نے نثر میں سینکڑوں تحاریر لکھیں اور قارئین نے بھی بطور نثر نگار زیادہ پسند کیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ایم۔ اے اُردو کے دوران قدیم شاعری پڑھنے کا موقع ملا تو اس میں دہریت، کفر اور شرک کو وافر مقدار میں پایا تو معلوم ہوا کہ شاعری کو قرآن مجید میں کوئی اچھا مقام حاصل نہیں کیونکہ شاعری کا حُسن جھوٹ اور مبالغہ ہے جو شرعاً پسندیدہ نہیں۔ ویسے بھی میرا خاندانی پسِ منظر مذہبی ہے لہٰذا یہ سب چیزیں نظر میں آئیں تو شاعری سے کنارہ کشی کرلی۔

اپنے خاندانی پسِ منظر کے بارے میں بتائیں۔

میرے آباء واجداد نے تاریخ قبل از مسیح میں وسطی ایشیاء میں ہندوستان وارد ہو کر یہاں کی مقامی آبادی کو شودر، اچھوت اور دلت بنادیا اور خود برہمن، کھشتری اور ویش بن بیٹھے۔ ہندومت کی تشکیل بھی اُنھوں نے اپنے مفادات کے لئے کی اس لئے ہندوؤں اور بنی اسرائیل میں گائے کا تقدس ایک مشترک اکائی ہے

باقی رام چند اور کرشن وغیرہ شائد قدیم زمانے میں بطور نبی ہند کی سرزمین پر مامور کئے گئے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں اعلان ملتا ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی پیغمبر نہ بھیجا گیا ہو۔ میرے بڑوں کی ذات ویش تھی اور وہ تاجر تھے، پڑھے لکھے اور حساب کتاب کے ماہر تھے اس لئے دس بارہ پشتوں قبل اُنھوں نے اسلام قبول کیا تو اپنے قدیم پیشہ ''آڑھت'' کے ساتھ ساتھ حکمت اور امامت بھی شروع کر دی۔ پہلے وہ منڈی کے نرخ مقرر کرنے کے باعث ''نرخی'' کہلاتے تھے، اب امارت کے باعث میاں کہلانے لگے۔ ویش افراد زیادہ تر تجارت سے منسلک تھے اور اُن کی ذیلی ذات ان کے کام کے حوالے سے تھی، جیسے چاولوں کا کاروبار کرنے والے ''چاولے'' اور گڑ کا کاروبار کرنے والے ''گڑ والے۔'' قبولِ اسلام کے بعد ان کی عزت افزائی کے لئے انہیں خواجہ (آقا) اور شیخ (بزرگ) کا نام دیا گیا۔ ویش میں سے نچلے طبقے نے خواجہ اور متوسط طبقے نے شیخ کو بطور ذات اختیار کر لیا جبکہ اوپر والے طبقے نے اپنی سابقہ پہچان برقرار رکھی مثلاً سہگل، وہرے، میمن اور پراچے وغیرہ۔ ہمارے اجداد اپنی رنگت کی وجہ سے سفید پن کہلاتے تھے جو ہندوستان کی گرمی سے گندمی ہو گئے مگر ہماری رنگت میں سرخی اور سفیدی آج بھی جھلکتی ہے۔

اپنے علاقائی پسِ منظر کے بارے میں کچھ بتائیں۔

میری پیدائش ضلع سرگودھا کے ایک سرحدی قصبے بھابڑا میں ۲۱ جنوری ۱۹۷۱ء کو ہوئی جبکہ کاغذات میں ۲۱ جنوری ۱۹۷۲ء لکھی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچپن میں کمزور صحت اور بیماری کے باعث آٹھ سال کی عمر میں سکول داخل ہو سکا تو اساتذہ نے سوچا کہ زیادہ عمر کہیں آگے تعلیم یا ملازمت میں مسئلہ نہ پیدا کر دے تو ایک تو عمر ایک سال کم لکھی گئی دوسرے مجھے نرسری کے بجائے پہلی کلاس میں بٹھایا گیا کیونکہ نرسری کی سرگرمیاں والد صاحب مجھے گھر پر کرواتے تھے لہٰذا میں اس کے ٹیسٹ میں پاس ہو گیا۔ دادا جی کا تعلق بھابڑا کے قریبی قصبے میانہ ہزارہ سے تھا، جہاں کاروباری حالات خراب ہونے کے باعث اُنھوں نے نسبتاً بڑے قصبے بھابڑا کی طرف نقل مکانی کی اور کاروباری حالات بہتر ہونے پر بھائیوں کو بلا لیا اور اُنہیں بھی کاروبار میں سیٹ کر دیا۔ ہر نسل میں میرے خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد امامت و خطابت سے منسلک رہا ہے اس لئے آج بھی کئی مساجد اور مدرسے میرے رشتہ داروں کے کنٹرول میں ہیں۔

شاعری میں کیا کچھ لکھا؟

جوانی میں ہر شاعر کی طرح میں نے بھی رومانی شاعری کی لیکن چونکہ ادب میں میرا رجحان زیادہ تر طنز و مزاح کی طرف ہے اس لئے پیروڈی اور ہزلیں زیادہ لکھیں اور سنجیدہ شاعری کم۔ مجھے طنز و مزاح لکھنے میں زیادہ مزا آتا ہے اور قارئین بھی مجھے بطور طنز و مزاح نگار ہی زیادہ پسند کرتی ہیں ورنہ میں نے ادب کی ہر صنف میں وافر مقدار میں لکھا ہے۔

نثر میں کیا کچھ لکھا؟

بچوں کا ادب، کہانی، افسانہ، سنجیدہ علمی و تحقیقی مضامین، کالم اور طنز و مزاح، سب کچھ لکھا۔ میری تحریروں کی تعداد سینکڑوں میں ہے اور پاکستان اور پاکستان سے باہر ہر معیاری رسالے میں میری تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔

آپ کی شائع شدہ اور زیرِ طبع کتب کی تفصیل؟

۲۰۰۱ء میں میری طنز و مزاح کی پہلی کتاب ''دست و گریبان'' کے نام سے شائع ہوئی جو کافی پسند کی گئی۔ اب نایاب ہے۔ وہ العصر پبلشر سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں مزاحیہ رسالے چاند میں شائع ہونے والی میری طویل تحریروں کا انتخاب تھا۔ ۲۰۰۲ء میں طنز و مزاح پر میری دوسری کتاب ''قلم آرائیاں'' کے نام سے حق پبلشرز لاہور نے شائع کی۔ اس میں نسبتاً مشکل مزاح و طنز پر مبنی میری تحریریں شامل ہیں۔ اب طنز و مزاح پر مشتمل میری دو کتابیں زیرِ طبع ہیں جن کے نام ''تاکا جھانکی'' اور ''لن ترانیاں'' تجویز کئے

گئے ہیں۔ اس کے علاوہ سنجیدہ علی و ادبی مضامین اور کالمز کا مجموعہ ''مجاہدے'' کے نام سے زیرِ طبع ہے جبکہ بچوں کے ادب پر مشتمل میری ایک کتاب ''حرمتِ وطن'' کے نام سے چھپی اور تین کتابیں زیرِ طبع ہیں (۱) پٹو زندہ رہے گا (اخلاقی اور معاشرتی کہانیاں) (۲) خوفناک چال (فکشن اور جہادِ کشمیر پر کہانیاں) اور (۳) شامت در شامت (طنز و مزاح)۔ اس کے علاوہ کہانیوں اور افسانوں پر مشتمل تحریریں ''آزمائش'' کے عنوان سے زیرِ طبع ہے۔ طلبہ کے لئے میری کتاب ''حرمتِ وطن'' کو یہ اعزاز ملا کہ حکومتِ پنجاب نے اسے منتخب کر کے پنجاب کے تمام ہائر اور سینڈری سکولز کی لائبریریوں کو چھپوا کر دی۔

بچوں کے ادب میں آپ کا انداز زیادہ تر ناصحانہ ہے حالانکہ آپ ایک کامیاب طنز و مزاح نگار ہیں؟

بچوں کے لئے انداز ناصحانہ ہی ہونا چاہیے کیونکہ بچوں کو آپ تبدیل کر سکتے ہیں جبکہ بوڑھے طوطے نہیں پڑھتے اور اکثر ناقابلِ اصلاح ہو جاتے ہیں۔ ویسے میں نے بچوں کے لئے طنز و مزاح بھی لکھا ہے۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بطور ادیب آپ نے بچوں کے ادب کا حق ادا کر دیا ہے؟

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا کیونکہ ایک تو بچوں کے لئے لکھنا بچوں کا کھیل نہیں اکثر اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیتے ہیں۔ میں بنیادی طور پر بڑوں کا ادیب ہوں اور پہلی تحریر بھی بڑوں کے لئے تھی، وہ تو افتخار کھوکھر صاحب، انچارج شعبہ بچوں کا ادب دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ایماء پر بچوں کے لئے اصلاحی اور جہادی کہانیاں لکھ کر حق ادا کرنے کی کوشش کی۔

آپ کی پہلی تحریر کب اور کہاں چھپی؟

گورنمنٹ کالج سرگودھا میں میرے اُردو کے اُستاد سیّد سجاد حسین شیرازی نے میرا رجحان دیکھتے ہوئے مجھے کالج میگزین ''نویدِ صبح'' کے لئے مضمون لکھنے کے لئے کہا۔ میں نے ''مرضِ عشق'' کے نام سے مضمون لکھ کر اُن کو دے دیا جو اُنہوں نے کم و کاست چھاپ دیا۔ کالج میگزین کے مدیر وہی تھے اور میرا اُردو کا پرچہ دیکھ کر اُنہوں نے مجھ میں ادب اور طنز و مزاح کے جراثیم دریافت کئے تھے۔

ادبی زندگی کی دیگر سرگرمیاں کیا رہیں؟

گورنمنٹ کالج سرگودھا میں بزمِ ادب کا صدر رہا، وہیں یار دوستوں نے سٹوڈنٹ میگزین ''جہانِ نو'' نکالنے کا پروگرام بنایا تو اس میں شامل رہا۔ ماہنامہ ''سفید چھڑی'' سرگودھا میں معاون مدیر، ماہنامہ ''ارقم'' میں انتظامی مدیر، ماہنامہ ''پیغام ڈائجسٹ'' لاہور میں نائب مدیر رہا۔ ''دستک'' بھابڑا کا مدیر رہا۔ ماہنامہ ''ساتھی'' کراچی سے کئی کہانیوں پر ایوارڈ کا مستحق ٹھہرا۔ نوجوان ادیبوں کے مسائل اور اُن کے حل کے موضوع پر ہلکے پھلکے مقالے پر کل پاکستان مقابلے میں سیّد ضمیر جعفری کے دستِ شفقت سے اوّل انعام کا میڈل وصول کیا۔ سائنس کے کمالات، اکیسویں صدی کے موضوع پر مقابلے میں ''پیغام ڈائجسٹ'' لاہور سے اوّل انعام حاصل کیا۔

کن کن مزاح نگاروں کو پڑھا اور اس حد تک متاثر کس سے ہیں کہ اس کے اسلوب میں لکھنے کی کوشش کی؟

تقریباً تمام مزاح نگاروں کو پڑھا لیکن زیادہ متاثر پطرس بخاری، فرحت اللہ بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، شفیق الرحمان، کرنل محمد

خان، ابنِ انشاء اور مشتاق یوسفی سے ہوں، شعوری طور پر میں نے کسی کے انداز میں لکھنے کی کوشش نہیں کی لیکن مطالعہ اور اثرات کے باعث اگر اسلوب کسی سے ملتا ہو تو میں انکار نہیں کرتا لیکن اس کا فیصلہ ناقدین پر چھوڑتا ہوں۔

جدید مزاح نگاروں میں سے کون پسند ہے؟

محمد یونس بٹ سے، نوجوانوں میں گلِ نوخیز اختر کا بھی اپنا رنگ ہے اور روزنامہ ''چاند'' میں عمران قریشی اور عارف کامران اچھا لکھتے تھے۔

طنز و مزاح کیا ہے، آپ کا رجحان طنز کی طرف زیادہ ہے یا مزاح کی طرف؟

طنز زہر خند ہے، اس میں بے رحمی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ اصلاح کے بجائے ردِ عمل پیدا کرتا ہے لیکن کہیں کہیں یہ ضروری بھی ہوتا ہے، خصوصاً جہاں انسان بے بس ہوتا ہے۔ جبر زدہ معاشروں عوامی اور حکومتی رویوں پر کتھارسس کا عمدہ ذریعہ ہے جبکہ ناہمواریوں اور مضحک پہلوؤں پر ہمدردانہ انداز میں ہلکی پھلکی دل لگی اور شگفتہ بیانی مزاح ہے جو زیادہ مثبت اثرات رکھتا ہے۔ مجھے مزاح لکھنا زیادہ پسند ہے لیکن مزاح کے ساتھ ساتھ ہلکا پھلکا طنز بھی ہو تو تحریر زیادہ تاثر انگیز ہوتی ہے لیکن اس کی مقدار مزاح سے کم ہونی چاہیئے۔ میں نے خالص طنز بھی لکھا ہے لیکن بہت کم، زیدہ تر طنز و مزاح، ملا جلا ہی ہوتا ہے میری تحریروں میں ویسے۔ ویسے منٹو اور قدرت اللہ شہاب نے بہت خوبصورت طنزیے لکھے ہیں۔

''قلم آرائیاں'' میں آپ نے کئی دلچسپ کردار پیش کیے ہیں اور کچھ لوگوں کے خاکے بھی اُڑائے ہیں، یہ مشاہدہ ہے یا ذاتی تجربہ؟

دونوں چیزیں ہیں، یہ کردار فرضی نہیں بلکہ حقیقی ہیں البتہ ان کو مزید دلچسپ بنانے کے لئے ان کی کچھ نوک پلک سنوار کر پیش کیا ہے۔

کیا آپ کے ادبی حوالے میں خاندانی پسِ منظر کا کوئی دخل ہے؟

ہے بھی اور نہیں بھی۔ اس حوالے سے نہیں کہ میرے خاندان میں مجھ سے پہلے کوئی باقاعدہ شاعر ادیب نہیں ہوا لیکن پڑھا لکھا ہونے کے باعث ایک تو ننھیال اور دودھیال دونوں طرف کے بڑے اعلیٰ علمی اور ادبی ذوق رکھتے تھے اور وسیع مطالعہ کے حامل تھے اور ان میں ادبی جراثیم موجود تھے، مثلاً ایک دودھیالی بزرگ پنجابی میں شاعری کرتے تھے اور بوقتِ ضرورت ہجو بھی لکھ لیتے تھے۔ ایک بار اُنہیں موچی نے جوتا وقت پر سی کر نہیں دیا، تو اُنہوں نے اُس کی ہجو لکھ دی۔ وہ بڑے ہنس مکھ اور باغ و بہار قسم کی شخصیت کے مالک تھے۔ ایک چچا دوستوں کو بڑے مزاحیہ خطوط لکھا کرتے تھے۔ والد صاحب داستان گوئی میں کمال رکھتے تھے۔ عام سے واقعے کو بھی یوں بنا سنوار کر سناتے کہ مزا آ جاتا تھا۔ وہ بڑے شگفتہ مزاج تھے۔ ایک ماموں نے ذاتی رومانی داستان بغیر کوئی نام بدلے لکھ کر شائع کرا دی اور قتل ہوتے ہوتے بچے۔ دوسرے ماموں اور ایک چچا طنزیہ گفتگو میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور ایک خالو کو جگت بازی مین کمال حاصل تھا۔ گھر میں علمی ادبی کتابیں موجود تھیں اور کئی معیاری رسائل باقاعدگی سے گھر آیا کرتے تھے جو میں نے بچپن سے ہی پڑھنا شروع کر دیئے تھے۔ ان تمام عوامل کے اثرات ظاہر ہونا فطری بات ہے۔

گویا آپ کے طنز و مزاح کی طرف آنے کے محرکات بھی یہی تھے؟

جی ہاں، میری طبیعت میں فطری شوخی وراثتاً ہی موجود تھی اور پھر خاندانی ماحول نے اسے مزید بڑھاوا دیا اور مجھے لکھنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی مگر میرے لکھنے لکھانے کو خاندان مین زیادہ پسند نہ کیا گیا کیونکہ کاروباری حلقوں میں لکھنے لکھانے کو فضول سمجھا جاتا ہے۔ ایک بار میں نے ایک کزن کو فیصل آباد ابو کے ایک ایکسیڈنٹ کی روداد لکھ بھیجی جو ایک کتے کے اچانک موٹر سائیکل کا تعاقب کرنے اور پھر سامنے آ جانے کے باعث ہوا تھا۔ روداد پڑھ کر میری پھوپھی کا خاندان ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا۔ سکول اور کالج کے ابتدائی دور میں محاورات کو مزاحیہ انداز میں فقروں میں استعمال کر کے دوستوں کو سنایا کرتا تھا اور پرچوں میں بھی لکھ آیا کرتا تھا۔ اگر امتحان میں کوئی روداد یا واقعہ لکھنے کو کہا جاتا تو خود گھڑ کے لکھ آتا تھا۔ پھر دوستوں کی ہجو لکھنی شروع کی جو بعد ازاں خاکوں کی شکل میں سامنے آئی اور پھر دوستوں کے اعتراض پر میں نے اپنے خاکے بھی لکھے تا کہ بیلنس ہو جائے۔

کیا آپ کا کوئی استاد ہے؟

نثر میں تو کتابیں ہی میری استاد ہیں، خصوصاً پطرس بخاری مرحوم کو میں اپنا طنز و مزاح میں استاد سمجھتا ہوں جن کے مضامین پڑھ کر میں نے لکھنا شروع کیا۔ شاعری میں البتہ کچھ دوستوں سے اصلاح و مشورہ لیتا رہا ہوں۔

مذہبی لوگ طنز و مزاح کو اچھا نہیں سمجھتے۔ آپ خود طنز و مزاح نگار ہیں اور اسلام پر بھی تحقیقی مضامین لکھتے ہیں تو آپ اپنا دفاع کیسے کریں گے؟

دیکھیں، شگفتہ بیانی تو آنحضور ﷺ سے بھی ثابت ہے۔ جو چیز منع ہے وہ ہے جھوٹ بول کر کسی کو ہنسانا یا کسی کی دل آزاری کرنا۔ تو مصنف ہمیشہ حقائق سے تحریریں اخذ کرتے ہیں اور معیاری ادیب کسی کی دل آزاری بھی نہیں کرتے اور اکثر اصلاح کا مقصد ان کے پیشِ نظر ہوتا ہے اور داستان، افسانے اور کہانی میں بھی وہ عبرت یا سبق دینے کی کوشش کرتے ہیں، اس طرح تو ان کی تحریریں توشۂ آخرت بن جاتی ہیں لیکن جو لوگ اس کے برعکس کرتے ہیں ان سے یقیناً اس صلاحیت کے غلط استعمال کا حساب ہوگا۔

انگریزی ادب میں طنز و مزاح لازمی انفرادی اکائی کے طور پر اہمیت رکھتا ہے لیکن اُردو ادب میں طنز و مزاح کو محض سویٹ ڈش سمجھا جاتا ہے اور اسے ادب میں موقر مقام نہیں ملتا، کیا یہ حوصلہ شکنی کی بات نہیں؟

بالکل حوصلہ شکنی کی بات ہے۔ میرے خیال میں تو طنز و مزاح کی حیثیت سویٹ ڈش کی نہیں بلکہ نمک کی ہے جس کی مقدار بیشک کم ہوتی ہے لیکن اس کے بغیر ہانڈی لذیذ نہیں ہوتی۔ سویٹ ڈش کے بغیر تو پھر بھی کام چل جاتا ہے، نمک کے بغیر نہیں۔ جہاں تک برِ صغیر اور یورپ کے ادبی رویوں کا تعلق ہے تو یہ فرق صرف طنز و مزاح میں نہیں بلکہ ادب کی ہر صنف میں ہے اور اس کی وجہ مغرب اور مشرق کے معاشروں میں فرق ہے۔ مغرب کا معاشرہ خواندگی کے لحاظ سے بہت آگے ہے، وہ لوگ علم کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور جدید میڈیا کے دور میں بھی کتاب اور رسالے پڑھتے ہیں۔ وہاں ادیب کو صرف لکھنا ہوتا ہے، اور کوئی کام نہیں کرنا ہوتا کیونکہ وہاں ادیب کو تحریر کا اچھا خاصا معاوضہ ملتا ہے۔ ہمارے ہاں صورتِ

حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں ادیب اپنے شوق، کتھارسس یا نظریات کے ابلاغ کے لئے لکھتا ہے جس کا اوّل تو اسے کوئی معاوضہ ملتا ہی نہیں اور اگر ملتا بھی ہے تو اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر، اس لئے اسے لکھنے کے ساتھ ساتھ روزی کمانے کے لئے بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے، اس لئے یہاں کئی ہیرے غمِ روزگار کی وجہ سے مٹی مین رُل جاتے ہیں اور یکسوئی، مناسب تحقیق اور مطالعہ کے بغیر لکھا گیا ادب زیادہ تر سطحی ہوتا ہے جبکہ مغرب میں زیادہ اعلیٰ ادب تخلیق ہوتا ہے کہ وہاں رائٹر کے پاس مناسب سہولتیں اور وقت موجود ہے۔ اس کے باوجود ہندوپاک میں بہترین ادب تخلیق ہورہا ہے۔ جہاں تک طنز ومزاح کا تعلق ہے تو مزاح آسودہ معاشروں سے پھوٹتا ہے اور طنز مسائل کا شکار معاشروں سے، یہی وجہ ہے کہ بہترین مزاح انگریزی ادب میں ہے اور بہترین طنز مشرقی ادب میں لیکن پڑھنے کا اب کسی کے پاس وقت نہیں۔

آپ کی ابتدائی صورتِ حال؟

ذہانت نسلوں سے ہمارے خاندان میں وراثتاً چلی آرہی ہے۔ میں نے بھی تعلیم کے ہر درجے میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔

کہاں تک تعلیم حاصل کی؟

میری تعلیم ایم اے اُردو، ایم ایڈ ہے۔

گویا ڈبل ایم اے۔ روزگار کے لئے کس ملازمت یا کاروبار سے منسلک ہیں؟

آجکل تو میں محکمہ ٔتعلیم سے منسلک ہوں ورنہ شائد ہی کوئی کام چھوڑا ہو۔ پرائیویٹ ملازمتیں بھی کیں اور ہر قسم کے کاروبار بھی کئے لیکن کاروبار میں لکھنے پڑھنے کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے اس لئے ٹیچنگ جوائن کی کیونکہ یہ میرے مزاج کے مطابق ہے اور اس میں لکھنے کے لئے کافی وقت بھی مل جاتا ہے۔

آپ نے کوئی شاگرد بھی تیار کئے؟

جی ہاں، بیشمار نوجوانوں کی راہنمائی کی۔ کچھ کو تو ایسے لکھنا سکھایا جیسے نرسری کے بچے کو الف بے سکھائی جاتی ہے۔ ان میں سے کئی اب باقاعدہ ادیب ہیں اور ان کی کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔

حکومتی سطح پر ادب خصوصاً طنز ومزاح کے ساتھ جو سوتیلوں والا سلوک کیا جاتا ہے، آپ اسے کیسے دیکھتے ہیں؟

ایک تو ہمارا معاشرہ علم دشمن ہے، دوسرے حکومت نے کاغذوں پر اِتنے ٹیکس لگا رکھے ہیں کہ یہاں چھاپنا چھپوانا اور پڑھنا کافی مہنگا شوق ہے جو کم ہی لوگ کر پاتے ہیں۔ انڈیا میں یہ سب کام نہایت سستے داموں ہو جاتے ہیں، پھر ادیبوں کو حکومت کوئی ریگارڈ نہیں دیتی، رقمیں اور ایوارڈ کھلاڑیوں کو ملتے ہیں یا اداکاروں کو جبکہ قوم کی تربیت جو لوگ کرتے ہیں ان کو ایوارڈ بھی نہیں دیا جات۔ رقم تو دور کی بات ہے، یہ حکومتی اور معاشرتی رویہ ملت کے اعلیٰ دماغوں کے ساتھ کافی حوصلہ شکن ہے۔ اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ پبلشر بھی شعراء وادباء کے ساتھ ہر ممکن ظلم کرتے ہیں کہ تحریر بھی ان کی اور پیسہ بھی ان کا جبکہ منافع خود کھا جاتے ہیں۔ مشہور ادباء کے علاوہ کسی کو رائلٹی تو ملتی ہی نہیں۔

آپ کے ادبی اجلاس مشہور ہوئے، یہ آئیڈیا کہاں سے لیا؟

مشاعروں کی مزاحیہ پیروڈی کئی لوگوں نے کی تھی لیکن مکمل ادبی اجلاس کی پیروڈی میرے علم میں نہیں کہ کسی نے کی ہو۔ میں ادبی اجلاس میں شریک ہوا کرتا تھا اور ان کے مضحک پہلو میری نظر میں تھے لہذا انہیں پر پہلا ادبی اجلاس لکھا۔ جب وہ پسند کیا گیا تو پھر چل سو چل۔

''دست وگریباں'' اور ''قلم آرائیاں'' دونوں آپ کی کتب ہیں لیکن ان کے مزاج اور سطح کا واضح فرق ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

ان کتابوں کے لئے اپنی تحریروں کا انتخاب کرتے وقت میں نے شعوری کوشش کی تھی اور ''دست وگریبان'' میں وہ تحریریں شامل کی تھیں جن کو عام پڑھے لکھے لوگ سمجھ کر لطف اُٹھا سکیں اور قلم آرائیاں میں اپنی وہ تحریریں شامل کی تھیں جن کو دانشور، شعراء، ادباء اور زیادہ پڑھے لکھے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں یعنی ''دست و گریباں'' عوام کے لئے ہے اور ''قلم آرائیاں'' خواص کے لئے۔ یہ فرق اسی لئے محسوس ہوا آپ کو پھر میں یہ بھی چاہتا تھا کہ میری دوسری کتاب پہلی سے ہر صوت مختلف ہو اور ان شاء اللہ آئندہ میری جو کتب آئیں گی وہ ان دونوں سے مختلف سطح اور مزاج

کی ہوں گی۔

آپ کی پہلی کتاب ۲۰۰۱ء میں منظرِ عام پر آئی اور دوسری ۲۰۰۸ء میں یعنی سات سالوں بعد اس حساب سے ۲۰۱۵ء آپ کی تیسری کتاب آنی چاہئے تھی مگر اب ۲۰۱۷ء ختم ہونے کو ہے اور کتاب کا دور دور تک امکان نہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

ارادہ تو میرا بھی تھا جس کے پورا نہ ہونے کی ایک سے زائد وجوہات ہیں۔ایک تو والدین کی بیماری کے باعث مجھے وہ یکسوئی اور آسودگی میسر نہ ہو سکی جو کسی کتاب کی اشاعت کے لئے ضروری ہوتی ہے، دوسرے پبلشروں کا رویہ جو محض چند کتابیں رائلٹی کے طور پر دے کر کتاب چھاپ کر منافع کمانا چاہتے ہیں اور تیسرے ملٹی میڈیا، انٹرنیٹ کیبل اور ڈش کی وجہ سے کتب اور رسائل کا چلن کم ہونا۔ پہلے کتاب ہزاروں کی تعداد میں چھپتی تھی، اب دو چار سو کی تعداد میں شائع ہوتی ہے، وہ بھی بکتی نہیں بلکہ اخبارات و رسائل شعراء ادباء اور دوست حضرات کو چلی جاتی ہیں۔ کتنے ہی نامور رسائل بند ہو گئے ہیں یا ان کی سرکولیشن محدود ہو گئی ہے اور کئی آخری سانس لے رہے ہیں۔ اکتب اور رسائل بھی انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے کے باعث کتاب اپنی اصلی شکل میں قدر کھو بیٹھی ہے کیونکہ کتاب ویسے مہنگی ہے لیکن انٹرنیٹ پر تقریباً مفت ہے اس لئے سمجھدار شعراء بھی اب نیٹ پر شائع ہو جاتے ہیں۔

''ارمغانِ ابتسام'' کو ہی لے لیجئے، مزاحیہ رسالہ ماہنامہ ''چاند'' نصف صدی سے زائد شائع ہونے کے بعد بند ہو گیا تو نیٹ پر ای میگزین اس کی کمی پوری کر رہا ہے۔

کیا آپ بھی نیٹ پر ہیں؟

جی ہاں، موجودہ دور میں نیٹ پر آئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ میری کتاب ''حرمتِ وطن'' اُردو پوائنٹ پر موجود ہے۔ ''قلم آرائیاں'' بھی نیٹ پر موجود ہے۔ اگر گوگل سے سرچ کریں تو مل جاتی ہے جو کہ ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہے اور بھی کئی تحریریں کئی ویب سائٹس پر موجود ہیں جیسے SHANAKHT,QALAMURDU اور APNA JPJ, KARACHI UPDATE ''ارمغانِ ابتسام'' وغیرہ پر۔ میرے فیس بک اکاؤنٹ مجاہد شیخ K M Mujahid Sheikh کے نام سے ہیں۔ میرے گروپ کا نام INTELLECTUALS & GENUEUS ہے جبکہ KHADIM HUSSAIN MUJAHID WRITER PAGE کے نام سے ہے۔

شادی اور بیوی بچوں کے بارے میں بتائیں اور یہ بھی کہ کامیاب رہی یا ناکام؟

۱۹۹۹ء میں شادی ہوئی جسے اب تک نبھا رہا ہوں حالانکہ بچہ نہ ہونے پر علاج اور ٹیسٹوں کے بعد ڈاکٹروں نے دوسری شادی کا

مشورہ بھی دیا اس لئے اب یہ فیصلہ آپ خود کر لیں کہ کامیاب رہی یا ناکام؟

آپ کا لکھنے کا طریقۂ کار کیا ہے؟

جب کوئی آئیڈیا بن جاتا ہے تو اس کے پوائنٹس لکھ لیتا ہوں اور کچھ عرصہ اس کو ذہن میں رکھ کر مواد تیار کرتا ہوں پھر جب وقت اور ماحول ملتا ہے تو لکھتا ہوں۔ ابتداء میں تحریر دو یا تین بار لکھتا تھا، اب ایک بار ہی لکھتا ہوں اور ساتھ ساتھ تصحیح بھی کرتا جاتا ہوں۔ لکھنے کے بعد ایک بار پھر پڑھتا ہوں اور ترمیم او اضافے کے بعد اشاعت کے لئے بھیج دیتا ہوں۔ یوں سمجھ لیں کہ پہلے بطور ادیب لکھتا ہوں اور پھر بطور مدیر تدوین کرتا ہوں جس سے تحریر میں کافی بہتری آ جاتی ہے۔ یوسفی صاحب اس سلسلے مین کچی پنسل کا استعمال کرتے ہیں جبکہ میں ریمور اور وائٹنر استعمال کرتا ہوں۔ وزیر آغا اور مشتاق احمد یوسفی صاحب تو تحریر لکھ کر بھول جانے کے طریقۂ کار پر عمل کرتے ہیں اور لکھ کر کہیں ڈال دیتے ہیں اور پھر مہینوں یا برسوں بعد نکال کر نئے سرے سے لکھتے ہیں۔ یقیناً اس سے تحریر نہایت شاندار ہو جاتی ہے اور کئی نئے آئیڈیاز شامل ہو جاتے ہیں لیکن مجھ میں اتنا صبر نہیں۔ میری تحریر تو صرف وقت کی کمی کے باعث ہی لیٹ ہو سکتی ہیں۔ اس کی دوسری وجہ ایک دلچسپ تجربہ بھی ہے۔

وہ کیا؟

ایک بار میں نے لمبی چوڑی تحریر لکھ کر وزیر آغا صاحب کے فرمان کے مطابق گھڑے میں ڈال دی جس میں دادی جان نے چاول رکھے ہوئے تھے۔ جب ان چاولوں کی ضرورت پڑی تو چاولوں کے اوپر کاغذات پڑے دیکھ کر پریشان ہو گئیں کہ شائد کسی دشمن نے تعویز کرا دئے ہیں لہٰذا اُنہوں نے اُنہیں نالے میں بہا دیا۔ جب کچھ عرصے کے بعد میں نے تحریر نکالنا چاہی تو وہاں نام و نشان بھی موجود نہ تھا۔ جب تحقیق و تفتیش کے بعد حقیقتِ حال کا علم ہوا تو آئندہ تحریر کے انڈے بچے نکلوانے سے توبہ کر لی چونکہ قلبی صلاحیت قابلِ مواخذہ ہے اس لئے مثبت لکھنے کو نیکی سمجھتا ہوں اور نیکی میں دیر درست نہیں ہوتی۔

لکھنے میں کوئی مشکل پیش آئی؟

نہیں کسی بھی قسم کی تحریر لکھنے میں الحمدللہ کبھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی ہاں ایسا کئی بار ہوا کہ لکھنے کوئی اور آئیڈیا اور پلاٹ بیٹھا مگر لکھ کچھ اور گیا۔ اسی لئے اب میں عنوان پہلے نہیں لکھتا بلکہ تحریر مکمل کرنے کے بعد اس کے مطابق عنوان لکھتا ہوں۔ پہلے پہل عنوان دے کر لکھنے بیٹھتا تھا تو تحریر کسی اور طرف نکل جاتی تھی اور عنوان بدلنا پڑتا تھا۔ اب میں قلم کو نہیں روکتا بلکہ وہ جس طرف جانا چاہے، جانے دیتا ہوں۔ اس سے یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک موضوع پر ایک سے زائد تحریریں لکھی جاتی ہیں۔ ایک مشکل البتہ مجھے اکثر پیش آتی ہے اور وہ ہے تحریر کا آغاز کرنا۔ اس میں مجھے اتنا وقت لگ جاتا ہے، جتنا تحریر مکمل کرنے میں۔ بس ایک بار آغاز ہو جائے پھر قلم دوڑتا ہے۔ دوسری مشکل اکثر موزوں عنوان دینے میں پیش آتی ہے، کبھی کبھی تحریر بلا عنوان بھی رہ جاتی ہے۔

تحریر کے زیادہ آئیڈیاز کہاں اور کب ملتے ہیں؟

نیند یعنی خواب، سفر اور مطالعہ کے دوران بہت زیادہ آئیڈیاز ملتے ہیں۔

ماہنامہ حکایت میں آپ کا ایک مزاحیہ سلسلہ ''ملفوظاتِ گفتار غازی'' برسوں سے چل رہا ہے، اس کا کیا پسِ منظر ہے؟

یہ کردار میں نے اپنی قوم سے لیا ہے جو کسی حد تک میری ذاتی نمائندگی بھی کرتا ہے کیونکہ اس میں پیش کردہ خیالات تو میرے اپنے ہی ہوتے ہیں۔ یہ کردار، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، صرف باتوں کا شیر ہے عملاً زیرو ہے، ہمارے عوام کی طرح اس کے قول و فعل میں تضاد ہے اور یہی پہلو اس میں دلچسپی کا عنصر پیدا کرتا ہے کیونکہ گفتگو کے دوران اس کا تضاد نمایاں ہو جانے سے دلچسپ صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے اس میں طنز بھی ہے، ان لوگوں پر جو بعض شخصیات کو مقدس بنا کر ان کے غلط اور صحیح ہر بات پر ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں اور سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے جبکہ ان شخصیات کا تضاد ان کی باتوں سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے کا یہی مقصد ہے کہ لوگ غلط کو غلط کہنے کی ہمت اپنے اندر پیدا کر سکیں، چاہے وہ کسی نے بھی کہا ہو۔

اور وہ نہ لکھنے کے باوجود سمجھ میں آ رہا ہوتا ہے۔ دوسرے چوائس اور خالی جگہ والے سوالات میں چونکہ کئی آپشن ہوتے ہیں جن میں آپ وہ آپشن بھی دے سکتے ہیں جو عام حالات میں دینا ممکن نہیں ہوتا اور یوں بہت سی تلخ، سچی اور ناگفتنی باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔

بطور مصنف آپ کو کبھی کوئی دلچسپ صورتِ حال پیش آئی؟

اکثر۔۔۔ایک تو یہ کہ مزاح نگار ہونے کی بناء پر اکثر لوگ یہ توقع رکھتے ہیں کہ میں ہر وقت ہنسی مذاق کرتا رہوں گا جبکہ عملاً ایسا ممکن نہیں ہوتا چاہے بے تکلف دوستوں کی محفل ہو کیونکہ کیونکہ لکھنے کے لئے تو الگ موڈ اور ماحول کی ضرورت ہوتی ہے اور دنیاوی مسائل مزاح نگار کے ساتھ بھی ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اسے سنجیدہ بھی ہونا پڑتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ بڑے بڑے مسائل کو ہنسی میں اُڑا دیتا ہے اور ہنسی مذاق اور شگفتہ بیانی بھی کرتا ہے لیکن ہمیشہ نہیں، اس لئے لوگ مل کر مایوس ہوتے ہیں کیونکہ ان کے ذہن میں ہمارا خاکہ کسی مسخرے یا بھانڈ کا ہوتا ہے جو کہ ظاہر ہے کہ درست نہیں ہوگا۔ دوسرے تحریر کے حوالے سے بھی بعض اوقات دلچسپ صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے مثلاً میں نے ایک پروگرام میں اپنی تحریر ''وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا'' سنائی جو کہ تھی تو جگ بیتی لیکن کسی ناخوشگوار صورتِ حال سے بچنے کے لئے آپ بیتی کی شکل دے کر کرداروں کے نام حذف کر دیے تھے۔ پروگرام کے اختتام پر دو سامعین نے مجھے گھیر لیا کہ میں نے اُن کا پردہ کیوں فاش کیا ہے حالانکہ میں اُن کو جانتا بھی نہ تھا اور وہ واقعہ بھی میرے ایک دوست کے ساتھ پیش آیا تھا جو اُس محفل میں موجود تھا اور محظوظ بھی ہوا تھا، بس اُن کے ساتھ واقعہ کی مشابہت ہوگئی تھی جس کی وجہ سے وہ پریشان ہو کر شکوہ کناں ہو گئے تھے، بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر اُن سے جان چھڑائی۔ دوسرا واقعہ یوں پیش آیا کہ اخبار جہاں میں میرے پرچہ جات شائع ہوئے تو ایک بوڑھا پوچھتا پاچھتا میرے پاس پہنچ گیا اور کہا کہ میں اس علاقے سے تعلق رکھتا ہوں اور شہر میں کچھ طلباء کے ساتھ بطور خدمت گار رہتا ہوں، انہوں نے میرے ذمہ لگایا کہ میں گاؤں جاؤں تو آپ سے یہ پرچہ حل کرا کر لاؤں کیونکہ ان سے حل نہیں ہو رہے۔ اب میری

آپ کی بعض تحریریں پڑھ کر لگتا ہے کہ جیسے وہ ہنسنے ہنسانے کے لئے نہیں لکھی گئی ہوں، ایسا کیوں ہے؟

یہ سچ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں محض ہنسنے ہنسانے کے لئے نہیں بلکہ کچھ فکر پیدا کرنے کے لئے لکھتا ہوں کیونکہ محض ہنسنے ہنسانے کے لئے تو اور لوگ بھی لکھ رہے ہیں۔

آپ کی دونوں کتابوں میں کئی پرچہ جات شامل ہیں جن میں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز بھی خاصی مقدار میں پایا جاتا ہے، آپ نے اپنی بات پہنچانے کے لئے یہ طریقہ کیوں اختیار کیا؟

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ گریجویشن کے بعد سے میں کسی نہ کسی صورت درس و تدریس سے منسلک ہوں اور مجھے اس میں آسانی محسوس ہوئی۔ دوسرے اس میں بچنے کی گنجائش ہے کہ سخت سے سخت بات کر کے بھی بندہ پہلو بچا سکتا ہے کیونکہ ایک تو شکل سوال کی ہے، جس کا جواب سوال میں بھی ہے اور قاری کے ذہن میں بھی

حالت یہ تھی کہ روؤں دل کو کہ پیٹوں جگر کو میں کیونکہ بڈھے کو تو کچھ سمجھانا دیواروں سے سر پھوڑنے والی بات تھی اور لڑکے موجود نہ تھے، شائد اُنہوں نے پرچے پڑھ کر مجھ سے عملی مذاق کیا تھا۔ بڑی مشکل سے اُس کو یہ کہہ کر ٹالا کہ اِن لڑکوں کو میرے پاس بھیجنا، میں جواب سمجھا دوں گا۔ تیسرا مسئلہ ’’قلم آرائیاں‘‘ کی اشاعت کے بعد پیدا ہوا جب یار لوگوں نے دانستہ مذاقاً یا نادانستہ اسے قوم ارائیاں کی طرف منسوب کر دیا حالانکہ ارائیاں کا الف مد کے بغیر اور آرائیاں کا الف مد کے ساتھ ہے لیکن اُردو میں کم علم ہونے کی وجہ سے اکثر بڑے بڑے لوگ ایسی غلطی کر جاتے ہیں۔

آپ کی پہلی کتاب ’’دست وگریباں‘‘ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا؟

حادثہ نہیں، حادثات، اسے میرے دوست ارشاد العصر جعفری نے کمپوز کرنے کی کوشش کی تو اس کا کمپیوٹر اُڑ گیا، پھر اس نے ایک دوست سے کمپوزنگ کروائی۔ ٹائٹل بنوانے کے دوران اس کے ابو کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ جیسے تیسے مواد مکمل کر کے پبلشر کو دیا تو اُسی دن اُس کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے پبلشر کو دیا تو اُسے کاروبار میں سخت خسارہ ہوا اور جس دفتر کے پاس کتابیں تیار ہو رہی تھیں، وہ کسی کا نادھندہ تھا، چھاپہ پڑا اور اُس کا گودام سیل کر کے اور کتابیں بیچ کر اُنہوں نے قرض وصول کیا۔ اور جب شائع ہوئی تو اس پر رائے دینے والے مشاہیر یک بعد دیگرے وفات پا گئے اور مجھے نقصان کی وجہ سے کاروبار بدلنا پڑا۔

کھانے میں کیا پسند ہے؟

مغز، سری پائے، کلیجی، کھٹا کھٹ، مچھلی، قیمہ کریلے، چوہنگاں قیمہ، تکہ کباب اور بریانی۔

لباس کون سا پسند ہے اور کس رنگ کا؟

شلوار قمیض، ہلکے رنگ پسند ہیں، خصوصاً آف وائٹ بوسکی، مسٹرڈ اور آسمانی۔

اپنی اچھی بُری عادات کے بارے میں بتائیں؟

عادات بتا دیتا ہوں۔ اچھی بُری کا فیصلہ آپ خود کر لیں۔ خوشامد میں نہیں کر سکتا، جھوٹ نہیں بولتا، سچی بات منہ پر کر دیتا ہوں جس سے لوگ عموماً بڑے شاکی رہتے ہیں۔ جب کسی کام کا ارادہ کر لوں تو پھر پورا کر کے ہی چھوڑتا ہوں۔ صفائی اور ترتیب کا بے حد خیال رکھتا ہوں، ڈسپلن کا عادی ہوں اور اس کے خلاف کوئی چیز برداشت نہیں کر سکتا۔

فنونِ لطیفہ سے دلچسپی ہے؟

بہت زیادہ، مصوری، خطاطی، موسیقی، شعر و ادب میری کمزوری ہیں۔

اکثر شعراء و ادباء حُسن پرست ہوتے ہیں، کیا آپ بھی ہیں؟

یقیناً، متونِ لطیفہ، حُسن کی ستائش اور احساس سے ہی جنم لیتا ہے لیکن اسے نسوانی حُسن تک محدود کرنا دُرست نہیں، گو وہ بھی اپنی جگہ اہم ہے اور حسِ جمال کی تسکین کا باعث ہے لیکن فطرت میں حُسن جا بجا بکھرا ہوا ہے۔ قدرتی نظارے کسی بھی حساس انسان کو وہ لطف دیتے ہیں جو کروڑوں خرچ کر کے بھی حاصل نہیں ہو سکتا اور نسوانی حُسن تو زوال کا شکار ہو جاتا ہے، فطرت کے حُسن کو زوال نہیں۔

آپ دینی تحریریں بھی لکھتے ہیں اور آپ کی دیگر تحریروں میں بھی اصلاحی پہلو نمایاں ہوتا ہے لیکن شروعات میں آپ کی تحریر کا مزاج اور تھا، اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کی کئی وجوہات ہیں، ایک تو age factor ہے۔ جوانی ،میں تحریروں کا مزاج اور تھا، اب اور۔ دوسرے اس کی وجہ مذہبی پس منظر ہے اور تیسری وجہ اہلِ قلم کی محبت ہے۔ شخصی صورت میں بھی اور کتابی صورت میں بھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کوئی زاہدِ خشک یا روائتی ملا بن گیا ہوں، بہت وسیع المشرب ہوں۔

موجودہ دور میں فرقہ وارانہ اختلافات نے ایک بہت بڑے فتنے کی شکل اختیار کر لی ہے، آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے؟

اختلاف تو شروع سے موجود تھا اور اس کی وجہ مزاجوں کا اختلاف ہے، جب اس اختلاف نے کاروباری شکل اختیار کی اور پیٹ کا سلسلہ اس سے جُڑ گیا تو یہ فتنہ بن گیا اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ انگریز دور میں شروع ہوا، جب مولیوں کو جاگیریں اور اوقاف چھین کر اسے دست نگر کر دیا گیا تو اسے اپنا خرچہ چلانے کے لئے اختلاف نمایاں کر کے گروہ بندی کی ضرورت پڑی، پھر اس نے دین میں ترمیم بھی کی۔ من مانی تعبیریں بھی کیں اور نئی چیزیں بھی ایجاد کیں، یوں دین چیستاں بن گیا۔

ادب میں فحاشی کی روایت کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جنس اور اس سے پیدا ہونے والے معاشرتی مسائل ایک حقیقت ہیں اور کہانی کار حقیقت ہی سے کہانیاں بُنتا ہے، اس لئے ادب سے جنس کو منہا نہیں کیا جا سکتا۔ منٹو اور عصمت چغتائی ہی نہیں، احمد ندیم قاسمی، قدرت اللہ شہاب اور غلام عباس جیسے سکہ بند قلمکاروں نے بھی اپنے افسانوں میں جنس کو موضوع بنایا لیکن جنس سے پیدا ہونے والے معاشرتی مسائل کو افسانے کی شکل میں بیان کرنا اور بات ہے اور لذت کے لئے جنس کو بیان کرنا اور بات ہے اور یہی موخر الذکر چیز فحاشی اور برہنگی کے ذیل میں آتی ہے زور یہ ہمیں واہی دہانوی (جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نام شوکت تھانوی نے اختیار کیا تھا) اور مینا ناز کے ہاں ملتی ہے یا منٹو کے کچھ افسانے اس ذیل میں آ جاتے ہیں جیسے ''بُو'' وغیرہ۔ عموماً فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے خدا کو کسی مذہبی یا اخلاقی قدر کے پابند نہیں سمجھتے اس لئے شاہکار سامنے آتے ہیں۔ سنگ تراشوں اور مصوروں کو ہی لے لیجئے، جو عریاں تصویریں اور مجسمے تراشنے کو ہی اپنے فن کی معراج سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ذہنی عیاشی اور بُرائی کی ترویج کے علاوہ کچھ اور نہیں۔

کوئی پیغام؟

میرا پیغام شعراء ادباء کے لئے ہے کہ معاشرے میں مثبت تبدیلی کے لئے قلم کاری جاری رکھیں، یہ مت سوچیں کہ فائدہ نہیں ہو رہا، اجر ضرور ملے گا۔

عام طور پر جب کسی چیز کا فائدہ نہیں ہوتا تو انسان بددل ہو جاتا ہے، پھر وہ کیسے کام جاری رکھے؟

دیکھیں، سب چیزوں کا فائدہ دنیا میں نہیں ہوتا، آخرت اِسی لئے بنائی گئی ہے جہاں شفاف نتائج ملیں گے۔ لکھنا لکھانا ہی ایک عظیم صلاحیت ہے، اسے اگر مثبت استعمال کریں گے تو یقیناً آخرت میں اجرِ عظیم کے مستحق ٹھہریں گے اور اگر منفی استعمال کریں گے تو جیسے دیگر صلاحیتوں کے منفی استعمال کر سزا ملے گی، اسی طرح اس صلاحیت کے غلط استعمال پر بھی یقیناً مواخذہ ہوگا۔

آپ کا بہت بہت شکریہ؟

آپ کا بھی بہت بہت شکریہ۔

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ

اُردو طنز و مزاح پر مبنی دو ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

مارچ ۲۰۱۸ء تا اپریل ۲۰۱۸ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی